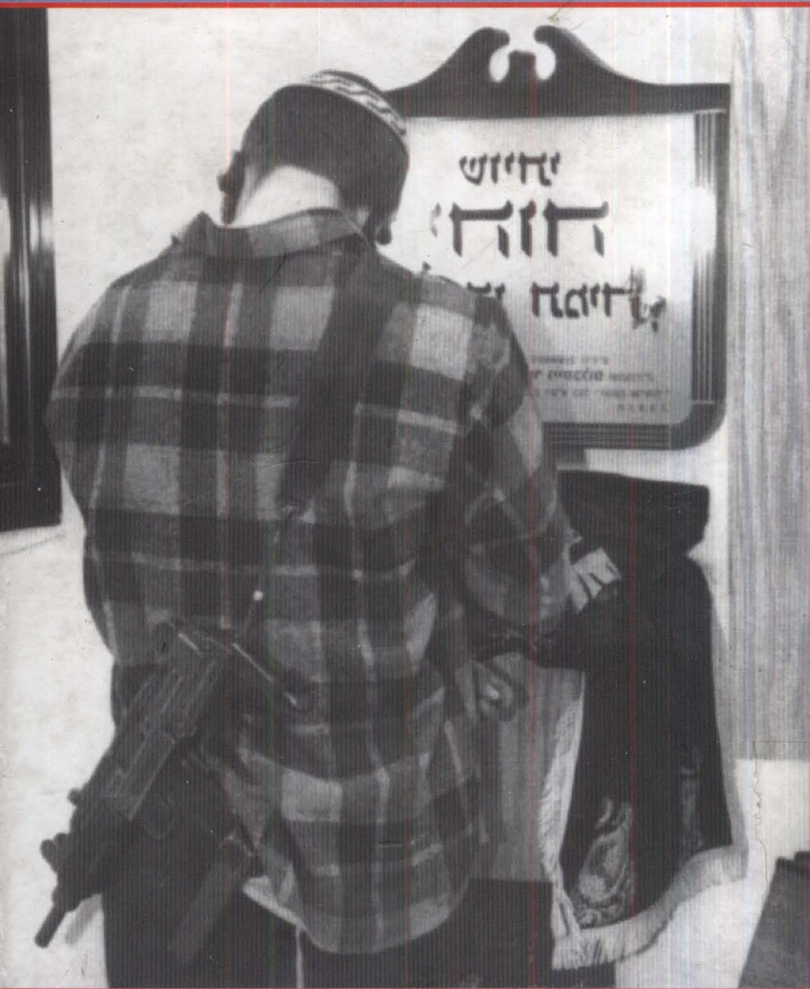
اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی



سرائیل شحاک
نارٹن میزونسکی

اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی

مصنفین: اسرائیل شحاک/ نارٹن میزونسکی

مترجم: محمد احسن بٹ

جمہوری پبلیکیشنز

جمہوری شعوری فکری تحریک



اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

ISBN:969-8455-11-6

نام کتاب ⊙ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی

مصنف ⊙ اسرائیل شحاک / نارٹن میزونسکی

مترجم ⊙ محمد احسن بٹ

اشاعت ⊙ اگست 2004ء

ناشر ⊙ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

پرنٹرز ⊙ حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

August 2004, Jumhoori Publications Pakistan

قیمت -/250 روپے

جمہوری پبلیکیشنز

9 الشجر بلڈنگ نیلا گنبد لاہور۔ پی او بکس نمبر 6283 لاہور کینٹ

Ph # 042-7212437 Fax # 042-6670001

E-mail:Jumhoori@hotmail.com

فہرست

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

اسرائیل کے تضادات

90 کی دہائی کے آغاز پر مغرب نے عالمی سیاسی حوالے سے جس بحث کا آغاز کیا وہ اسلامی بنیاد پرستی تھی۔ اور اسلامی بنیاد پرستی کو "مہذب دنیا" کا سب سے بڑا خطرہ قرار دیا گیا۔ مغربی پالیسی سازوں اور ذرائع ابلاغ نے یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغرب کی جمہوریتیں اس بنیاد پرستی کی زد میں ہیں بلکہ وہ اپنے عوام کو یہاں تک باور کروانے کی کوششیں کر رہے ہیں کہ اسلام نام ہی تشدد اور خون خرابے کا ہے جبکہ وہ اپنے عوام کو یہ نہیں بتاتے کہ انہوں نے (مغربی حکمرانوں) نے کس طرح اسلامی دنیا کے انتہا پسندوں کو "کمیونسٹ بھوت" کے خلاف اپنے سرمایہ دارانہ نظام کو تحفظ دینے کے لیے استعمال کیا۔ اگر تاریخ کا غیر جانبدار مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہودی مذہب کے بڑے بڑے پیشواؤں نے کس طرح دنیا میں تاریخ کے مختلف ادوار میں رجعت پسندی، نسل پرستی کا پرچار کیا ہے۔ یہودی انتہا پسندوں نے مختلف ادوار میں بنیاد پرستی کے جو مظاہرے کیے ہیں شاید ہی دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیشواؤں نے ایسی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ انتہا پسند یہودیوں نے انسانی تاریخ میں مذہبی بنیاد پرستی کی بنیاد رکھی تو غلط نہ ہوگا۔ اور آخر کار اس مذہبی بنیاد پرستی کی بنیاد پر ہی فلسطین کی عرب سرزمین پر یوکرائن، روس، پولینڈ، جرمنی اور دنیا بھر سے یہودیوں کو اکٹھا کر کے مذہبی نسل پرست ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کو برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے لبرل حکمرانوں نے اپنی سیاسی قوت کی بنا پر جنم دیا۔ اسرائیل کے اندر سماجی حالات کیا ہیں؟ اس کے بارے میں مغربی یا اسلامی ممالک میں کوئی زیادہ خبر نہیں۔ اسلامی ممالک میں جذباتی رائے ہے اور مغربی ممالک میں یہودیوں کے ساتھ Beloved Bahy کا برتاؤ برتا جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ان حقائق کو بے نقاب کرتی ہے جو اسرائیل کی ریاست کے اندر موجود ہیں۔ اور ان حقائق کو بے نقاب کرنے کا سہرا ان دو انسان دوست یہودی دانشوروں کو جاتا ہے۔ جنہوں نے غیر جانبدارانہ انداز میں اس کتاب میں یہودی بنیاد پرستی کو بے نقاب کیا ہے۔

یہ کتاب پاکستان میں اردو قارئین کے لیے معلومات میں ایک بڑا اضافہ ثابت ہوگی۔

فرخ سہیل گوئندی

15 مارچ 2004ء

یہودی بنیاد پرستی اور امن کا مستقبل

نوعِ انسان تاریخ کے موجودہ نازک ترین مرحلے میں جس سب سے سنگین خطرے سے دوچار ہے، وہ مشرقِ وسطیٰ میں پُر امن جمہوری تبدیلی کا مرحلہ ہے۔ اسرائیل اس خطے کا ایک ایسا اہم ترین ملک ہے، جس کے پاس نظریاتی بنیادوں پر تربیت یافتہ فوج، نہایت منظم انتظامی ڈھانچہ اور سب سے بڑھ کر وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی بھی اپنے عروج پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ذمہ دار اقوام اسرائیل میں روشن خیالی اور جدیدیت کی اساس پر استوار جمہوری نظام کے قیام و استحکام کی خواہش مند ہیں تاکہ دنیا کسی بڑی تباہی ــــ ایٹمی جنگ ــــ سے محفوظ رہے۔

زیرِ نظر کتاب "اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی" دو یہودی سکالروں نے لکھی ہے، جس کا اردو ترجمہ معروف پاکستانی انسان دوست سیاستدان اور امن تحریک کے بین الاقوامی ایکٹوسٹ فرخ سہیل گوئندی اپنے ادارے "جمہوری پبلیکیشنز" کے تحت شائع کر رہے ہیں۔ وہ اس سے قبل متعدد اہم کتابیں اردو میں ترجمہ کروا کر شائع کر چکے ہیں، جن میں مہاتیر محمد کی کتاب "ایشیا کا مقدمہ" اور ناؤم چومسکی کی کتاب "سرکش ریاستیں" قابلِ ذکر ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اردو قارئین کی معلومات میں یقیناً بیش قدر اضافے کرے گی۔ فاضل مصنفین نے عبرانی ماخذات کی بنیاد پر ثابت کیا ہے کہ اسرائیل میں موجود یہودی بنیاد پرستی ایک قدیم تاریخی مظہر کا تازہ ظہور ہے۔ انہوں نے اسرائیلی یہودیوں کے مختلف مذہبی

اور سیاسی دھڑوں کا بھی تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور ان کے اختلافات کی نظریاتی و تاریخی بنیادوں کو واضح کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے علم دوست قارئین ہماری اس کاوش کو سراہیں گے اور امن کے مستقبل کو لاحق خطرات دور کرنے کی عالمی کوششوں میں مقدور بھر شرکت کریں گے۔

محمد احسن بٹ

مارچ 2004ء

اردو ترجمے کے لیے خصوصی طور پر لکھا گیا تعارف

میرے ساتھی مصنف اور اچھے دوست اسرائیل شحاک 3 جولائی 2001ء کو وفات پا گئے تھے لہٰذا میں زیرِ نظر تعارف ان کی مدد اور بہتر مشوروں کے بغیر لکھ رہا ہوں۔ اسرائیل شحاک ایک باعلم انسان اور انتہائی ذہین سکالر تھے۔ وہ زیرِ نظر کتاب کے موضوع کے بارے میں عمیق علم کے حامل تھے۔ ایک انسان دوست اور انسانی حقوق کے کارکن ہونے کی حیثیت سے وہ، اپنے خیال کے مطابق، ریاستِ اسرائیل اور اسرائیلی یہودی معاشرے کے منفی پہلوؤں پر تنقید کرنے کو ایک عظیم ذمہ داری تصور کرتے تھے، کیونکہ وہ ان دونوں سے محبت کرتے تھے۔ ایڈورڈ سعید نے اسرائیل شحاک کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ ''معاصر مشرقِ وسطٰی کے سب سے زیادہ اہم فرد'' ہیں۔ ناؤم چومسکی انہیں ''غیر معمولی بصیرت اور عمیق علم کا حامل ایک ممتاز ترین سکالر'' کہتے تھے۔ میں یہ اضافہ شدہ تعارف اسرائیل شحاک کے نام کرتا ہوں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس تعارف میں ٹھوس اضافے کرتے۔

اسرائیل شحاک اور میں نے جرمن علمی جریدے ویلٹر ینڈز (Welttrends) میں فروری 2001ء میں ''اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی: حال اور مستقبل'' کے عنوان سے شائع ہونے والے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا تھا، وہ آج بھی سچ ہے یعنی یہ کہ بین الاقوامی نیوز میڈیا ریاستِ اسرائیل کے حوالے سے بنیادی حقائق کو باقاعدگی سے نظر انداز کر رہا ہے، وہ اس کے جامع تجزیے نہیں کرتا اور یوں بے حد گمراہ کن ہے۔ یہودی بنیاد پرستی کے حوالے سے رپورٹنگ اور تبصروں کے ضمن میں تو یہ بات بالخصوص اہم ہے۔ مرکزی ذرائع ابلاغ میں بنیاد پرستوں کے نظریات و تصورات ہمیشہ ان کے دشمنوں کے توسط سے دیئے جاتے ہیں۔ زیادہ قابلِ تنقید امر یہ ہے کہ یہودی بنیاد پرستی کے حوالے سے معلومات اب بھی بہت کم دی جاتی ہیں۔ ریاستِ اسرائیل کے باہر زیادہ تر لوگ یہودیت کے کسی پہلو اور/ یا نیک ربیوں پر تنقید کرنے سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان پر سامیت دشمن

ہونے کا الزام نہ لگا دیا جائے۔ تاہم ریاستِ اسرائیل کے اندر صورتِ حال مختلف ہے۔ اسرائیلی عبرانی پریس میں یہودیت پر خوب تنقید کی جاتی ہے۔ اگر اس تنقید کا ترجمہ اسرائیل کے باہر شائع ہو تو یقینی طور پر اسے سامیت دشمن تنقید تصور کیا جائے گا۔ یہودیوں کے درمیان مذہبی تفریق اسرائیل میں سب سے زیادہ زیرِ بحث آنے والا موضوع ہے۔

1985ء سے 2000ء کے درمیانی عرصے میں دو سماجی رجحانات نے اسرائیلی یہودی معاشرے میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ ان رجحانات اور ان کے تحت پیدا ہونے والی دھڑے بندی نے یہودی بنیاد پرستی پر اثر ڈالا ہے۔ پہلے رجحان کو شاید غلط طور پر بیان کرتے ہوئے عرب اسرائیلی تنازعے کے ایک حل اور دیرپا امن کی بہت سے یہودیوں کی خواہش قرار دیا گیا تھا۔ یہ خواہش جنگ کے خدشے سے خالی ایک صورتِ حال تخلیق کرنے کی غرض سے کچھ خاص رعایتیں دینے کی تھی۔ اسرائیل نے اوسلو پروسیس کے تحت، 1967ء سے اپنے زیرِ قبضہ علاقوں میں سے کچھ علاقوں سے فوجیں نکال لیں اور فلسطینیوں کو حاکمیتِ اعلیٰ تو نہیں دی تاہم زیادہ خودمختاری دے دی۔ اس انخلا کے بعد زیادہ اسرائیلی یہودیوں نے فلسطینی قومی اتھارٹی اور ایک فلسطینی ریاست کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔ اس کا ایک ردِعمل رونما ہوا، کیونکہ اکثر اسرائیلی یہودی شاونیت پسند ہیں، وہ یہودی قوت کی نمائش پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اسے صدیوں پر محیط یہودی ذلت کی تلافی تصور کرتے ہیں۔ ان شاونیت پسندوں نے اس تبدیلی کو قومی تذلیل تصور کیا۔ مذہبی جنونیوں یعنی یہودی بنیاد پرستوں نے تو اس تبدیلی کو خدا کی توہین تصور کیا۔ وہ نہ صرف عرب دشمنوں بلکہ یہودی غداروں کے خلاف زیادہ مشتعل ہو گئے، جن پر انہوں نے قومی ارادے کو کمزور کرنے کا الزام لگایا۔ ان احساسات کے حامل لوگوں نے ہی یگال امیر کو وزیر اعظم رابن کو قتل کرنے اور باروک گولڈ سٹائن کو ہیبرون میں خون کی ہولی کھیلنے پر اکسایا تھا۔ 1992ء اور 1996ء کے انتخابی نتائج کے موازنے سے پتا چلتا ہے کہ مزید رعایتوں کی مخالفت کرنے والے اسرائیلی یہودیوں کا تناسب مسلسل بڑھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر 1992ء کے انتخابات میں کنیسٹ کے 61 ارکین اوسلو پروسیس کے حامی تھے۔ 1999ء کے انتخاب میں نیتن یاہو کی جگہ بارک کے وزیر اعظم بننے کے باوجود یہ تعداد گھٹ کر 46 ہو گئی۔ بارک کو اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے دائیں بازو کی پارٹیوں کے ساتھ معاہدے کرنے پڑے۔ اس سلسلے میں اس نے دو بنیاد پرست پارٹیوں کا سہارا ڈھونڈا یعنی کنیسٹ کی 17 نشستوں والی شاس اور کنیسٹ کی 5 نشستوں والی یہادوت ہاتورہ۔ عموماً صرف یہی دونوں ہیریڈی پارٹیاں مذہبی معاملات میں دلچسپی لیتی رہی ہیں اور اگر ان معاملات پر ان کی خواہشات پوری کر دی جائیں تو یہ تقریباً ہر خارجہ اور/یا معاشی پالیسی کو قبول کرنے پر تیار ہوتی ہیں۔ قومی مذہبی پارٹی (NRP)، جس نے 1999ء کے انتخابات میں کنیسٹ کی 6 نشستیں حاصل کیں، غربی کنارے کے مذہبی آبادکاروں کو سب پر فوقیت دیتی ہے۔

دوسرا رجحان اسرائیلی یہودی معاشرے کے زیادہ جدید ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسرائیل 1985ء سے 2000ء کے درمیانی عرصے میں ایک ملک کی حیثیت سے زیادہ امیر ہوا ہے۔ اس کا بڑی حد تک سبب جدید کمپیوٹرائزڈ ٹیکنالوجیوں کو اپنانا تھا۔ امیر لوگوں نے یورپی اور امریکی طرزِ حیات اپنا لیا۔ بہت سے اسرائیلی یہودی مشرقی ایشیائی، خصوصاً انڈیا اور تھائی لینڈ کے طرزِ حیات سے متاثر ہوئے۔ اس سب کا نتیجہ نئے طرز کے لباس اور موسیقی کی تحسین کی صورت میں نکلا نیز بہت سے اسرائیلی یہودیوں کی جنسی عادات میں تبدیلیاں آ گئیں۔ اس کی ایک اور علامت یہ تھی کہ زیادہ یہودیوں نے ربی کے ذریعے شادی کرنے کو رد کر دیا، جو کہ یہودیت کی خلاف ورزی تھی۔ نئے طرزِ حیات کو اپنانے والے اسرائیلی یہودی شعوری طور پر زیادہ سیکولر اور اکثر اوقات مذہب دشمن بن گئے۔ اس کا ایک ثبوت شینیوئی پارٹی کا ظہور اور کامیابیاں ہیں۔ یہ پارٹی ہیریڈی پارٹیوں کی بالعموم اور ربیوں کی بالخصوص اصولی مخالفت کرتی ہے۔ 1999ء کے انتخابات میں شینیوئی نے کنیسٹ کی چھ نشستیں جیتیں۔

غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے اور روایتی طور پر مذہبی اسرائیلی یہودیوں نے عوامی مقبولیت رکھنے والے ربیوں کی تقریروں سے متاثر ہو کر نہ صرف واضح تبدیلیوں کو قبول نہیں کیا بلکہ انہوں نے ان کے حوالے سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ پرانا سماجی تنازعہ زیادہ سنجیدہ معاملات کے ساتھ ساتھ معمولی معاملات پر بھی شروع ہو گیا۔ مثال کے طور پر کنیسٹ کے ہم جنس پرستی کے فروغ پر فکرمند بنیاد پرست اراکین نے مرد و عورت ہم جنس پرستوں کا موازنہ جانوروں کے ساتھ کیا اور عہد کیا کہ "جب ہم اقتدار میں آئیں گے" تو وہ اُن کا لازمی نفسیاتی علاج کروائیں گے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ یہودی بنیاد پرستوں نے مطالبہ کیا۔ ہے کہ جن سڑکوں اور گلیوں میں ان کے گھر اور سینا گوگ ہیں، انہیں سبت کے دن بند کر دیا جانا چاہیے۔ میونسپل اور ریاستی حکام سیاسی وجوہات کے تحت اور ہیریڈی فسادات کے ڈر سے اکثر ایسے مطالبات تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس قبولیت پر سیکولر یہودیوں نے ردِ عمل ظاہر کیا ہے اور یہودیوں کے مابین جھگڑے وقوع پذیر ہوئے ہیں۔

جدیدیت پذیری کے رجحان اور اس کی مخالفت سے ابھرنے والی کشمکش سے بنیاد پرستوں کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ وہ متحد رہے ہیں اور یکساں اصولوں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ان کے سیکولر مخالفین مختلف نکتہ ہائے نظر کی وجہ سے منقسم ہیں۔ مزید برآں اکیسویں صدی میں بھی ایسے غیر بنیاد پرست یہودی موجود ہیں جو یا تو یہودی ماضی کے احترام میں بنیاد پرستوں کی تائید و حمایت کر رہے ہیں یا اس وجہ سے کہ ان کا خیال ہے اوسلو امن عمل بنیاد پرستوں کی مدد سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ 28 ستمبر 2000ء اور انتفاضہ ثانی کے آغاز کے بعد اس رجحان میں کافی تبدیلی آئی ہے۔

1985ء سے اسرائیلی یہودی معاشرے میں امیر اور غریب کے درمیان خلا پیدگی بڑھانے والا ایک اضافی عامل رہا ہے۔ اسرائیل کے بیشتر امیر یہودی سیکولر رہے ہیں (اور اب بھی ہیں) اس حقیقت کی وجہ سے بھی

غریب یہودیوں میں بنیاد پرستی کو فروغ ملا ہے۔ 1990ء کے سارے عشرے کے دوران یہ یقین عام تھا کہ اوسلو معاہدے کی بنیاد پر ہونے والا امن اوسط آمدنی والے طبقے کو تھوڑا فائدہ پہنچائے گا اور غریبوں کو مزید غریب کر دے گا۔ اس یقین کی بنیاد یہ حقیقت تھی کہ اسرائیل میں کم سے کم اجرت عرب ملکوں سے بہت زیادہ ہے۔ اجرتوں کے اس فرق کی وجہ سے بہت سی اسرائیلی کمپنیوں نے غریب اسرائیلی شہروں میں قائم فیکٹریاں بند کر کے انہیں اردن یا مصر میں منتقل کر دیا ہے، جہاں اجرتیں کم سے کم اسرائیلی اجرتوں سے 10 سے لے کر 70 فیصد تک کم ہیں۔ 2000ء سے پہلے اردن اور مصر کے ساتھ ہونے والے امن معاہدوں نے اسرائیلی غریبوں کو زیادہ غریب بنا دیا تھا۔ چنانچہ اوسلو امن معاہدے کی مخالفت امیروں کے مقابلے میں غریب اسرائیلی یہودی زیادہ کر رہے ہیں، جو کہ قابلِ فہم امر ہے۔ بے شمار ربیوں نے اوسلو امن معاہدے کو امیر یہودیوں میں یہودیت پر ایمان کی کمی کا نتیجہ قرار دیا ہے اور یوں غریبوں میں یہودی بنیاد پرستی کی حمایت پیدا کر لی ہے۔

اوسلو معاہدے کے بیشتر حامیوں کا اصرار ہے کہ یہ معاہدہ تمام موجودہ مسائل کو حل کر دے گا۔ اس کے حامی لوگ اہم حقائق کا یا تو انکار کر دیتے ہیں یا انہیں چھپا دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اسلامی بنیاد پرستی کا وجود اور فلسطین کے حوالے سے اس کے تصورات تھے۔ شامی سکالر صادق۔ جے۔ الاعظم نے اپنے مضمون "The View From Damascus" میں اس ایقان کا اظہار کیا تھا۔ یہ مضمون نیویارک ریویو آف بکس کے 15 جون 2000ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس نے لکھا کہ ''فلسطین ایک وقف یعنی مذہبی مقاصد کے لیے مختص علاقہ ہے، جسے اللہ نے مستقل طور پر مسلم امہ کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ اس منطق کی رو سے اللہ نے فلسطین مسلم امہ کو دے دیا ہے اور کوئی شخص، حکومت یا نسل اس پر قبضہ نہیں کر سکتی۔'' یہ ایقان ارضِ اسرائیل کے حوالے سے یہودی بنیاد پرستوں کے ایقان کے مساوی ہے۔ جو لوگ معروف عبرانی اخبارات پڑھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ فلسطینیوں میں یہ تصور عام ہے اور فلسطینی قومی اتھارٹی اور خود عرفات اس سے متاثر ہے۔ غربی کنارے اور غزہ کی اسلامی فلسطینی سیاسی پارٹی حماس کے موقف میں بھی یہ تصور مرکزیت رکھتا ہے۔ یہودی بنیاد پرستی نے اسلامی بنیاد پرستی کے پھیلاؤ کو جواز مہیا کر دیا ہے۔

یہودی بنیاد پرستوں میں تقسیم بڑی اہم ہے۔ ہر گروپ کی الگ سیاسی پارٹی اور اپنے الگ ربی ہیں۔ ان پارٹیوں اور ربیوں کے باہمی جھگڑوں نے یہودی بنیاد پرستی کو نقصان پہنچایا ہے۔ مزید برآں کچھ خاص مذہبی سیاستدانوں کی کرپشن کو ربیوں نے نہ صرف گوارا کیا ہے بلکہ اس کو بڑھاوا دیا ہے، جس کی وجہ سے یہودی بنیاد پرستی بدنام ہوئی ہے اور اس کے فروغ کی شرح سست ہو گئی ہے۔

یہودی بنیاد پرستی کے فروغ کو 1980ء کے عشرے کے وسط میں اسرائیلی یہودی معاشرے میں آزادئ اظہار میں اضافے کی وجہ سے بھی نقصان پہنچا ہے۔ عبرانی پریس اسرائیل میں زبردست اثر و نفوذ حاصل

کر چکا ہے۔ ہر جمعے کو عبرانی اخبارات کے لاکھوں شمارے فروخت ہوتے ہیں۔ 1980ء کے عشرے کے وسط سے روسی زبان کے اخبارات و جرائد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ بہت سے اسرائیلی جمعے کے دن دو اخبار باقاعدگی سے خریدتے ہیں ــــ ایک قومی اور دوسرا علاقائی۔ ان میں سے صرف تقریباً ایک فیصد اخبار مذہبی ہوتے ہیں، باقی اخبار سیکولر ہوتے ہیں۔ سیکولر اخبارات کے مدیروں کو کچھ عرصہ پہلے ادراک ہو گیا تھا کہ ربیوں کے سکینڈلوں کے حوالے سے مضامین کی اشاعت اور یہودی بنیاد پرستی پر تنقید سے اخبارات زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ کچھ بنیاد پرست، گو کہ ان کی تعداد تھوڑی ہے، سیکولر اخبارات نہ خریدتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں۔ عبرانی اخبارات و جرائد نے مذہبی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں اور/یا ربیوں کی مالی کرپشن کی خبریں شائع کر کے بنیاد پرستی کے پھیلاؤ کو روکا ہے۔ ان پارٹیوں کو حاصل ہونے والی رقوم کا بہت تھوڑا حصہ غریب یہودیوں کو ملتا ہے۔ بعض بنیاد پرست مذہبی رہنماؤں نے بنیاد پرستی اپنا لینے والے سابق سیکولر یہودیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ سیکولر عبرانی اخبارات و جرائد کا مطالعہ ترک کر دیں، جو کہ مبینہ طور پر یہودیوں کو جہنم میں لے جا سکتے ہیں۔

28 ستمبر 2000ء کے بعد اسرائیل اور مقبوضہ علاقوں میں سیاسی صورتِ حال میں خوفناک تبدیلیاں آئی ہیں۔ یہ وہ دن ہے جب اس وقت کے اسرائیلی وزیرِ دفاع ایریل شیرون نے ایک ہزار مسلح پولیس والوں کے پہرے میں مشرقی یروشلم میں مسجد الاقصیٰ کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے سے نئے فسادات بھڑک اٹھے، جن کے فوری بعد کچھ فلسطینیوں نے اسرائیلی یہودیوں پر دہشت گردانہ حملے کیے جبکہ اسرائیلی ڈیفنس فورسز نے فلسطینیوں پر حملے کیے۔ نیا تشدد، جو کہ آج تک جاری ہے اور اسرائیلی اور فلسطینی معاشروں کے تقریباً ہر پہلو پر اثر انداز ہو چکا ہے، اسرائیلی فلسطینی تنازعے کے ہر سابقہ دور سے زیادہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے ہلاک اور زخمی ہونے کا باعث بن چکا ہے۔ (اندازہ لگایا گیا ہے کہ اسرائیلی یہودیوں سے تین یا چار گنا زیادہ تعداد میں فلسطینی ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ زخمی ہونے والا کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے) اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی پر تازہ پیش رفتوں نے اثر ڈالا ہے اور وہ ان پر اثر انداز ہوئی ہے۔ انتفاضہ ثانی کے آغاز کے بعد سے فلسطینی خودکش بمباروں کے ہاتھوں بعض یہودی بنیاد پرست، اسرائیل میں گرین لائن کے پیچھے رہنے والے ہیریڈی اور غربی کنارے کے مسیحا پرست آبادکار ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔ بعض اوقات مذہبی آبادکاروں نے اسی عرصے کے دوران فلسطینیوں پر حملے کر کے انہیں ہلاک اور زخمی کیا ہے۔ اس دوطرفہ تشدد نے ان یہودی بنیاد پرستوں کے ارادوں کو تقویت دی ہے جو اسرائیلی یہودی کنٹرول کا دائرہ غربی کنارے اور اس سے آگے تک وسیع کرنا چاہتے ہیں اور جو اپنی زیرِ قبضہ ساری یا زیادہ سے زیادہ زمین سے فلسطینیوں کو زبردستی بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔

حال ہی میں یہودی بنیاد پرستوں نے اپنے مطالبوں میں شدت پیدا کر دی ہے۔ 28 ستمبر 2000ء کے پھوٹنے اور پھیل جانے والے تشدد نے زیادہ اسرائیلی یہودیوں، امریکی یہودیوں اور عیسائی صیہونیت

پسندوں کو ان کی تائید پر مائل کیا ہے۔ اس پیشرفت کا حوالہ دیتے ہوئے "یروشلم رپورٹ" کے مدیر زیوی شافکس نے اپریل 2001ء میں لکھا: "عرب اسرائیل کو تباہ نہیں کر سکتے، لیکن ربی اسے برباد کر سکتے ہیں۔ ربی اسرائیل کو 2000 سال پرانے یہودی طرزِ حیات کے مطابق ڈھال کر اسے برباد کر سکتے ہیں، وہ اسے مذہبی قوانین اور مذہبی سوچ کے تحت چلنے والا ملک بنا کر تباہ کر سکتے ہیں، جو کہ اتنا پسماندہ اور نسلی دشمنی سے بھرا ہوا ہو گا کہ ایک ریاست کے طور پر فعال نہیں رہ سکے گا۔"

ربی ایلیاز رو الڈمین نے، جو کہ غربی کنارے کی ایک بستی کریت اربا کے ایک مذہبی سکول کا سربراہ ہے، 21 جون 2002ء کے "جیوئش پریس" (نیویارک) میں اپنے مضمون میں لکھا ہے: "اسرائیل کے فرزندوں کا اسرائیل کی سرزمین سے منفرد تعلق ہے جس کا موازنہ کسی بھی قوم کے اس کے وطن کے ساتھ تعلق سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا تعلق تو زمین آسمان کی تخلیق کے وقت وجود پذیر ہوا تھا۔ ہمارے ہاتھ کا مقدر ہے کہ یہودیوں کو زندگی دے اور یہودیوں کا مقدر ہے کہ وہ سرزمین کو زندگی دیں۔ جس طرح جلاوطن یہودیوں کو "قبرستان میں موجود ہڈیوں" سے تشبیہ دیا گیا ہے (ایزکائیل 37:11;12) اسی طرح یہودیوں سے خالی ارضِ اسرائیل کو ایک "ویران مقام" کہا گیا ہے (لیویٹیکس 26:32)۔ یہ فرمان ریاستِ اسرائیل کے جنم کا حقیقی سبب ہیں۔ یہ روشنی ریاستِ اسرائیل کو گھیرے ہوئے ملکوں کی تاریکی میں داخل ہو جائے گی۔ ہم جوڈیا اور سماریا میں غیر ملکی علاقوں پر قابض نہیں ہو رہے۔ یہ تو ہمارا قدیم گھر ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ ہم اسے دوبارہ زندگی کی طرف لے آئے ہیں۔ بدقسمتی سے یشا میں ہمارے کچھ قدیم شہر اب بھی غیر ملکیوں کے غیر قانونی قبضے میں ہیں، جو کہ اسرائیل کی نجات کے الوہی عمل میں خلل انداز ہوئے ہیں۔

"یہودی عقیدے اور نجات کے حوالے سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مضبوط اور واضح آواز میں بات کریں۔ ہمارے لوگوں کو متحد کرنے کے الوہی عمل اور ہماری سرزمین کو "سلامتی" اور "ڈپلومیسی" کے بظاہر منطقی تصورات سے دھندلانا اور کمزور نہیں کرنا چاہیے۔ وہ صرف سچ کو مسخ اور ہمارے کاز کے انصاف کو کمزور کرتے ہیں۔ ہم باعقیدہ لوگ ہیں۔ یہ ہماری ابدی شناخت کا جوہر اور ہر طرح کے حالات میں ہماری بقا کا راز ہے۔

"ہم اپنی شناخت کی پوشیدگی میں ذلیل وخوار ہوئے اور لتاڑے گئے۔ ہمیں ہمارے وطن میں واپسی لانے والے نجات کے عمل نے ہمیں ہماری سچی ذات واپس دے دی ہے، جس کو مزید نہیں چھپایا جا سکتا۔ ہم عالمی سٹیج پر واپس آ چکے ہیں، ہم ایک ذمہ دار حیثیت پا چکے ہیں، جسے ہم دوبارہ کبھی نہیں گنوائیں گے۔ ہمارے موقف کا صرف ایسا ہی واضح، جرأت مندانہ اور مسلسل اظہار ہی ہمارے دوستوں اور دشمنوں کو یہودیوں اور ارضِ اسرائیل کی ابدی حقیقت کا احترام کرنے پر آمادہ کرے گا۔"

یہ بات بھی واضح ہے کہ 28 ستمبر 2000ء کے بعد سے اسرائیلی اور اسرائیل کے باہر آباد یہودیوں کی

بڑھتی ہوئی تعداد یہودی بنیاد پرستی کے تصورات پر معترض ہوئی ہے۔اس کے علاوہ اسرائیل کے وزیر انصاف یوسف لیپڈ نے تب شاید درست ہی کہا تھا جب اس نے 19 دسمبر 2003ء کے اپنے ایک بیان میں غربی کنارے اور غزہ کے یہودی آبادکاروں کو''وحشی'' قرار دیا تھا۔اس نے ان پر اسرائیل میں ڈی فیکٹو کنٹرول رکھنے اور فلسطینیوں کو غربی کنارے اور اردن سے نکال دینے کے خواہش مند ہونے کا الزام بھی لگایا تھا۔

اگرچہ غربی کنارے کے عسکریت پسند مذہبی آبادکار اور ان کی سیاسی پارٹی''قومی مذہبی پارٹی'' زیادہ تر وزیراعظم ایریل شیرون کی حمایت کرتے رہے تھے تاہم وہ حکومت کی طرف سے کچھ چھوٹی بستیاں ختم کرنے پر مسلسل اعتراض کرتے رہے۔2003ء میں بہت سے بنیاد پرست آبادکاروں نے''قبضے'' کا لفظ استعمال کرنے پر وزیراعظم شیرون پر تنقید کی۔کش لعتز ائیون نامی آبادی کے آبادکار لیڈر رشال گولڈ شائن نے کہا''میں وزیراعظم کی بات پر بہت زیادہ حیران اور غصے میں ہوں۔میں تو اپنے آپ کو اس علاقے پر قابض نہیں سمجھتا۔یہ تو ہمارا علاقہ،ہمارا وطن ہے۔''2003ء میں مسیحا پرست آبادکار شیرون کے اس اعلان سے پریشان ہو گئے کہ اسرائیل اور غربی کنارے کے درمیان ایک حفاظتی باڑھ لگائی جائے گی۔اگرچہ باڑھ کے فلسطینیوں پر اثرات کے حوالے سے کافی مباحثہ ہوا ہے تاہم یہ آبادکاروں کے لیے بھی ایک پریشان کن معاملہ تھا اور آج بھی ہے۔بہت سے آبادکاروں کو تعمیراتی منصوبوں میں تبدیلی کے باوجود یہ ڈر ہے کہ کچھ آبادیاں اس باڑھ کی غلط سمت میں رہ سکتی ہیں اور انہیں خالی کرنا پڑے گا۔مزید برآں آبادکاروں کو یہ فکر بھی ہے کہ یہ باڑھ مستقبل میں نئی فلسطینی ریاست کی سرحد ہی نہ بن جائے۔وہ اس ریاست کے مخالف ہیں،جسے غربی کنارے کی موجودہ زمین پر بنایا جانا ہے۔

اسرائیل میں معاشی گراوٹ نے،جو کہ 2000ء کے آخر میں شروع ہوئی تھی اور آج تک جاری ہے، ریاستِ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی اور اس کے ماننے والوں پر اثر ڈالا ہے۔اسرائیلی یہودی ملک کی تاریخ کے بدترین معاشی مندے کا سامنا کر رہے ہیں۔بہت سے اسرائیلی یہودی اس کا ذمہ دار فلسطینیوں اور ان کے انتفاضہ ثانی کو ٹھہراتے ہیں جس کے تحت خودکش بمباری اور تشدد جاری ہے۔اس کی وجہ سے کچھ ایسے یہودی، جنہوں نے ماضی میں فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل کے بُرے سلوک پر تنقید کی تھی،تبدیل ہو گئے اور پورے غربی کنارے پر اسرائیل کے کامل اقتدار اور وہاں سے فلسطینیوں کو نکالے نہ جانے کی صورت میں،انہیں سختی سے دبا کر رکھنے کے مذہبی بنیاد پرستانہ تصور کے حامی ہو گئے ہیں۔(اس تصور کے حوالے سے غیر مذہبی یا مذہب دشمن اسرائیلی ،بنیاد پرستوں کے جواز کو تسلیم ہی نہیں کرتے)۔دوسرا عامل ہے حکومت کا محدود بجٹ اور مذہبی آبادکاروں کی سہولتوں میں کمی اور ٹیکس رعایتوں کی واپسی۔جو مذہبی آبادکار غربی کنارے میں نہ صرف نظریاتی وجوہات کے تحت منتقل ہوئے تھے بلکہ اس لیے بھی منتقل ہوئے تھے کہ وہاں متوسط طبقے سے طرزِ زندگی کے لطف اندوز ہوں گے،ان کے لیے سہولتوں کی کمی نے ان علاقوں میں رہنا بے کشش بنا دیا ہے۔

2003ء میں ہونے والے اسرائیلی انتخابات میں مذہبی پارٹی شاس نے اپنی گذشتہ 17 کنیسٹ نشستوں میں سے چھ گنوا دیں جبکہ مذہب مخالف پارٹی شینیو نے گذشتہ 6 کی جگہ 15 نشستیں حاصل کیں۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ مذہبی بنیاد پرستی کسی مشکل سے دوچار ہے۔ شاس کی چھ نشستیں ایریل شیرون کی لیکوڈ پارٹی نے حاصل کر لیں، جس سے اس کی نشستیں دگنی ہو گئیں۔ اب لیکوڈ کا مذہبی حلقہ انتخاب بہت وسیع ہو گیا ہے دیگر دو مذہبی پارٹیوں قومی مذہبی پارٹی (این آر پی) اور یہادوت ہاتورہ نے اپنی نشستیں نہیں گنوائیں۔ یہ دونوں پارٹیاں فلسطینی مسئلے پر انتہا پسندانہ موقف کو مستقلاً اپنائے ہوئے ہیں اور مقبوضہ علاقوں سے انخلا کے کسی بھی تصور کی مخالف ہیں۔ 2003ء کے انتخابات سے پہلے ان دونوں پارٹیوں کا موقف مذہبی معاملات پر زیادہ انتہا پسندانہ ہو گیا تھا۔ مذہبی معاملات پر روایتی طور پر انتہا پسند پارٹی شاس 2003ء کے انتخابات تک فلسطینی مسئلے پر زیادہ انتہا پسند بن چکی تھی۔ شاس کا ماضی کا موقف یہ تھا کہ اگر مقبوضہ علاقوں کو چھوڑنے سے جانیں بچتی ہیں تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ تاہم شاس کے روحانی سربراہ ربی اوویدیا یوسف نے 2003ء کے انتخابات کے وقت تک آبادکاروں یا "ان (مقبوضہ) علاقوں کے شہریوں" کی شان بڑھانا شروع کر دی تھی۔

ہم نے اپنی کتاب میں ربی مائر کاہان اور اس کی کاچ پارٹی کو شامل نہیں کیا تھا کیونکہ ہم اسے اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کے دور دراز گوشے میں پاتے تھے۔ درحقیقت میں کاہان کے کچھ نظریات و خیالات کو شامل کرنے کے حق میں تھا لیکن اسرائیل شحاک کو اصرار تھا کہ کاہان بنیاد پرستانہ نظریات کا حامل انتہائی متنازعہ انتہا پسند ہونے کے باوجود زیادہ اہم نہیں ہے۔ میں اس وقت اپنے رفیق کار کے خیالات سے متفق ہو گیا تھا، تاہم اب میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ غلطی تھی۔ ربی کاہان، جو امریکی یہودی ہے، اسرائیل نقل مکانی کر گیا تھا۔ وہ اسرائیل میں جا کر اس وقت بہت اہمیت حاصل کر گیا جب وہ مختصر عرصے کے لیے کنیسٹ کا رکن بنا۔ اس نے نومبر 1985ء میں دو بل پیش کیے تھے۔ پہلے بل کا عنوان تھا "اسرائیل میں علیحدگی کا قانون" اس بل میں ریاستِ اسرائیل میں عربوں اور یہودیوں کے مابین شادیوں اور ہر طرح کے سماجی میل جول پر پابندی لگانے کا عندیہ دیا گیا تھا۔ دوسرے بل میں صرف یہودیوں کو ریاست کے شہری قرار دیا گیا تھا۔ کنیسٹ کے اراکین نے دونوں بلوں کو نسل پرستانہ قرار دے کر رد کر دیا تھا اور کاہان کو سینسر کر دیا تھا، جو صرف ایک مرتبہ کنیسٹ کا رکن رہا۔

مائر کاہان، جسے 1990ء میں نیویارک سٹی میں قتل کر دیا گیا تھا، اسرائیل اور امریکہ کا ایک پرجوش مذہبی مقرر اور بعض اوقات متشددانہ سیاسی ایکٹوسٹ تھا۔ اس کی پارٹی کاچ کے اراکین اگرچہ کبھی تعداد میں بہت زیادہ نہیں رہے تاہم وہ بھی ایسے ہی نظریات و رجحانات کے مالک تھے۔ بہت سے اسرائیل اور امریکی یہودی کاہان کو فاشسٹ تصور کرتے تھے۔ وہ کئی حوالوں سے مسیحانہ صیہونیت کا واضح پرچارک تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہودی خدا کے منتخب لوگ ہیں اور مقدس اور سب سے برتر ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ارضِ اسرائیل یہودیوں کا واحد حقیقی وطن

اور جنت ہے، کیونکہ خدا نے یہودیوں سے اس کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اسرائیل میں تورات اور یہودیت کی روایتی تعلیمات میں واضح طور پر پیش کیے جانے والے خدا کے احکامات کی بنیاد پر یہودی ریاست لازماً قائم ہونی چاہیے۔ ایسی یہودی ریاست کو لازماً یہودیوں کی حامی ہونا چاہیے اور وہ اپنی حدود میں آباد یہودیوں کو جو مراعات اور حقوق دے، اسے وہی حقوق و مراعات غیر یہودیوں کو نہیں دینے چاہئیں۔ کاہان نے کہا تھا "ریاستِ اسرائیل خدا کے ہاتھوں میں ہے، ہم آخری مسیحانہ عہد میں موجود ہیں...... یہودی ریاست کو خدا کے نام کی تضحیک کرنے والی قوموں کے درمیان خدا کے نام کو تقدس دینا ہے۔" کاہان تالمود کے حوالے سے کہتا تھا کہ خدا تباہی پھیلاتا ہے اور یہودیوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ یہودیوں کے دشمنوں پر کوئی رحم کھائے بغیر انہیں تباہ کر دیں۔ کاہان کا کہنا تھا کہ فلسطینیوں کی اکثریت کو اسرائیل اور اردن کے علاقوں سے "منتقل" کر دینا چاہیے نیز جو فلسطینی رہ جائیں گے وہ دوسرے درجے کے شہری ہوں گے۔ (مزید تفصیلات کے لیے میرا مضمون "دی کاہان فینومینن" ملاحظہ کیجیے، جو "عرب اسٹڈیز" کی پہلی جلد [موسم گرما 1986ء] میں صفحات 56-48 پر شائع ہوا تھا)۔

کاہان اور ہماری کتاب میں زیرِ بحث آنے والے یہودی بنیاد پرستوں کے نظریات کی بنیاد ابنِ میمون کے پیش کردہ تصورات پر ہے۔ وہ یہودیت کا عظیم فلسفی اور ہلاکا (یہودی مذہبی قانون) پر ایک اتھارٹی تھا۔ ہم نے اپنی ساری کتاب میں میمون کے حوالے دیے ہیں۔ میمون کے حوالوں کا استعمال درست ہے یا نہیں، یہ ایک مسئلہ ہی ہے۔ اس حوالے سے نور مسلہا کا مضمون Reinventing Memonides: From Universalist Philosopher to Religious Fundamentalist (1967-2002) قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ مضمون "ہولی لینڈ سٹڈیز" جلد اول، نمبر 1، (ستمبر 2002ء) میں صفحات 117-85 پر شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپنے کے بعد کچھ سامیت دشمن افراد اور گروپوں نے بنیاد پرست یہودیوں کی اپنی یہودیوں سے نفرت کو درست قرار دینے والے ہمارے بیان کردہ ان کے دلائل کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہودی بنیاد پرستوں کے نظریات کو عیاں کر کے اس عمومی مفروضے کی تصدیق کر دی ہے کہ یہودی "بُری فطرت" کے مالک ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہودی بنیاد پرستی پر ہماری تنقید کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنے گندے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے ہمارے لکھے ہوئے تعارف کا حوالہ نہیں دیا، جس میں ہم نے یہودیوں کی زیادہ تر تاریخ سے اپنی محبت کو بیان کیا تھا اور یہودی بنیاد پرستی پر تنقید کرنے کی وجوہات بیان کی تھیں۔ ان سامیت دشمنوں نے جو کچھ کیا اور شاید کرتے رہیں گے، اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ ایسے افراد اور گروپ مختلف نظریات رکھنے والوں کے بیانات کے حوالے اسی طریقے سے دیتے ہیں۔ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اسرائیل شحاک اور میں سامیت دشمنوں کے عمل سے نفرت کرتے ہیں اور ہم ان کے اور ان کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہ سامیت دشمن کچھ بھی کہیں یہودیت کی منفی تعبیر و تشریح اور یہودیوں کی منفی

پیش رفتوں کا تجزیہ کرنے اور ان پر تنقید کرنے سے نہ تو اسرائیل شحاک باز آیا تھا نہ میں اسے ترک کروں گا۔ متفکر یہودیوں اور مہربان انسانوں کی حیثیت سے ہم نے بہت پہلے اس ذمہ داری کو محسوس کر لیا تھا۔ میرے علم کے مطابق انسانوں کے کسی گروپ کی تاریخ یا ان کے مجموعی نظریات مکمل طور پر مثبت نہیں ہیں اور نقائص سے پاک نہیں ہیں۔ ترقی کرنے کے لیے اور زیادہ مہربان بننے کے لیے بعض اوقات ماضی اور حال پر تنقید کرنا، شاید زیادہ سختی سے، ضروری ہوتا ہے، جو ہماری محبت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ جب ضروری ہو تو ہمیں اپنے گروپ کے تصورات اور اعمال پر تنقید کرنے پر آمادہ رہنا چاہیے۔ بائبل کے یہودی پیغمبروں اور ان کے بعد والوں نے یقیناً اسی تصور کی تبلیغ کی تھی اور اسی سبق کا درس دیا تھا۔ جن یہودی تبصرہ نگاروں نے ناحق تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب اور اس کے مصنفوں نے "سامیت دشمنی کو بھڑکایا ہے" انہیں اس نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔

نارٹن میزونسکی

پیش لفظ

پوری غیر اسلامی دنیا عرب دہشت پسندی کے مترادف سمجھی جانے والی اسلامی بنیاد پرستی سے نفرت کرتی ہے۔ امریکہ کی کلچرل اور دانشور اشرافیہ عیسائی بنیاد پرستی کو جہالت، اوہام پرستی، عدم رواداری اور نسل پرستی کے مترادف سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرتی ہے۔ عیسائی بنیاد پرستی کے پیروکاروں کی تعداد میں حال ہی میں ہونے والا اچھا خاصہ اضافہ اور اس کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثرات امریکہ میں جمہوریت کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہیں۔ اگرچہ یہودی بنیاد پرستی اسلامی اور عیسائی بنیاد پرستی کے تقریباً تمام عمرانی سائنسی (Social Scientific) خواص کی حامل ہے، تاہم اسرائیل اور چند ایک دوسرے ملکوں کے خاص حلقوں کے علاوہ عملی طور پر کوئی اس سے واقف نہیں ہے۔ جب یہودی بنیاد پرستی کا وجود تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اس کی عم زاد (Cousin) اسلامی اور یا عیسائی بنیاد پرستی کی خلقی (Inherent) برائیوں کا شدومد سے ذکر کرنے والے غیر یہودی اشرافیہ کے اکثر مبصر اس کی اہمیت کو غیر واضح مذہبی سرگرمی تک محدود کر دیتے ہیں یا اسے انوکھا وسطی یورپی لبادہ اوڑھا دیتے ہیں۔

معاصر معاشرے کے طالب علموں اور یہودیوں، ایک اسرائیلی اور ایک امریکی، کی حیثیت سے اور مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ ذاتی تعلقات رکھتے ہوئے ہم اسرائیل میں موجود یہودی بنیاد پرستی کو خطے میں امن کی راہ میں حائل ایک بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔

ہمیں اس امر پر افسوس ہے کہ جو لوگ دیگر بنیاد پرستانہ نظریات میں خلقی طور پر موجود تشدد کی نشاندہی کرنے میں تیزی دکھاتے ہیں، وہی لوگ امن کو یہودی بنیاد پرستی سے درپیش خطرات کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

یہودیوں کی حیثیت سے ہمارے لیے اس کتاب کو لکھنا اذیت دہ، خوفزدہ کر دینے والا اور اضطراب انگیز عمل تھا۔ ہم قلبی اور ذہنی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ یہودی بھی اعلیٰ ترین آدرشوں کو تسلیم کریں اور ان کے لیے جدوجہد کریں، ان آدرشوں کا ہم میں فقدان ہے۔ ہمارے مشاہدے کے مطابق یہ آدرش مغربی تہذیب کی اقدار کی روح ہیں اور ان کا اطلاق ساری دنیا پر ہو سکتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اقدار کسی بھی جگہ امن کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہودی بنیاد پرستی کے نام پر ان اقدار سے انحراف امن اور اسرائیلی جمہوریت کے ارتقا کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے اور یہ انحراف ہمیں یہودیوں اور انسان

دونوں حیثیتوں میں غصہ دلا دیتا ہے۔ ہم نے اپنے اسی غصے کو کم کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے اور اس امید میں لکھی ہے کہ یہ ہمارے قارئین کو بھی اتنی ہی فہم و بصیرت عطا کرے گی جتنی کہ ہمیں اس سے حاصل ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امن اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ خطے کی معاصر حیات کی لہروں اور جوابی لہروں کو نہیں سمجھ لیا جاتا۔ ماضی اس انتہائی تاریخی اور انتہائی مذہبی علاقے کے تمام لوگوں کے رجحانات، اقدار، مفروضوں اور رویوں پر حاوی ہے۔ ایک یہودی بنیاد پرست، مذہبی جنونی یگال امیر (Yigal Amir) نے وزیرِ اعظم اتزاک رابن (Yitzhak Rabin) کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ اس نے یہ اقدام یہودیت کی تعلیمات کے عین مطابق کیا تھا۔ اس سانحے کے بعد اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کی مخالفت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ قتل کی اس واردات کے بعد مذہبی یہودیوں کے لاتعداد گروپوں نے "سچے" یہودی مذہب کے نام پر اس کی حمایت کی تو اسرائیل کے لوگوں میں ماضی میں کافر یا گناہ گار کے الزام کا نشانہ بنا کر یہودیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے دیگر یہودیوں کے لیے دلچسپی ابھری۔ ہم نے اپنی کتاب میں اسرائیلی سکالروں کی ماضی اور حال کے حوالے سے کی گئی علمی تحقیق کے حوالے سے دکھایا ہے کہ جدید قومی ریاست کے وجود میں آنے سے صدیوں پہلے اپنے آپ کو خدا کے احکامات کے مطابق ابدی جنت کے لیے تیار کرنے والے یہودیوں نے کافروں اور/یا مذہبی گناہ گاروں کو سزائیں دیں یا موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ معاصر یہودی بنیاد پرستی تو جدید دور سے بھی پہلے سے یہودیوں میں موجود چلی آ رہی ایک صورتِ حال کا احیا ہے۔ یہودی بنیاد پرستی کے اساسی اصول وہی ہیں، جو دوسرے مذاہب میں پائے جاتے ہیں یعنی اس "خالص" اور نیک پاک مذہبی کمیونٹی کی بحالی اور بقا جس کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ وہ ماضی میں وجود رکھتی تھی۔

ہم نے اس کتاب میں بنیاد پرستی کے سرچشموں، آئیڈیالوجی، سرگرمیوں اور معاشرے پر اس کے مجموعی اثر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم نے مسیحانہ رجحان (Messianic Tendency) پر زیادہ زور دیا ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ یہ انتہائی اثر رکھنے والا اور خطرناک رجحان ہے۔ یہودی بنیاد پرست اسرائیل میں انسانی آزادیوں، بالخصوص اظہار کی آزادی کے فروغ کی عمومی طور پر مخالفت کرتے ہیں۔ جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے تو یہودی بنیاد پرستی کے مسیحانہ رجحان کے حامیوں کی غالب اکثریت والی نیشنل ریلیجس پارٹی مسلسل اس امر کی مخالفت کرتی رہی ہے کہ اسرائیل 1967ء سے اپنے تمام مفتوحہ و مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ دے۔ ان بنیاد پرستوں نے ہی 1978ء میں سینائی سے اسرائیل کے انخلا کی مخالفت کی تھی، جیسا کہ بیس برس بعد وہ مغربی کنارے (West Bank) سے انخلا کی مسلسل مخالفت کر رہے ہیں۔ ان یہودیوں نے ہی ایسی اٹلسیں (Atlases) شائع اور تقسیم کی تھیں، جن میں سینائی، اردن، لبنان، کویت اور شام کے بیشتر علاقوں کو موعودہ ارضِ اسرائیل میں شامل دکھایا گیا ہے، یعنی وہ ارضِ اسرائیل جو کہ صرف یہودیوں سے تعلق رکھتی ہے اور جسے آزاد کرایا جانا مطلوب و مقصود ہے۔ یہودی بنیاد پرست فلسطینیوں کے خلاف انتہائی امتیازی تجاویز کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ اس امر پر حیران ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ 1990ء کی دہائی کے سب سے زیادہ سنسنی پھیلانے والے دو یہودی قاتل

باروک گولڈ سٹائن اور ریگال امیر اور ان کے بیشتر مداح مسیحانہ رجحان رکھنے والے یہودی بنیاد پرست ہیں۔

1990ء کی دہائی میں اسرائیلی عمرانیات دانوں اور دیگر علوم کے سکالروں نے اسرائیلی معاشرے پر یہودی بنیاد پرستی کے اثرات پر ہمیشہ سے زیادہ توجہ دی۔ ان سکالروں میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کے پیروکار جمہوریت سے نفرت کرتے ہیں۔ یہودی بنیاد پرست تمام شہریوں کی برابری کی مخالفت کرتے ہیں، بالخصوص غیر یہودیوں اور "گمراہ" ہو جانے والے یہودیوں...... مثلاً ہم جنس پرستوں...... کی۔ ان بنیاد پرستوں سے متاثر اسرائیل کے مذہبی یہودیوں کی اکثریت کسی حد تک ایسے ہی خیالات کی حامل ہے۔ اسرائیل کے ممتاز عمرانیات داں باروک کمرلنگ نے 14 اکتوبر 1998ء کو شائع ہونے والے ایک کتاب پر تبصرے کے دوران دوسرے سکالروں کی تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا:

> اسرائیل میں غلبہ رکھنے والی آرتھوڈوکس اور قوم پرستانہ یہودیت کو جمہوری اقدار سے ہم آہنگ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جمہوری اقدار کے مخالف یہودیوں پر مذہبیت سے زیادہ کوئی اور شے اثر انداز نہیں ہے، نہ تو قومیت، نہ سلامتی کے حوالے سے رجحانات، نہ معاشی اور سماجی اقدار، نہ ہی نسلی تعلق اور نہ تعلیم۔ [1*]

کمرلنگ مزید کہتا ہے کہ کالج یا یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے والے سیکولر اسرائیلی جمہوری اقدار کے زیادہ حامی ہیں جبکہ یشیووت (مذہبی سکولوں) سے تعلیم حاصل کرنے والے مذہبی یہودی جمہوریت کے زبردست مخالف ہیں۔ یہ بات تو واضح ہے کہ اسرائیل کے مذہبی سکولوں میں جمہوری اقدار کے ساتھ ساتھ سیکولر کلچر اور طرز حیات کے بیشتر پہلوؤں کے حوالے سے عمیق بنیاد پرستانہ نفرت وعداوت پائی جاتی ہے۔

اسرائیلی یہودیوں کی اکثریت میں سیکولر طرز حیات سے موجود نفرت کے حوالے سے واضح دستاویزی شواہد دستیاب ہیں۔ مثال کے طور پر عبرانی زبان میں سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والے اسرائیلی اخبار "یدیوت اہرونوٹ" کے 20 ستمبر 1998ء کے شمارے میں اسرائیلی یہودی معاشرے کا ایک کلچرل سروے شائع کیا گیا ہے۔ اس سروے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ کلچر کے اسرائیلی صارفین نے، یعنی وہ لوگ جو عجائب گھروں کی سیر کرتے ہیں، موسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں اور تھیٹرز دیکھنے جاتے ہیں، ہائی سکول تک تعلیم حاصل کی ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو یا تو سیکولر کہتے ہیں یا غیر آرتھوڈوکس (مذہبی)۔ اسرائیلی اخبارات اور ربیوں کے اعلانات میں کلچرل سرگرمیوں کی مذمت کی جاتی ہے، جس سے مذکورہ سروے کے نتائج کی توثیق ہوتی ہے۔

یہودی بنیاد پرست ایسے یہودیوں کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کر چکے ہیں، جنہوں نے ایک مختلف جنسی طرز حیات اپنا لیا ہوا ہے۔ 1990ء کی دہائی میں اکثر اسرائیلی ربیوں اور مذہبی سیاسی پارٹیوں نے اسرائیل میں ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں کے زیادہ نمایاں اور طاقتور ہونے کے عمل پر شدید مخالفانہ ردعمل کا اظہار کیا۔ ہلاکا (یہودی مذہبی قانون) کی رو سے مردانہ ہم جنس پرستی (Homosexuality) کی سزا موت بذریعہ سنگساری

ہے، اور اگرچہ سزا تو واضح نہیں ہے تاہم نسائی ہم جنس پرستانہ (Lesbian) تعلقات بھی ممنوع ہیں۔ اسرائیلی سیکولر پریس نے 1990ء کی دہائی میں ہم جنس پرست مردوں سے نمٹنے کے لیے ربیوں کی دی گئیں زیادہ اشتعال انگیز تجاویز پر تنقید کی تھی۔ مذکورہ تجاویز میں "لازمی علاج" اور/یا ایک خاص مدت تک "کسی ادارے کے اندر محدود رکھ کر تعلیم دینا" شامل تھا۔

بہت سے ربیوں نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ یہودی ہم جنس پرست مردوں کو موت کی سزا دیے جانے کے حامی ہیں۔ (ربی ہم جنس پرست عورتوں کو چھوڑنے پر مائل تھے) اسرائیلی مذہبی سیاسی پارٹیوں نے ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے اپنے انتخابی اشتہارات میں عمومی طور پر اس بات پر زیادہ زور دیا کہ ہم جنس پرستی ان بڑے خطروں میں سے ایک ہے، جن کا سامنا اسرائیل کو ہے۔ مذہبی پارٹیاں پبلک سکولوں کے نصاب سے ایسی خوب صورت عبرانی نظموں کو خارج کروانے میں کامیاب رہی ہیں، جن میں ہم جنس پرستانہ محبت کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ سنسر شپ بنیاد پرستانہ اثر کا ثبوت ہے۔ اسرائیلی معاشرے میں پائی جانے والی یہودی بنیاد پرستی کے حامیوں اور مخالفوں کے تنازعے اسرائیلی سیاست کے اہم ترین معاملات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں ہم نے ان سب مسائل اور/یا معاملات پر بحث نہیں کی ہے۔ اس کے بجائے ہم نے یہودی بنیاد پرستی کے انتہائی سنگین مسائل اور معاملات پر توجہ مرکوز کی ہے۔

"یہودی مفاد" کے محافظ یہودیوں اور/یا یہودیت پر تنقید کرنے والے لوگوں پر اکثر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں ان کی مثبت خصوصیات کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ ممکن ہے ان مثبت خصوصیات کا زیر بحث مواد سے تھوڑا تعلق ہو یا بالکل بھی نہیں ہو۔ مثال کے طور پر کچھ ایسے محافظوں نے سیفی راکلیوسکی پر، اس کی بیسٹ سیلنگ کتاب MESSIAHS' DONKEYS کی اشاعت کے بعد شدید تنقید کی۔ راکلیوسکی نے اس کتاب میں بالکل درست لکھا تھا کہ یہودی بنیاد پرستی کے مسیحانہ رجحان کے بانی ربی کک دی ایلڈر نے (جس کا تذکرہ ہماری کتاب میں بھی کیا گیا ہے) کہا تھا: "ایک یہودی روح اور تمام غیر یہودی روحوں میں فرق، ایک انسان اور تمام جانوروں کی روحوں کے فرق سے زیادہ بڑا اور گہرا ہے۔" راکلیوسکی پر تنقید کرنے والوں نے ربی کک کے اس حوالے کی موزونیت کو ٹھوس انداز میں رد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بجائے انہوں نے کہا کہ ربی کک نے دوسری باتیں بھی کہی تھیں اور راکلیوسکی نے انہیں نظر انداز کر کے ربی کک کی تعلیمات کو مسخ کیا ہے۔ راکلیوسکی نے نشاندہی کی تھی کہ ربی کک کی تمام تر تعلیمات کی اساس لیوریائی کبالا ہے، جو کہ سولھویں صدی کے اواخر سے انیسویں صدی تک یہودیت پر غالب رہنے والی یہودی تصوف کی ایک شاخ ہے۔ لیوریائی کبالا کا ایک اساسی عقیدہ یہ ہے کہ یہودی روح اور جسم، غیر یہودی روح اور جسم پر مطلق برتری کی حامل ہوتی ہے۔ لیوریائی کبالا کے مطابق دنیا صرف اور صرف یہودیوں کے لیے تخلیق کی گئی تھی، غیر یہودیوں کا وجود تو محض رعایتی ہے۔ اگر کوئی بااثر عیسائی بشپ یا مسلمان سکالر کہتا کہ غیر یہودیوں کی اعلیٰ ترین روحوں اور یہودیوں کی حقیر روحوں کے درمیان فرق، انسانی روح اور جانوروں کی روحوں کے فرق سے زیادہ بڑا ہے تو یہودی سکالر اس کے مثبت بیانات

کو نظر انداز کر کے شدید اشتعال میں آجاتے اور اسے سامیت دشمن قرار دے دیتے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو راکلیوسکی پر تنقید کرنے والے منافق ہیں۔ یہ امر کہ ربی گک گوشت خور نہیں تھا اور وہ نباتات کے حقوق کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ اپنی مسرت کے لیے پھولوں کو توڑنے اور گھاس کو کاٹنے تک اجازت نہیں دیتا تھا، یہودیوں اور غیر یہودیوں کی روحوں کے تقابل کے حوالے سے اس کی حیثیت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا۔ ربی گک غیر یہودیوں پر یہودیوں کے مظالم کو ناپسند کرتا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے اس اعلانیہ ایقان پر کم تنقید نہیں کرنی چاہیے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران لاکھوں فوجیوں کی ہلاکت یہودیوں کی نجات اور مسیح کی آمد کی ایک نشانی ہے۔

راکلیوسکی پر نکتہ چینی کرنے والے نیز وہ لوگ جو ممکن ہے اس کتاب پر اور ہم پر ایسی ہی تنقید کریں گے، اس میدان میں تنہا منافق نہیں ہیں۔ انگریزی بولنے والے اور دوسرے ملکوں میں کتابوں کی دکانوں کی شیلفیں عمومی طور پر یہودی تصوف اور خصوصی طور پر ہیسیڈ ازم اور لیوریائی کبالا پر لکھی گئیں کتابوں کے بوجھ تلے کراہ رہی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین میں سے کئی ایک کو مشہور سکالر مانا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے بہت چھوٹے موضوعات پر علمیت بگھاری ہوتی ہے۔ تاہم جو لوگ صرف ان موضوعات پر انہی کتابوں کو پڑھتے ہیں، وہ یہ شبہ نہیں کر سکتے کہ یہودی تصوف، لیوریائی کبالا، ہیسیڈ ازم اور یہودی برتری کے اساسی تصورات پر مبنی ربی گک کی تعلیمات کا موازنہ سامیت دشمنی کی بدترین صورتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں کے باعلم مصنفین ارادتاً ایسے تصورات کا حوالہ نہیں دیتے۔ یہ مصنفین منافق ہیں۔ یہ مصنفین ان بہت سے مصنفوں سے مشابہ ہیں جنہوں نے سٹالن اور سٹالن ازم پر کتابیں لکھی ہیں۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو صرف سٹالنسٹ مصنفوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں۔ ایسے لوگ سٹالن کے جرائم سے آگاہ نہیں ہو سکتے اور سٹالنسٹوں کے عہدِ حکومت اور ان کے نظریات کے حوالے سے غلط تصورات کے حامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کچھ خاص یہودی، جن میں سے بعض سیاسی اثر و رسوخ کے بھی حامل ہیں، یہودیوں کو غیر یہودیوں سے برتر تصور کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دنیا صرف اور صرف یہودیوں کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ یہودی برتری کا یہ عقیدہ اس وقت انتہائی خطرناک ہو جاتا ہے، جب اپنے بچوں سے محبت کرنے والے، دوسرے یہودیوں سے دیانت دارانہ تعلق رکھنے والے اور دیگر تمام مذاہب کے بنیاد پرستوں کی طرح مخلص نیک عمل کرنے والے یہودی اس کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ اس وقت کم خطرناک ہوتا ہے جب مذہب اور ریا بدعنوانی (کرپشن) میں بہت زیادہ دلچسپی نہ لینے والے یہودی اس کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک سیکولر اور آمرانہ نظام سے اس سے ملتی جلتی مثال دینا بہتر رہے گا اور وہ یہ کہ ایک وفادار پارٹی ورکر یا ایک کٹر قوم پرست عموماً اسی نظریاتی نظام کے ایک کرپٹ فرد سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتا ہے۔

اس پیش لفظ میں ہم جو آخری بات کرنا چاہتے ہیں وہ ذاتی بھی ہے اور آفاقی بھی۔ یہودی کی حیثیت میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد اس کتاب میں بیان کیے گئے کم سے کم خیالات پر یقین رکھتے تھے۔ یہی

بات موجودہ زمانے کے یہودیوں پر بھی صادق آ سکتی ہے۔ ماضی میں بہت سے غیر یہودی، انفرادی طور پر اور کسی گروپ کے رکن کی حیثیت میں، سامیت دشمن خیالات کے حامل ہوتے تھے۔ جو بالخصوص حالات موافق ہونے پر، یہودیوں کے حوالے سے دوسروں کے رویوں پر اثر ڈالتے تھے۔ بالکل اسی طرح ماضی میں ہر جگہ غلامی کو جائز سمجھا جاتا تھا، عورتوں کی مردوں سے کمتر حیثیت ایک عالمگیر مظہر اور ایک ملک کے کسی ایک فرد یا خاندان سے متعلق اور موروثی ہونے کا یقین موجود تھا۔ یہودی بنیاد پرست ماضی کی طرح آج بھی ایک ایسے سنہرے دور پر یقین رکھتے ہیں، جب ہر شے کامل ہوتی تھی یا کاملیت پذیر تھی۔ ان کے لیے یہ سنہرا دور اس قدر حقیقی ہے کہ جب انہیں مہلک عقائد اور اعمال کے مسائل کا سامنا ہوتا ہے تو وہ خدا کا کلام پڑھ کر، ماضی کے جھوٹے قصے کہہ کر اور برتری کا احساس رکھنے اور یہودیوں کی تحقیر کرنے والے غیر یہودیوں کی مذمت کر کے تحفظ پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بنیاد پرست یہودی برتری کے اپنے عقیدے اور غیر یہودیوں کے لیے تحقیر کے احساس کو جائز بھی قرار دیتے ہیں کہ جس میں ان کے تصورات غالب ہوں۔ ہم نے یہودی بنیاد پرستی اور اس کے پیروکاروں کے جوہری کردار کو منکشف کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ کردار اسرائیلی معاشرے کی جمہوری خصوصیات کے لیے خطرہ ہے۔ ہمارا ایقان ہے کہ آگہی مخالفت کا پہلا مرحلہ ہوتی ہے۔ ہمیں ادراک ہے کہ یہودی بنیاد پرستی پر تنقید کرتے ہوئے ہم اپنے ماضی کے ایک ایسے حصے پر تنقید کر رہے ہیں، جس سے ہمیں محبت ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ ہر انسانی جمعیت (Human Grouping) کے رکن دوسروں کے تنقید کرنے سے پہلے خود ہی اپنے ماضی پر تنقید کریں۔ ہمارا یہ بھی ایقان ہے کہ اس کے نتیجے میں انسانی جمعیتوں کے درمیان افہام و تفہیم بڑھے گی اور اس کے بعد، آہستہ روی سے اور رکتے رکتے، اقلیتوں کے ساتھ طرز عمل بہتر ہو جائے گا۔ ہماری بیشتر کتاب کا تعلق اسرائیلی یہودی معاشرے کے بنیادی عقائد اور ان کے نتیجے میں بننے والی پالیسیوں سے ہے۔ ہمارا ایقان ہے کہ یہودی بنیاد پرستی پر تنقید، جو کہ یہودی ماضی پر تنقید ہے، یہودیوں کو فلسطینیوں کے حوالے سے زیادہ افہام و تفہیم پیدا کرنے میں اور ان کے حوالے سے رویے کو بہتر بنانے میں معاون ہو سکتی ہے، بالخصوص 1967ء میں فتح ہونے اور اس سال سے مقبوضہ چلے آنے والے علاقوں میں۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری تنقید مشرق وسطیٰ کی دوسری قوموں کو بھی تحریک دے گی کہ وہ اپنے حوالے سے اپنا علم بڑھانے اور موجودہ زمانے میں دوسروں کے لیے اپنے رویے کو بہتر بنانے کی غرض سے اپنے سارے ماضی پر تنقیدی نگاہ ڈالیں گے۔

یہ سب اقدامات مشرق وسطیٰ میں امن لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اسرائیل شحاک / نارٹن میزونسکی

اہم اصطلاحات اوران کے مفاہیم

اگودات اسرائیل:

عبرانی میں اس کا مطلب ہوتا ہے "یہودیوں کی تنظیم" ۔ یہ ایشکنازی ہیریڈی پارٹی کا سابقہ نام ہے، جو کہ اب یہادوت ہاتورہ کہلاتی ہے۔

ایرون ہاکودیش:

عبرانی میں اس کا مطلب ہوتا ہے "مقدس الماری" ۔ یہودیوں کی عبادت گاہ سینا گوگ میں تورات کو اس مقدس الماری میں رکھا جاتا ہے اور صرف خاص خاص مواقع پر نکالا جاتا ہے۔ اس الماری کو سینا گوگ کی سب سے مقدس جگہ مانا جاتا ہے۔

ایشکنازی:

پرانی عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہوتا تھا "جرمن" ۔ یہ لفظ ان یہودیوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو شمالی فرانس، انگلینڈ، جرمنی، پولینڈ، روس اور وسطی و مشرقی یورپ کے دوسرے ملکوں میں رہتے تھے۔

بار متزوا:

"احکامات عشرہ پر عمل کرنے کا اہل" جب کوئی یہودی لڑکا تیرہ سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اسے احکامات عشرہ پر عمل کرنے نیز گناہوں کا ارتکاب کرنے کا اہل مانا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک تقریب منعقد کی جاتی ہے، جسے بار متزوا کہتے ہیں۔

بلیک پینتھرز:

1970ء کی دہائی کے دوران اسرائیل میں کام کرنے والی مشرقی (اورینٹل) یہودیوں کی ایک چھوٹی مگر بہت مشہور تنظیم۔ یہ تنظیم مشرقی یہودیوں نے اپنے ساتھ برتے جانے والے امتیاز پر احتجاج کرنے کے لیے بنائی تھی۔

بنی براک:

تل ابیب کے نزدیک واقع اسرائیلی شہر کا نام۔ اس شہر میں صرف ہیریڈم رہتے ہیں، جن میں زیادہ تر اشکینازی ہیں۔

بارڈر گارڈز:

عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے "حاصل شدہ شے۔" اس لفظ کو یہودی تصوف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ گیارہویں صدی عیسوی سے رونما ہونے والے یہودی متصوف گروہوں کے لیے خصوصاً استعمال کیا جاتا ہے۔

داور:

عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے "معاملہ۔" اس نام سے عبرانی زبان میں ایک اخبار شائع ہوتا تھا، جو 1990ء کی دہائی میں بند ہو گیا۔

ڈیگل ہاتورہ:

عبرانی میں اس کا مطلب ہوتا ہے "تورات کا پرچم۔" یہودیوں کی پارٹی یہادوت ہاتورہ کے اندر متنیگڈم کا ایک دھڑا۔

آریہ دیری:

شاس پارٹی کا مرکزی سیاست دان۔ وہ 1959ء میں پیدا ہوا تھا۔ اپریل 1999ء میں اسے رشوت لینے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور چار سال کے لیے سزائے قید دی گئی۔ اس کی اپیل پر سزا ملتوی کر دی گئی تھی۔

گاؤن:

اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے "نابغہ" 650ء سے 1050ء کے دوران عراق کے دو چیف ربیوں کو یہ خطاب دیا گیا تھا۔ انھیں تمام یہودی اعلیٰ ترین مذہبی شخصیت تسلیم کرتے تھے۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران کسی بھی اہم ربی کے لیے اس خطاب کو عزت افزائی کے واسطے استعمال کیا جانے لگا تھا۔

گیونم:

گاؤن کی جمع۔

ربی شلومو گورن:

ایک اہم اسرائیلی ربی۔ وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان نے اسے اسرائیلی فوج کا پہلا چیف ربی مقرر کیا تھا۔ 1960ء اور 1970ء کے عشروں میں وہ اسرائیل کا چیف ربی رہا۔

گش ایمونم:

''ایمان والوں کی جماعت۔'' 1974ء کے اوائل میں شروع ہونے والی نظریاتی اور مسیحانہ تحریک (ملاحظہ کیجئے چوتھا اور پانچواں باب)

ہائین ہاشویعیت:

''ساتویں آنکھ۔'' یہ ایک رسالے کا نام ہے، جسے اسرائیلی انسٹی ٹیوٹ آف ڈیموکریسی ہر دو ماہ بعد شائع کرتا ہے۔ یہ رسالہ ذرائع ابلاغ پر تنقید کے لیے مخصوص ہے۔

ہارتز:

عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے ''وطن''۔ یہ عبرانی کے سب سے مؤقر اخبار کا نام ہے۔ اس اخبار کو زیادہ تر طبقۂ اشرافیہ پڑھتا ہے۔

ہداشوت:

''خبریں۔'' یہ ایک ریڈیکل عبرانی اخبار تھا، جو 1980ء کی دہائی اور 1990ء کی دہائی کے اوائل میں شائع ہوتا تھا۔

ہائر:

''شہر''۔ یہ بھی ایک عبرانی اخبار کا نام ہے، جو ہر جمعے کو شائع ہوتا ہے۔ تل ابیب اور اس کے نزدیکی ریڈیکل رجحانات والے شہروں میں اسے پڑھا جاتا ہے۔

ہلاکا:

''قبول کیا گیا''۔ اس اصطلاح کے دو مفاہیم ہیں:

1- مکمل یہودی مذہبی قانون
2- اس قانون کی ایک شق

ہم نے الجھن سے بچنے کے لیے اس کتاب میں اس اصطلاح کو صرف اولین مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ جہاں یہودی مذہبی قانون پر مبنی کتابوں سے مؤخر الذکر مفہوم میں حوالے آئے ہیں، وہاں ہم نے لفظ ''قانون'' استعمال کیا ہے۔

ہیریڈیم:

''ڈرنے والے۔'' عبرانی میں اس سے مراد لی جاتی ہے ''خدا سے ڈرنے والے۔'' یہاں یہودی بنیاد پرستوں کا نام ہے، جو جدید ایجادات کو قبول نہیں کرتے۔ اس لفظ کا واحد ہیریڈی ہے، جو کہ ایک متعلق فعل بھی

ہے۔

ہاشوا:

"ہفتہ۔" یہ ہیریڈم کے انتہاپسندانہ ہفت روزے کا نام ہے۔

ہیدر:

اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے "کمرا" یہ ماقبلِ جدید یہودی سکول سسٹم کا نام تھا۔

ہیسڈر:

اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے "انتظام۔" اسرائیلی فوج کے مذہبی یونٹوں کا نام، جو کہ ایک خصوصی انتظام کے تحت خدمات انجام دیتے ہیں۔

اسرائیل اے اور اسرائیل بی:

اسرائیلی یہودی معاشرے کے ایک دوسرے کے مخالف دو حصوں کے لیے استعمال ہونے والی دو عوامی اسرائیلی اصطلاحیں۔ مذکورہ دو حصوں میں سے پہلے کا جھکاؤ دائیں بازو کی طرف ہے جبکہ دوسرے کا بائیں بازو کی طرف۔ دوسرا حصہ مذہب سے کم متاثر ہے۔

ربی یوسف کارو: (1575ء--1488ء)

ابنِ میمون اور دوسرے مذہبی مصنفوں کی کتابوں کا شارح اور "شلہان اروک" نامی کتاب کا مصنف۔ اسے سولہویں اور سترھویں صدی کی سب سے اہم مذہبی اتھارٹی مانا جاتا ہے۔

کشروت:

"درست طریقہ۔" ہلاکا کی رو سے مذہبی یہودیوں کے لیے حلال قرار پانے والی غذاؤں کی قسموں کا تعین کرنے اور انہیں تیار کرنے کے درست طریقے بتانے والے قوانین کا مجموعہ۔

کتزر شلہان اروک:

"شلہان اروک کا خلاصہ۔" ہلاکا کے ضروری قوانین پر مشتمل ایک مشہور کتاب۔ ہیریڈی بچوں اور غیر تعلیم یافتہ ہیریڈم کو اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسے انیسویں صدی کے شروع میں ربی شلوموگیعو فرائڈ نے لکھا تھا۔

کولیل:

اس لفظ کا مطلب ہے "پورا۔" یہ یشیوا کی تعلیم مکمل کر لینے والے بالغوں کو تالمود پڑھانے والے ادارے کا نام ہے۔

ربی اور اکم ہتزاک ہاکوہن کک (1953ء-1865ء)

اس کتاب میں اس کا ذکر "ربی کک دی ایلڈر" کے نام سے کیا گیا ہے۔ وہ مختلف مذہبی عہدوں پر فائز رہنے کے بعد 35-1920ء کے دوران فلسطین کا چیف ربی رہا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے نوٹس کو ایڈٹ کر کے اس کی بہت سی کتابیں شائع کی گئیں۔ وہ مسیحانہ نظریئے کا بانی تھا (ملاحظہ کیجئے چوتھا اور پانچواں باب) گش ایمونم کے پیروکار اس کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں، جبکہ تمام صیہونی کسی حد تک اس کی توقیر کرتے ہیں۔

ربی زوی ہاکوہن کک: (1982ء-1890ء)

وہ ربی اور راہام ہتزاک کک کا بیٹا تھا۔ اس کتاب میں اس کا ذکر "ربی کک دی ینگر" کے نام سے کیا گیا ہے۔ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد مسیحانہ نظریئے کو ماننے والوں کا رہنما بنا۔ گش ایمونم کے تمام اہم ربی اس کے شاگرد ہیں۔

کوشر:

کشروت کے قوانین کے مطابق منتخب اور تیار کی گئی غذا کو عبرانی میں نیم طنزیہ انداز میں "کوشر" کہتے ہیں۔ مہذبانہ گفتگو میں اس مفہوم کی ترجمانی کے لیے عبرانی کا درست لفظ "کاشر" بولا جاتا ہے۔

لیبر:

اسرائیل میں بائیں بازو کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی پارٹی۔ اس کا پورا نام ہے: "اسرائیلی لیبر پارٹی۔"

لیکوڈ:

اسرائیل میں دائیں بازو کی سب سے بڑی پارٹی۔

لیوریائی کبالا:

کبالا کی سب سے اہم شاخ، جو کہ سترہویں صدی سے چلی آرہی ہے۔ اسے ربی آئزک لیوریا (72-1538ء) نے قائم کیا تھا۔ یہ یہودی تصوف کی دیگر سب شاخوں پر حاوی ہو چکی ہے۔

ماریو:

"شام"۔ عبرانی زبان میں شائع ہونے والا روزنامہ، جو فروخت کے اعتبار سے دوسرا بڑا اخبار ہے۔

میمونائیڈز:

عبرانی کی پیروی میں اس کتاب میں اس نام کو دو مفاہیم میں استعمال کیا گیا ہے:

1۔ ربی موسیٰ بن میمون کے لیے، جسے یورپی زبانوں میں میمونائیڈز کہا جاتا ہے۔ اس نے ہلاکا کی

شرح پر مبنی کئی کتابیں لکھی تھیں۔ وہ یہودیت کا عظیم ترین فلسفی ہے۔ (ہم اردو ترجمے میں وہی نام استعمال کریں گے جو کہ اردو بولنے والوں میں معروف ہے یعنی موسیٰ بن میمون یا ابن میمون۔ مترجم)

2۔ موسیٰ بن میمون کی ترتیب دی ہوئی ہلاکا کی سب سے ضخیم کتاب، جس کا نام ''مشنا تورہ'' (تورات ثانی) ہے۔ یہ کتاب تمام یہودی احکامات اور عقائد پر مشتمل ہے۔

ماسکیلم:

''روشن خیال۔'' اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی میں یہودیت کے جدید اثرات کو متعارف کروانے والے لوگوں کا خود اختیار کردہ نام۔

مشنا:

تالمود کے بنیادی اور آسان ترین حصے کو مشنا کہتے ہیں۔

متیکڈم:

اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے ''مخالف۔'' یہ اسرائیل میں انتہائی دائیں بازو کی پارٹی کا نام ہے۔ اب اس کے رکن اسرائیلی پارلیمنٹ میں بھی پہنچ گئے ہیں۔

نیشنل ریلیجس پارٹی:

یہ اسرائیل میں موجود ایسے یہودی بنیاد پرستوں کی پارٹی ہے، جو ہیریڈم نہیں ہیں۔ اس کتاب میں اسے کثر این آر پی کے مخفف کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

مشرقی یہودی:

انہیں عبرانی میں ''مزراحیم'' کہا جاتا ہے۔

آرتھوڈوکس:

جو یہودی ہلاکا کے قوانین پر مکمل طور پر یا کم سے کم بیشتر قوانین پر عمل کرتے ہیں انہیں اسرائیل اور دیگر سب ملکوں میں آرتھوڈوکس یہودی کہا جاتا ہے۔ آرتھوڈوکسی کا لفظ آرتھوڈوکس یہودیوں کے رویے اور اعمال کے لیے استعمال ہوتا ہے (عیسائیت کے برعکس یہودیت میں آرتھوڈوکس اور آرتھوڈوکسی کو عقائد کی نسبت اعمال کے لیے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔)

فلسطینی تالمود:

اسے عبرانی میں نادرست انداز میں ''یروشلم یہوڈ'' کہا جاتا ہے۔ دو تالمودوں میں سے یہ تالمود کم مستند اور کم جامع سمجھی جاتی ہے۔

پینٹا ٹوچ:

بائبل کی پہلی پانچ کتابیں۔ یہودی انہیں باقی بائبل سے زیادہ مقدس مانتے ہیں۔

پیورم:

ایک تہوار جو عید یہود سے تقریباً ایک ماہ پہلے منایا جاتا ہے۔ یہ کارنیوال کی بہت سی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ تاہم غیر یہودیوں کے لیے بہت زیادہ نفرت کا اظہار بھی اس کا خاصہ ہوتا ہے![1]

ربینو:

اس لفظ کا مطلب ہے "ہمارا ربی۔" یہ اہم ربیوں کا غیر سرکاری خطاب ہے۔

ربی:

یہودیوں کے یہیڈی فرقوں کے مذہبی پیشواؤں کا خطاب۔

سفاردی:

عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے "ہسپانوی۔" 1970ء کی دہائی تک اسرائیل میں مشرقی یہودی کے بجائے یہ اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔

شاتنیز:

اون اور سن کو ملا کر بنایا گیا کپڑا۔ یہودیوں کو اس کپڑے کی تیاری سے منع کیا گیا ہے۔

ربی ایلیازر شاس (-1899ء)

یہ ڈیگل ہاتورہ فرقے کا روحانی پیشوا اور اسرائیل کا ایک انتہا درجہ بااثر ربی ہے۔

شاس:

یہ مشرقی یہودی ہیریڈم کی پارٹی کا نام ہے۔

شیشی:

عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہے "چھٹا۔" جمعے کے دن کو بھی شیشی کہا جاتا ہے۔ پہلے اس نام سے ایک عبرانی ہفت روزہ شائع ہوا کرتا تھا۔

شوفر:

مینڈھے کا سینگ، جسے سیناگوگ میں بعض عبادات کے دوران اور خصوصاً نئے سال کے موقعے پر بجایا جاتا ہے۔

پروفیسر گرشن شولم (1982ء-1899ء):

کبالا کے جدید مطالعے کا بانی۔ اس نے یہودی تصوف پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔

شلہان اریوک:

ربی یوسف کاروکی لکھی ہوئی ضخیم کتاب "بیت یوسف" کا خلاصہ۔ یہ کتاب موسیٰ بن میمون کی کتاب سے مختصر ہے، کیونکہ اس میں بہت سے کم اہم موضوعات کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ آرتھوڈوکس یہودی اس کتاب کو بہت مستند مانتے ہیں۔ موسیٰ بن میمون کی کتاب اور "شلہان اریوک" میں بہت کم فرق ہے۔

پروفیسر یورائیل تال:

متوفی 1985ء۔ وہ تل ابیب یونیورسٹی میں جرمن تاریخ کا پروفیسر تھا۔

تالمود:

عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہے "مطالعہ۔" تالمود دو ہیں: فلسطینی تالمود اور بابلی تالمود۔ یہ اصطلاح عموماً بابلی تالمود کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جسے آرتھوڈوکس یہودی اپنی مستند ترین مذہبی کتاب مانتے ہیں۔ دونوں تالمودوں کا بنیادی حصہ مشنا ہے، جو کہ عبرانی میں لکھے گئے قوانین کا مجموعہ ہے۔ دوسرے حصے کو "جیمارہ" کہتے ہیں، جس میں مشنا کے قوانین کو متعدد قصوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ جیمارہ مشنا سے زیادہ ضخیم ہے اور آرامی و عبرانی دو زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ دونوں تالمودوں کو ساٹھ ساٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بابلی تالمود کو ہمیشہ ایک معیاری نسخے کے عین مطابق چھاپا جاتا ہے۔

تورہ شیبال پیہہ:

اس عبرانی اصطلاح کا مطلب ہے "زبانی تورات۔" آرتھوڈوکس یہودی اس اصطلاح کو بائبل کے علاوہ دیگر مقدس یہودی تحریروں کے لیے خصوصاً استعمال کرتے ہیں۔

تسومیت:

دائیں بازو کی سیکولر پارٹی، جس کا سربراہ ریزرو جنرل رافیل ایتان ہے۔ یہ لیکوڈ پارٹی کی اتحادی ہے۔ تسومیت 1990ء کی دہائی کے دوران سیاسی اعتبار سے طاقتور رہی ہے۔

یہادوت ہاتورہ:

اس عبرانی اصطلاح کا مطلب ہے "تورات کی یہودیت۔" یہ اشکینازی ہیریڈم کی پارٹی کا نام ہے۔ اس پارٹی کے دو تقریباً آزاد دھڑے ہیں۔ ایک دھڑا ڈیگل ہاتورہ پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا حسیڈی فرقوں کے ایک اتحاد پر۔

یاحید نیمان:

یہ ڈیگل ہاتورہ کے ہفت روزے کا نام ہے۔

یدیوت اہرونوٹ:

عبرانی میں اس کا مطلب ہوتا ہے "آخری خبر"۔ یہ سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والا عبرانی اخبار ہے۔

یروشلم:

یروشلم میں جمعے کے روز شائع ہونے والا اخبار، جس کا تعلق یدیوت اہرونوٹ سے ہے۔

یشیوا:

عبرانی میں اس لفظ کا مطلب ہوتا ہے "نشست یا اجلاس" یہ اعلیٰ تالمودی مطالعات کا ادارہ ہوتا ہے۔اس لفظ کی جمع ہے "یشیووت"۔

یوم کپور:

یہودی مذہبی تقویم کا مقدس ترین دن۔

ربی اوویدیا یوسف:

شاس پارٹی کا روحانی پیشوا۔

تعارف

یہ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کے حوالے سے لکھی گئی ایک سیاسی کتاب ہے۔ مصنفین نے اپنی تحقیق کے نتائج کے علاوہ دوسرے محققوں کی علمی کاوشوں سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ ایک اہم تجزیاتی کتاب ثابت ہوگی۔

ہم نے متن میں اسرائیلی عبرانی اخبارات میں شائع ہونے والے سنجیدہ مضامین سے متعدد حوالے دیئے ہیں۔ اسرائیلیوں کی اکثریت نے گزشتہ دس پندرہ برسوں کے دوران ان مضامین کے ذریعے یہودی بنیاد پرستی اور اس کے ردعمل سے کچھ واقفیت حاصل کی ہے۔ ان میں سے بعض مضامین کو ممتاز سکالروں نے یہودی بنیاد پرستی کا عمیق مطالعہ کر کے لکھا تھا۔

ہم نے تالمودی ادب سے بھی حوالے دیئے ہیں۔ ایسے متن آج بھی اسرائیلی سیاست میں اکثر استعمال کیے جاتے ہیں۔ نیز اسرائیلی عبرانی اخبارات میں بھی اکثر ان کے حوالے دئے جاتے ہیں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ تالمودی ادب کے بیشتر انتہائی حساس اجزا انگریزی میں عمومی طور پر دھیمے لہجے میں یا غلط ترجمہ ہو جاتے ہیں، اسی لیے ہم نے تالمودی ادب کے ان تمام اجزا کا ترجمہ خود کیا ہے، جن کا اس کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے۔ تاہم بائبل کے اقتباسات معیاری تراجم سے ہی دئے گئے ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر بائبل کی عبارتوں کے زیادہ جدید انگریزی تراجم درج کیے گئے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہے کہ ہم نے اکثر طویل اقتباسات درج کیے ہیں۔ ہم نے ایسا کرنے کا فیصلہ اس وجہ سے کیا تھا کہ ہم اپنے نکات کو مناسب حد تک واضح کرنا چاہتے تھے۔ ہم یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ یہ اقتباسات مکمل طور پر پڑھے جانے کے حقدار ہیں اور انہیں پورا ہی پڑھا جانا چاہیے۔ ہم نے روایتی عالمانہ انداز میں ہر اقتباس کے حوالے سے الگ الگ حاشیہ لکھنے کی بجائے متن میں ہی ہر اقتباس کا ماخذ درج کرنے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ بعض اوقات یہ عمل قدرے غیر ضروری محسوس ہوگا تاہم اس سے روانی کے ساتھ تفہیم میں آسانی ضرور پیدا ہوگئی ہے۔

اگرچہ ہماری کتاب کا موضوع یہودی بنیاد پرستی میں ہونے والی حالیہ پیش رفتیں ہیں، تاہم اس کی جڑیں یہودی تاریخ میں ہیں۔ موضوع کا سیاق وسباق واضح کرنے کے لیے ضروری تھا کہ یہودی تاریخ کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا جائے، جو خصوصاً ایسے قارئین کے لیے زیادہ مفید رہے گا جنہیں یہودی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ ہر مذہب کے بنیاد پرست معاشرے کو "پرانے اچھے زمانے" والی حالت میں لانا چاہتے ہیں، کہ جب ان کے بیان کے مطابق عقیدہ خالص تھا اور ہر کوئی اس پر عمل کرتا تھا۔ بنیاد پرستوں کا ایقان ہے کہ جدیدیت سے جڑی ہوئیں تمام برائیاں "پرانے اچھے زمانے" میں موجود نہیں تھیں۔ یہودی بنیاد پرستی کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی دور کا تعین کیا جائے، جس کو واپس لانا بنیاد پرستوں کا ایمان ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں یہودی تاریخ کے مختلف ادوار کا تعین کرنا ضروری ہے۔

یہودی تاریخ کو عموماً چار بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور بائبلی (Biblical) ہے، جس کے دوران بیشتر یہودی بائبل (جسے عیسائی روایت میں عہد نامۂ قدیم کہا جاتا ہے) لکھی گئی تھی۔ اگرچہ اس دور کے آغاز کا وقت یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، تاہم یہ دور پانچویں صدی قبل از مسیح تک برقرار رہا۔ یہودیت (Judaism)، کم از کم اپنے بڑے خواص کے ساتھ، اس دور میں وجود نہیں رکھتی تھی۔ یہودی بائبل میں عبرانی لفظ "یہوڈم" (Yehudim ــــ مابعد بائبلی عبرانی میں Jews) اور اس کے متعلقات صرف جوڈیا (Judea) کی چھوٹی سی مملکت کے باسیوں کے لیے نیز اسرائیلی یا بنی اسرائیل یا کبھی کبھی عبرانی (Hebrews) کہلانے والے لوگوں سے انہیں ممتاز کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ بائبل بہرکیف ایسی کتاب نہیں ہے جو آرتھوڈوکس یہودیوں کے اعمال اور عقائد کا تعین کرتی ہو۔*1 بیشتر بنیاد پرست آرتھوڈوکس یہودیوں کو بائبل کے بڑے اجزا کا علم نہیں ہے اور انہیں صرف کچھ اجزا کا علم تشریحوں کے ذریعے ہے، جن میں مفہوم کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں بائبلی دور تنازعوں کی آماجگاہ ہے۔ اسرائیلیوں کی اکثریت، بشمول جوڈیا کے باشندوں کے، اس دور کے زیادہ تر حصے میں بت پرستی کرتی تھی۔ اسرائیلیوں کی صرف ایک معمولی سی اقلیت ہی ان رجحانات پر کاربند تھی جن سے آگے چل کر یہودیت (Judaism) ابھری۔ مختصر یہ کہ یہودیت جیسا کہ اسے جانا جاتا ہے، بائبلی دور کے دوران وجود نہیں رکھتی تھی۔

یہودی تاریخ کا دور عموماً "دورِ معبدِ ثانی" (Second Temple Period) کہلاتا ہے۔ اس دور کا آغاز پانچویں صدی قبل از مسیح میں ہوا تھا اور اس کا اختتام 70ء میں رومنوں کے ہاتھوں معبدِ ثانی (Second Temple) کی تباہی پر ہوا۔ یہ یہودیت کا تشکیلی دور تھا۔

یہودیت کے ممتاز مذہب پر عمل کرنے والے لوگوں کے لیے "یہودی" کی اصطلاح اور یہودیوں کے وطن کے لیے جوڈیا کا نام اسی دور میں ظاہر ہوئے تھے۔ اس دور کے اختتام کے قریب، کہ جب یہودیوں نے

بیشتر فلسطین کو فتح کر لیا تھا، رومنوں نے فلسطین کے لیے "جوڈیا" کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی تھی۔*2 اس دور میں دو نہایت اہم یہودی خصوصیات رونما ہوئیں یعنی یہودیوں کا خاص ہونا اور اس کے نتیجے میں تمام دوسری اقوام سے ان کا الگ تھلگ ہونا۔ اس دور میں پہلی مرتبہ دوسری اقوام کے لوگوں کے لیے اجتماعی نام جینٹائل (Gentile) استعمال کیا گیا۔*3 دوسری نئی خصوصیت کی اساس یہ مفروضہ تھا کہ یہودیوں کو بائبلی قانون پر لازماً عمل کرنا چاہیے۔ تاہم اس دور کے بیشتر حصے میں اس قانون کی اختلافی تعبیروں پر جھگڑے کھڑے ہوئے۔ بعض اوقات یہ جھگڑے خانہ جنگی میں بدل گئے۔ فاریسیوں (Pharisees) اور صدوقیوں (Saducees) کے درمیان طویل عرصے تک جاری رہنے والا جھگڑا اس کی ایک مثال ہے۔ اس دور کے شروع ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ہی سکندر اعظم نے فلسطین کو فتح کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہیلن ازم (Hellenism) سے متاثر ریاستوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ حتیٰ کہ مختصر عرصے تک برقرار رہنے والی ہاسمونی (Hasmonean) خاندان کی یہودی ریاست بھی جوہری اعتبار سے ایک طرح کی ہیلنی (Hellenistic) ریاست تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی معاشرہ اور عبرانی زبان، اپنے یہودی خواص برقرار رکھتے ہوئے، ہیلن ازم کے اثرات کے تحت تبدیل ہو گئے۔ بحیرۂ روم کے آس پاس واقع ملکوں میں آباد یہودیوں پر تو ہیلن ازم کا اثر زیادہ گہرا تھا۔ ان ملکوں میں رہنے والے یہودی اکثر یونانی زبان بولتے اور اسی زبان میں عبادت کرتے تھے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس دور میں یونانی زبان میں تخلیق ہونے والا یہودی ادب یہودیوں سے ضائع ہو گیا، اس کا صرف وہی حصہ بچ پایا جسے عیسائی گرجا گھروں نے محفوظ کر لیا تھا۔

بیشتر مؤرخ تیسرے دور کے آغاز کا زمانہ 70ء میں معبدِ ثانی کی تباہی کو قرار دیتے ہیں۔ دیگر مؤرخ تیسرے دور کے آغاز کا تعین 135ء سے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، کہ جب رومن سلطنت کے خلاف آخری بڑی یہودی بغاوت کا خاتمہ ہوا تھا۔ تیسرا دور مختلف ملکوں میں مختلف زمانوں میں جدیدیت اور قومی ریاستوں (Nation) States کے ظہور کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ جدیدیت کی شروعات اس وقت ہوئی جب یہودیوں کو بھی غیر یہودیوں کی طرح شہری حقوق دئے گئے اور جب نتیجتاً ان کی خودمختاری کا خاتمہ ہوا، جس کی وجہ سے وہ ربیوں کے مطیع تھے۔ مثال کے طور پر امریکہ اور فرانس میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایسا ہوا۔ روس میں 1917ء تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ یا یمن میں 1950ء کی دہائی تک۔ رومنوں کے خلاف یہودی بغاوتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسطین سے یہودی آبادی مستقل طور پر ختم ہو گئی اور یوں وطن سے باہر آباد یہودیوں (Jewish Diaspora) کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ یہ تبدیلی پانچویں صدی بعد از مسیح میں پوری طرح رونما ہوئی۔ مزید برآں بغاوتوں کی ناکامی سے یہودیوں کی یہ امید دم توڑ گئی کہ معبد کو دوبارہ تعمیر کیا جائے گا اور وہاں جانور قربان کیے جائیں گے اور یہ معبد، جو کہ یہودی مذہب کا قلب ہے، مسیح کی آمد سے پہلے بحال ہو جائے گا۔ مسلسل شکستوں کے نتیجے میں

یہودیوں نے روم اور دوسری ریاستوں کے حکام کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرلی جس کے بعد انہیں ربیوں کی اطاعت میں محدود خود مختاری حاصل ہوگئی۔ یوں چوتھی صدی عیسوی کی رومن سلطنت میں، ایک بہت پہلے تخلیق کیے گئے نظام میں تمام یہودی مذہبی پیشواؤں کے تابع فرمان ہوگئے، جو مذہبی خطاؤں پر انہیں کوڑے مارنے یا جرمانے ادا کرنے کی سزا دینے اور ٹیکس عائد کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ ایسے مذہبی پیشواؤں کو عبرانی میں "ناسی" یعنی صدر کہا جاتا تھا۔ وہ اعلیٰ ترین یہودی عدالت سانہیڈرین کا اعلیٰ ترین عہدہ دار ہوتا تھا اور فلسطین میں عدالت کے ارکان اور دیگر مذہبی اہل کاروں کا تقرر کرتا تھا۔ ناسی، جس کا عہدہ موروثی ہوتا تھا، رومن ریاستی حکام کے نظام مراتب میں اعلیٰ رتبے کا حامل ہوتا تھا۔ عراق میں بھی ایسی ہی ترتیب موجود تھی، جہاں اعلیٰ ترین حاکم کو وطن سے باہر موجود یہودیوں کا سربراہ کہا جاتا تھا۔ ناسی اور وطن سے باہر موجود یہودیوں کے سربراہ کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت داؤد (King David) کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ 429ء کے تھوڑے عرصے بعد ناسی کا عہدہ ختم ہوگیا، جبکہ وطن سے باہر موجود یہودیوں کے سربراہ کا منصب 1100ء تک برقرار رہا۔ دونوں مناصب یہودی خود مختاری کے نمونوں کا فریم ورک مہیا کرتے تھے۔ اسی خود مختاری نے، جو کہ جدید دور تک موجود رہی تھی، بنیاد پرستی کے ابھار میں کردار ادا کیا تھا۔ پوری یہودی تاریخ کے طویل ترین دور یعنی تیسرے دور میں نہ صرف عبرانی زبان میں بہت زیادہ ادب تخلیق ہوا بلکہ آرامی، یونانی، عربی، یدش اور دوسری زبانوں میں بھی۔ اس ادب کا بڑا موضوع مذہب تھا، مذہبی اعمال وعقائد کی جزئیات پر خصوصی توجہ دی گئی۔ بعض مقامات پر کچھ ادوار میں شاعری اور ارسطو کے انداز کا فلسفہ وسائنس بھی رونما ہوئے تاہم نہ تو ان کی نوعیت ہمہ گیر تھی نہ اس میں تسلسل تھا۔ بے وطن یہودیوں کے بہت سے علاقوں خاص طور پر وسطی یورپ میں 1750ء تک صرف اور صرف مذہبی ادب تخلیق ہوا۔ یہودی بنیاد پرستی کے تناظر سے تیسرے دور میں سب سے اہم واقعہ یہودی تصوف کا ارتقا تھا، جس کو عموماً کبالا کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہودی تصوف نے یہودی اعمال میں کسی تبدیلی کے بغیر یہودی عقائد کی کایا پلٹ دی۔ 1550ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے میں مغربی یورپ کے یہودیوں کی اکثریت نے کبالا اور اس کے مجموعۂ عقائد کو قبول کرلیا۔ یہ یہودی تاریخ کے تیسرے دور کا اختتام تھا، جس کے فوری بعد جدید قومی ریاستیں ابھریں اور جدید اثرات کی شروعات ہوئی۔ تصوف آج بھی یہودی بنیاد پرستی کا ایک جاندار حصہ ہے، خصوصاً مسیحانہ قسم کی بنیاد پرستی میں اہمیت کا حامل ہے، جیسا کہ ہماری کتاب میں دکھایا گیا ہے یہودی بنیاد پرستی کی مسیحانہ شاخ کی آئیڈیالوجی کی اساس کبالا ہے۔ وقتاً فوقتاً بائبل کے حوالے دینے کے باوجود یہودی بنیاد پرست عمومی طور پر تیسرے دور کے آخری حصے کو وہ سنہرا دور قرار دیتے ہیں، جسے وہ واپس لانا چاہتے ہیں۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ اس مذہبی ادب کے وسیع پھیلاؤ نے یہودی بنیاد پرستی کو جنم دینے کے علاوہ، مشترک مذہب اور عبرانی زبان کی اساس پر یہودی وحدت کا مضبوط احساس پیدا کیا (تقریباً تمام تعلیم یافتہ یہودی، خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتے ہوں، عبرانی زبان

سمجھتے ہیں اور اسے اپنی مذہبی زبان مانتے ہیں۔)

یہودی تاریخ کا چوتھا اور جدید دور وہ ہے جس میں ہم جی رہے ہیں۔ اس دور کا آغاز مختلف ملکوں میں مختلف اوقات میں ہوا، بہت سے اسرائیلی یہودی تو ماقبلِ جدید دور سے براہِ راست جدید دور میں آ گئے تھے۔ جیسا کہ ہماری کتاب کے تیسرے باب میں بحث کی گئی ہے، یہ مظہر مشرقی یہودیوں کے لیے خصوصاً اہم رہا ہے۔ ہماری کتاب اس امر پر زور دیتی ہے کہ یہودی بنیاد پرستی یہودیوں پر جدیدیت کے اثرات کے خلاف ردِ عمل کے طور پر ابھری تھی۔ اسرائیلی یہودیوں پر یہودی بنیاد پرستی کے اثرات کی تفہیم صرف یہودی تاریخ کے تناظر میں ممکن ہے۔

اسرائیل شحاک / نارٹن میزونسکی

پہلا باب

یہودی معاشرے میں یہودی بنیاد پرستی

تقریباً ہر اعتدال پسند اسرائیلی یہودی (Israeli Jew) اسرائیلی یہودی معاشرے (Israeli Jewish Society) کے حوالے سے ان حقائق سے آگاہ ہے، جنہیں اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، تاہم اسرائیل کے باہر رہنے والے یہودی اور غیر یہودی، جو کہ عبرانی نہیں جانتے ہیں، ان حقائق سے غیر واقف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسرائیلی یہودیوں کی عبرانی میں اپنے بارے میں لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ نہیں سکتے۔ امریکہ اور ہر جگہ کے ذرائع ابلاغ میں اسرائیل کی زبردست کوریج تو کی جاتی ہے لیکن ان حقائق کو کبھی کبھار ہی بیان کیا جاتا ہے یا غلط بیان کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد عبرانی نہ پڑھنے والے اشخاص کو اسرائیلی یہودی معاشرے کی زیادہ فہم عطا کرنا ہے۔

یہ کتاب مشرقِ وسطیٰ کی ایک طاقتور اور امریکہ پر زبردست اثر رکھنے والی ریاست یعنی اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کی سیاسی اہمیت کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہودی بنیاد پرستی کی مختصر تعریف یہ ہے کہ یہ یہودی آرتھوڈوکسی، جس کی اساس بابلی تالمود اور تالمودی و ہلاکائی ادب ہے، کے آج بھی قابلِ عمل ہونے نیز ابد تک قابلِ عمل رہنے کا عقیدہ ہے۔ یہودی بنیاد پرستوں کا ایقان ہے کہ بائبل بذاتِ خود مستند نہیں ہے تاوقتیکہ تالمودی ادب کے ذریعے اس کی درست تعبیر نہ کی جائے۔ یہودی بنیاد پرستی نہ صرف اسرائیل میں وجود رکھتی ہے بلکہ یہ ہر اس ملک میں موجود ہے جہاں یہودی کافی تعداد میں آباد ہیں۔ جن ملکوں میں یہودی بہت کم تعداد میں ہیں، وہاں یہودی بنیاد پرستی کی عمومی اہمیت اس حد تک ہے کہ اسرائیل میں موجود بنیاد پرستوں کے لیے فنڈ اکٹھے کیے جائیں اور ان کے لیے سیاسی تائید وحمایت پیدا کی جائے۔ اسرائیل میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیاد پرست مختلف طریقوں سے ریاست پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کی نوعیت صدمہ انگیز ہے۔ مثال کے طور پر بہت سے بنیاد پرست یروشلم میں ٹیمپل ماؤنٹ پر معبد دوبارہ تعمیر

کرنا چاہتے ہیں یا ان کی کم از کم خواہش یہ ہے کہ اس مقام پر، جو کہ اب ایک مسلم عبادت گاہ ہے، لوگوں کی آمد و رفت روک دی جائے۔ امریکہ کے بیشتر عیسائی کسی ایسے موقف کی حمایت نہیں کریں گے لیکن اسرائیل میں ایک قابلِ لحاظ تعداد میں یہودی، جو کہ بنیاد پرست نہیں ہیں، اس اور اس جیسے دوسرے مطالبوں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہودی بنیاد پرستی کی کچھ صورتیں واضح طور پر دیگر صورتوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہودی بنیاد پرستی نہ صرف روایتی اسرائیلی ریاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے بلکہ یہ اسرائیلی نیوکلیئر پالیسیوں پر بھی ٹھوس اثر ڈال سکتی ہے۔ بہت سے لوگ دوسرے ملکوں میں بنیاد پرستی کے جن امکانی نتائج سے خوفزدہ ہیں، وہی نتائج اسرائیل میں بھی رونما ہو سکتے ہیں۔

اسرائیل میں بنیاد پرستی کی اہمیت کو صرف اور صرف اسرائیلی یہودی معاشرے کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے نیز معاشرے کی داخلی تقسیموں میں یہودیت کے کردار کے ایک جزو کی حیثیت سے۔ ہم اس وسیع موضوع پر غور کرتے ہوئے سنجیدہ مبصروں کی طرف سے اسرائیلی یہودی معاشرے کی سیاسی اور مذہبی اعتبار سے کی گئی تقسیم پر توجہ مرکوز کریں گے۔ اس کے بعد ہم اس امر پر وضاحت سے لکھیں گے کہ یہودی بنیاد پرستی دیگر یہودیوں پر اس قدر اثر انداز کیوں ہے کہ یہودی بنیاد پرست اسرائیلی آبادی میں اپنے تناسب سے کہیں زیادہ سیاسی قوت حاصل کر چکے ہیں۔ اسرائیلی یہودی معاشرے کی دو رخی تقسیم کی اساس یہ مسلمہ صداقت ہے کہ ایک گروپ کی حیثیت میں اسرائیلی یہودی انتہائی نظریاتی ہیں۔ اس کی نمایاں شہادت ووٹنگ میں ان کی بلند شرح ہے، جو کہ 80 فیصد سے اوپر چلی جاتی ہے۔ مئی 1996ء کے انتخابات میں 95 فیصد بہتر تعلیم یافتہ، زیادہ امیر، سیکولر یہودیوں اور ہر درجے کے تعلیم یافتہ اور آمدنی والے مذہبی یہودیوں نے ووٹ دیئے تھے۔ بڑی تعداد میں اسرائیل سے باہر رہنے والے (چار لاکھ سے زیادہ) یہودیوں کو نکال کر، کہ جن میں سے بیشتر نے ووٹ نہیں دیا تھا۔ غور کیا جائے تو یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی آبادی کے ان دونوں انتہائی اہم حصوں کے تقریباً تمام اہل ووٹروں نے ووٹ ڈالے تھے۔ بیشتر اسرائیلی سیاسی مبصر اسرائیلی یہودیوں کو دو حصوں میں بانٹتے ہیں: اسرائیل اے اور اسرائیل بی۔ اسرائیل اے، جسے اکثر "بائیں بازو" سے موسوم کیا جاتا ہے، کی سیاسی نمائندگی لیبر اور میریٹز پارٹیاں کرتی ہیں۔ اسرائیل بی، جسے اکثر "دائیں بازو" یا "دائیں بازو والی اور مذہبی پارٹیوں" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تمام دوسری یہودی پارٹیوں پر مشتمل ہے۔ تقریباً تمام اسرائیل اے اور اسرائیل بی کی اکثریت (کچھ بنیاد پرست یہودیوں کے استثنا کے ساتھ) صیہونی آئیڈیالوجی پر پختگی سے کاربند ہے۔ صیہونی آئیڈیالوجی یہ ہے کہ تمام یہودیوں یا کم از کم ان کی اکثریت کو فلسطین میں واپس آ جانا چاہیے، جو کہ ارضِ اسرائیل کی حیثیت سے تمام یہودیوں سے تعلق رکھتا ہے اور جسے ایک یہودی ریاست ہونا چاہیے تاہم اسرائیلی معاشرے کے ان دو حصوں میں دشمنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس دشمنی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ہمارے تجزیے سے متعلقہ وجہ یہ ہے کہ اسرائیل بی، اپنے سیکولر ارکان سمیت، یہودی بنیاد پرستی کا ہمدرد ہے جبکہ اسرائیل اے یہودی بنیاد پرستی

سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ یہ بات لمبے عرصے پر محیط انتخابات کے نتائج کے تجزیے سے عیاں ہے کہ اسرائیل بی کو عددی اعتبار سے اسرائیل اے پر مستقل برتری حاصل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی بنیاد پرستی سے متاثر یہودیوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

عبرانی یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات کے ایک فیکلٹی ممبر پروفیسر باروک کمرلنگ نے ''اسرائیل میں مذہب، قوم پرستی اور جمہوریت'' کے عنوان سے ایک مضمون میں اسرائیلی یہودی معاشرے کی مذہبی تقسیم کے حوالے سے اعداد و شمار مہیا کیے ہیں۔ یہ مضمون جریدے زمانیم (نمبر 51-50) کے خزاں 1994ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ کمرلنگ نے بے شمار تحقیقی حوالہ جات کی مدد سے دکھایا تھا کہ اسرائیلی یہودی معاشرہ مذہبی معاملات پر اس سے کہیں زیادہ منقسم ہے، جتنا کہ اسرائیل سے باہر تصور کیا جاتا ہے۔ یروشلم میں واقع عبرانی یونیورسٹی کے مؤقر گٹمین انسٹی ٹیوٹ کے کیے ہوئے سروے سے اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہوئے کمرلنگ نے بتایا ہے کہ 19 فی صد اسرائیلی یہودیوں نے کہا کہ وہ روزانہ عبادت کرتے ہیں اور 19 فیصد ہی نے اقرار کیا کہ وہ کسی بھی حال میں سیناگوگ نہیں جاتے۔ [1]: گٹمین انسٹی ٹیوٹ کے تجزیے اور ایسے ہی دیگر مطالعات سے متاثر ہو کر کمرلنگ اور دوسرے سکالروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسرائیل اے اور اسرائیل بی دونوں ہی ایسے کٹر افراد پر مشتمل ہیں، جن کے یہودی مذہب کے حوالے سے تصورات بالکل متضاد ہیں۔ یہ خیال تقریباً یقینی طور پر درست ہے۔

زیادہ عمومی انداز میں اسرائیلی یہودی معاشرے میں مذہب کی طرف رجحان کو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ مذہبی (Religious) یہودی آرتھوڈوکس ربیوں کی تشریحوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہودی مذہب کے احکامات پر عمل کرتے ہیں، ان میں سے بہت سے یہودی تحدیدے سے زیادہ عمل پر زور دیتے ہیں۔ (اسرائیل میں اصلاح پسند اور / یا قدامت پسند یہودی تھوڑے ہیں)۔ روایت پسند یہودی کچھ زیادہ اہم احکامات پر تو عمل کرتے ہیں لیکن زیادہ سخت احکامات سے روگردانی کرتے ہیں تاہم وہ ربیوں اور مذہب کا احترام ضرور کرتے ہیں۔ جہاں تک سیکولر یہودیوں کا تعلق ہے تو ممکن ہے وہ کبھی کبھی سیناگوگ چلے جاتے ہوں تاہم وہ ربیوں کا احترام کرتے ہیں نہ مذہبی اداروں کا۔ اگرچہ روایتی اور سیکولر یہودیوں کے درمیان کھنچی ہوئی لکیر اکثر غیر حقیقی ہوتی ہے، تاہم دستیاب مطالعات سے پتا چلتا ہے کہ 25 سے 30 فیصد تک اسرائیلی یہودی سیکولر ہیں، 50 سے 55 فیصد تک روایتی ہیں اور تقریباً 20 فیصد مذہبی ہیں۔ روایتی یہودی واضح طور پر اسرائیل اے اور اسرائیل بی دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسرائیلی مذہبی یہودی دو مختلف گروپوں میں منقسم ہیں۔ مذہبی حوالے سے زیادہ انتہا پسند یہودی ہیریڈم کہلاتے ہیں (اس کا واحد ہیریڈی یا ہیریڈ ہے۔) مذہبی حوالے سے زیادہ اعتدال پسند یہودیوں کو مذہبی قومی (Religious- National) یہودی کہا جاتا ہے۔ مذہبی قومی یہودیوں کو بعض اوقات ''ہاتھ کی بنی ہوئی ٹوپیاں'' بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ سر پر ہمیشہ ٹوپی رکھتے ہیں۔ ہیریڈم عمومی طور پر ہیٹ پہنتے ہیں یا سیاہ ٹوپی، جو

کہ کبھی ہاتھ کی بنی ہوئی نہیں ہوتی ہے۔ مذہبی قومی یہودی زیادہ تر اسرائیلی فیشن کے مطابق لباس پہنتے ہیں جبکہ ہیریڈم تقریباً ہمیشہ سیاہ رنگ کا لباس پہنتے ہیں۔

ہیریڈم مزید دو پارٹیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک پارٹی یہادوت ہاتورہ (قانون کی یہودیت Judaism of The Law) ہے، جو کہ مشرقی یورپ سے آئے ہوئے اشکینازی ہیریڈم کی پارٹی ہے۔ دراصل یہادوت ہاتورہ دو دھڑوں کا ایک اتحاد ہے۔ ہیریڈم کی دوسری پارٹی شاس ہے، جو کہ مشرقِ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے مشرقی (اورینٹل) ہیریڈم کی پارٹی ہے۔ (ان دونوں قسموں کے ہیریڈم کے باہمی فرق تیسرے باب میں خصوصی طور پر زیرِ بحث آئیں گے) مذہبی قومی یہودیوں کی پارٹی کا نام قومی مذہبی پارٹی (National Religious Party- NRP) ہے۔ 1996ء کے انتخاب میں ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد کا تجزیہ کر کے ہم اسرائیل کی آبادی میں مذہبی یہودیوں کے ان دو گروپوں کی فیصد نکال سکتے ہیں۔ 1996ء کے انتخاب میں ہیریڈی پارٹیوں نے کنیسٹ کی کل 120 سیٹوں میں سے 14 پر کامیابی حاصل کی تھی۔ شاس نے دس اور یہادوت ہاتورہ نے چار سیٹیں جیتی تھیں۔ این آر پی نے نو سیٹیں جیتی تھیں۔ بعض اسرائیلی یہودیوں نے شاس کو اعلانیہ ووٹ دیئے تھے کیونکہ اس پارٹی نے ایسے طلسم اور تعویذ تقسیم کیے تھے جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ صرف "درست" ووٹ ڈالنے پر کارآمد ہوں گے۔ این آر پی کے کچھ ارکان اور ہمدردوں نے بھی اعلانیہ طور پر دائیں بازو کی سیکولر پارٹیوں کو ووٹ دیئے تھے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی آبادی میں ہیریڈم کی تعداد کا تناسب 11 فیصد جبکہ اسرائیلی یہودیوں کی کل تعداد کا 13.4 فیصد ہے۔ این آر پی کے اراکین اور حامیوں کی تعداد کا تناسب اسرائیلی آبادی میں 9 فیصد اور اسرائیلی یہودیوں میں 11 فیصد ہے۔

ضروری ہے کہ مذہبی یہودیوں کے دونوں گروپوں کے بنیادی عقائد کے حوالے سے تعارفی وضاحت کر دی جائے۔ "ہیریڈ" عبرانی زبان کا ایک عام لفظ ہے جس کا مطلب ہوتا ہے "ڈرنے والا"۔ ابتدائی یہودی تاریخ میں اس سے مراد ہوتی تھی "خدا سے ڈرنے والا" یا غیر معمولی حد تک راسخ العقیدہ یہودی۔ انیسویں صدی کے وسط میں، پہلے جرمنی اور ہنگری میں، پھر بعد ازاں اسرائیل کے باہر دوسرے علاقوں میں جدید ایجادات و اختراعات کی مخالفت کرنے والے مذہبی یہودیوں کی پارٹی کا یہ نام رکھ دیا گیا۔ اشکینازی ہیریڈم ایک ایسے گروپ کی صورت میں رونما ہوئے تھے، جو کہ عمومی طور پر یہودی روشن خیالی اور خصوصی طور پر ربیوں کی اتھارٹی کو مکمل طور پر رد کرنے والے نیز یہودی عبادات اور طرزِ زندگی میں ایجادات و اختراعات متعارف کروانے والے یہودیوں کے ردِ عمل میں وجود پذیر ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ تقریباً تمام یہودیوں نے ایجادات و اختراعات کو قبول کر لیا ہے ہیریڈم نے زیادہ انتہا پسندانہ ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے تمام ایجادات و اختراعات کو ممنوع قرار دے دیا۔ ہیریڈم ہلاکا پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونے پر اصرار کرتے تھے۔ ایجاد و اختراع کی مخالفت کی ایک مثال ہم پہلے درج کر آئے ہیں یعنی ہیریڈم کا سیاہ لباس۔ سیاہ لباس اس زمانے میں مشرقی یورپی یہودیوں

میں مروج تھا، جب ہیریڈم ایک پارٹی کی صورت میں منظم ہوئے تھے۔ اس زمانے سے پہلے یہودی مختلف طرز کے لباس پہنتے تھے اور لباس کے حوالے سے اکثر و بیشتر اپنے عیسائی ہمسایوں سے مختلف نہیں ہوتے تھے۔ کچھ عرصے بعد ہیریڈم کے علاوہ باقی سب یہودی مختلف طرزوں کے لباس پہننے لگے، جب کہ ہیریڈم سیاہ لباس پر ہی اٹک گئے۔ ہلاکا بھی یہودیوں کو سیاہ لباس پہننے کا پابند نہیں بناتا، نہ ہی اس میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ شدید گرمیوں اور ہر موسم میں سیاہ رنگ کے موٹے کوٹ اور بھاری سموری ٹوپیاں پہنیں۔ تاہم ایجاد و اختراع کی مخالفت میں اسرائیل کے ہیریڈم ایسا ہی کر رہے ہیں۔ وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ لباس ویسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ 1850ء کے لگ بھگ یورپ میں ہوتا تھا۔ ایسا کہتے ہوئے آب و ہوا سمیت دیگر تمام رکاوٹوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ہیریڈم کے برعکس این آر پی کے مذہبی قوم پرست یہودیوں نے 1920ء کی دہائی کے شروع ہی میں جدیدیت (Modernity) کے ساتھ سمجھوتے کر لیے تھے۔ اس زمانے میں فلسطین میں پہلی مرتبہ مذہبی یہودیت میں دو بڑے گروپ وجود میں آئے تھے۔ اس کا مشاہدہ ان کے لباس سے کیا جاسکتا ہے، جو کہ ٹوپی کے استثنا کے ساتھ، روایت پسندانہ ہوتا ہے۔ زیادہ اہم انداز میں یہ ہلاکا پر ان کے ادھورے عمل سے ظاہر ہے، مثال کے طور پر عورتوں کے حوالے سے کئی احکامات کے استرداد سے۔ این آر پی کے رکن عورتوں کو اپنی کئی تنظیموں اور خود اس سیاسی پارٹی میں مقتدر حیثیتوں میں قبول کرنے سے ہچکچاتے نہیں ہیں۔ 1992ء اور 1996ء کے انتخابات میں ووٹنگ سے پہلے این آر پی نے ایسا اشتہار شائع کیا تھا جس میں بہت سی عوامی شخصیات کے علاوہ پارٹی کی حمایت کرنے والی بہت سی عورتوں کی تصویریں بھی شائع کی گئی تھیں۔ ٹیلیویژن پر اس اشتہار کے دکھائے جانے کی وجہ سے عورتوں میں این آر پی کی حمایت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہیریڈم نے ایسا نہیں کیا، نہ ہی وہ کریں گے۔ حد تو یہ ہے کہ ٹیلیویژن دیکھنا ممنوع قرار دینے والے ہیریڈم نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ ٹیلیویژن سے کچھ انتخابی پروگرام نشر کروائیں گے، تاہم ان کا اصرار تھا کہ تمام شرکاء مرد ہونے چاہئیں۔ 1992ء کی انتخابی مہم کے دوران ایک ہیریڈی ہفت روزے کے مدیر نے ربیوں سے مشورہ لیا تھا کہ وہ این آر پی کے محولہ بالا اشتہار کو چھاپیں کہ نہیں۔ ربیوں نے اسے حکم دیا کہ اشتہار تو چھاپا جائے لیکن عورتوں کی تصویروں پر سیاہی پھیر دی جائے۔ مدیروں نے ان احکامات پر عمل کیا۔ این آر پی نے اس پر مشتعل ہو کر اسرائیلی سیکولر عدالتوں میں اخبار پر ہرجانے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ہیریڈی ربیوں نے یہودیوں کے باہمی تنازعات کو سیکولر عدالتوں میں لے جانے پر پابندی لگا رکھی ہے، مذکورہ اقدام کر کے این آر پی نے اس پابندی کو بھی توڑ دیا تھا۔

مذہبی قوم پرستوں کا عورتوں کے حوالے سے جدیدیت کے ساتھ سمجھوتہ انتہائی پیچیدہ ہے۔ ہلاکا میں یہودی مردوں پر پابندی لگائی گئی ہے کہ وہ عورتوں کا کسی قسم کا گانا نہیں سن سکتے، خواہ وہ مل کر گا رہی ہوں یا کوئی ایک عورت گا رہی ہو۔ ہلاکا میں واضح طور پر لکھا ہے کہ عورت کی آواز سننا حرام کاری ہے۔ بعد ازاں اس کی تعبیر یہ

کی گئی کہ یہاں ''آواز'' سے مراد گانا ہے بولنا نہیں۔ بنیادی طور پر یہ قانون تالمود میں آیا ہے، تاہم باقی تمام ضابطہ ہائے قانون میں بھی موجود ہے۔ جو یہودی مرد کسی عورت کو گاتے ہوئے سنتا ہے، وہ ایسے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، جو حرام کاری یا زنا کے مساوی ہے۔ تاہم این آر پی کے باعقیدہ اراکین کی اکثریت عورتوں کا گانا سنتی ہے اور یوں ''زنا'' کا ارتکاب عموماً کرتی ہے۔ این آر پی کے کچھ کٹڑ اراکین، خصوصاً مغربی کنارے کے علاقے میں آباد مذہبی آباد کار، نہ صرف اس مسئلے پر الجھن کا شکار ہوئے بلکہ انہوں نے اس مسئلے کو تخلیقی تدابیر کے ذریعے حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ 1990ء کی دہائی میں کچھ آباد کاروں نے ایک نیا ریڈیو سٹیشن ارتز 7 یا چینل 7 قائم کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اسرائیلی یہودیوں کی اکثریت کو متوجہ کرنے کے لیے مقبول گلوکاروں کے نغمے نشر کرنے ہوں گے، جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ ربیوں نے اس امر کو ہلاکا کے ایک حکم کی خلاف ورزی قرار دیا کہ مرد سامعین عورت گلوکاروں کے گانے سنیں اور یوں ''زنا'' کا ارتکاب کریں۔ ربیوں سے مزید مشاورت کے بعد آباد کاروں نے ایک قابلِ قبول حل نکالا، جو کہ آج بھی عمل میں ہے۔ عورتوں کے مقبول نغموں کو مرد گاتے ہیں، پھر الیکٹرانک آلات کے ذریعے ان کی آوازوں کو زنانہ طول موج پر لایا جاتا ہے اور اس کے بعد ارتز 7 سے نشر کیا جاتا ہے۔ اس اقدام سے روایت پسند یہودیوں کی کافی تعداد مطمئن ہے جبکہ این آر پی کے قابلِ احترام ربیوں کا کہنا ہے کہ مردوں کے گائے ہوئے گانے سننے سے زنا کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ ہیریڈم نے اس کی مذمت کی اور ارتز 7 کو نہیں سنتے۔ 1988ء کے انتخاب میں اپنی سیاسی طاقت کافی بڑھانے کے بعد ہیریڈم اس قابل ہو گئے تھے کہ نئی کنیسٹ کے افتتاحی اجلاس میں پوری ریاست پر اپنے موقف کو زبردستی تھوپ سکیں۔ اس سے پہلے افتتاحی اجلاس کے شروع میں ''ہاتکوا'' یعنی اسرائیل کا قومی ترانہ گایا جاتا تھا۔ جس کے گانے والوں میں عورتیں مرد دونوں اصناف کے گلوکار شامل ہوتے تھے۔ 1988ء کے انتخاب کے بعد ہیریڈی حساسیت کا لحاظ رکھتے ہوئے ملے جلے طائفے کی جگہ ایک مرد نے ترانہ گایا تھا۔ 1992ء کا انتخاب لیبر نے جیتا، جس کے بعد فوجی ربیوں پر مشتمل مردوں کے ایک طائفے نے قومی ترانہ گایا۔

یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسرائیلی یہودی آبادی میں صرف ایک معمولی سی تعداد میں موجود ہیریڈم، کبھی تنہا اور کبھی این آر پی کے ساتھ مل کر، باقی سارے معاشرے پر اپنی رائے تھوپ دیتے ہیں؟ اس کی سطحی توضیح تو یہ ہے کہ لیبر اور لیکوڈ دونوں پارٹیاں ہیریڈم کی سیاسی حمایت کے لیے ان کی باتیں مان لیتی ہیں۔ یہ توضیح غیر اطمینان بخش ہے۔ یہ صورت حال تو 1984ء سے 1990ء کے دوران تھی جب لیبر اور لیکوڈ نے ایک اتحاد بنا لیا تھا۔ اس وقت ہیریڈم کی سیاسی حمایت کا حصول ضروری نہیں تھا۔ مزید براں اس توضیح میں 1980ء سے بنیاد پرست کہلانے والی تمام مذہبی پارٹیوں کے لیکوڈ اور دائیں بازو کی دوسری سیکولر پارٹیوں کے ساتھ خصوصی تعلق کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس تعلق خصوصاً لیکوڈ اور ہیریڈی مذہبی پارٹیوں کے تعلق کی اساس ایک مشترکہ تصورِ جہان ہے اور اسرائیلی سیاست میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ (یہ تعلق عیسائی اور مسلم بنیاد پرستوں کے اپنے دائیں بازو کی سیکولر

پارٹیوں سے تعلق سے مشابہہ ہے) این آر پی کی نسبتاً سادہ مثال اس کی عمدگی سے تصویر کشی کرتی ہے۔ این آر پی بھی انہیں ہلاکائی اتھارٹیوں کو مانتی ہے جنہیں ہیریڈی پارٹیاں مانتی ہیں، گو کہ ان کی پیروی ہمیشہ نہیں کرتی۔ این آر پی یہودی ماضی کے حوالے سے انہی جیسے آدرشوں کو مانتی ہے اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مستقبل کے حوالے سے، کہ جب ان کے بیان کے مطابق یہودی غیر یہودیوں پر غالب آ جائیں گے۔ این آر پی اور ہیریڈم میں اختلافات این آر پی کے اس عقیدے سے جنم لیتے ہیں کہ نجات کا آغاز ہو چکا ہے اور مسیح (Messiah) کی آمد کے ساتھ ہی تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ ہیریڈم اس عقیدے کو نہیں مانتے ہیں۔

این آر پی کے ایسے گمراہ کن نظریات کو 1970ء کی دہائی سے این آر پی کے اراکین پر ہیریڈی اثرات کے بڑھنے سے زک پہنچی ہے۔ این آر پی کے ایسے اراکین تالمود کے احکامات سے روگردانی کی مزاحمت اور ہیریڈی موقفوں کی تائید کرتے ہیں۔ این آر پی کے آبادکاروں کی قدر و منزلت میں اضافے سے کسی حد تک اس صورت حال میں توازن پیدا ہوا ہے۔ ان آبادکاروں کو مسیح ازم (Messianism) کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ مسیح ازم کے ایک پیروکار (Messianist) کے ہاتھوں وزیراعظم رابن کے قتل سے ہیریڈی کے وقار میں عاضی طور پر اضافہ ہوا تھا۔

دائیں بازو والے اسرائیل بی پر مذہبی اثرات کے سبب دو ہیں، ایک اس کا عسکری کردار ہے اور دوسرا ہے اس کا تصور جہاں، جس کو اکثر یہودی مانتے ہیں۔ سیکولر اور دائیں بازو والے عسکریت پسند اسرائیلی یہودی مذہبی یہودیوں جیسے سیاسی نظریات کے حامل ہیں۔ لیکوڈ پارٹی کے بیشتر اراکین کا عقیدہ ہے کہ ''یہودی خون'' کی وجہ سے یہودی غیر یہودیوں کے مقابلے میں ایک مختلف زمرے میں آتے ہیں، بشمول ان غیر یہودیوں کے جو کہ اسرائیلی شہری ہیں اور اسرائیلی فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مذہبی یہودیوں کے نزدیک غیر یہودی افراد کا خون کسی حقیقی قدر کا حامل نہیں ہے، تاہم لیکوڈ پارٹی کے اراکین اسے تھوڑی بہت قدر کا حامل مانتے ہیں۔ میناکم بیگن نے جینٹائل کے حوالے سے ایسی ہی لچھے دار تقریریں کر کے مقبولیت اور ووٹ حاصل کیے۔ اس حوالے سے لیبر اور لیکوڈ میں فرق لفظوں کا ہے۔ تاہم اتنا اہم ضرور ہے کہ ان کے تصور جہان کو افشا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر 1982ء میں اسرائیلی فوج نے بیروت پر قبضہ کر لیا تھا اور صابرہ وشتیلہ کے پناہ گزین کیمپوں میں فلسطینیوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی، اس موقعے پر بیگن نے تبصرہ کیا تھا ''جینٹائل جینٹائل کو قتل کرتے ہیں اور الزام یہودیوں پر دھر دیتے ہیں۔'' رابن نے لیبر کی نمائندگی کرتے ہوئے ایسا نہیں کہا حالانکہ وہ انہی پالیسیوں کی حمایت کر رہا تھا جن کا حامی لیکوڈ کا شیرون تھا۔ اگرچہ رابن بھی ایسی بات کہنے پر قادر تھا تاہم وہ جانتا تھا کہ یہودیوں سے نفرت کرنے والے اور ان سے نفرت نہ کرنے والے جینٹائل میں فرق کو سمجھنے والے لیبر پارٹی کے اس کے بیشتر سیکولر حمایتی اس قسم کے کسی بیان کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ اس قسم کی باتوں کو جھوٹی اور نقصان دہ قرار دے کر رد کر دیں گے۔

مذہبی اثر دائیں بازو والوں کی طرف سے یہودی ماضی کا احترام عمومی طور پر کرنے سے عیاں ہوتا ہے نیز ان کے اس اصرار سے کہ اسرائیل کی موجودہ سرحدوں سے وسیع ملک کا قیام یہودیوں کا تاریخی حق ہے۔ سیکولر یہودیوں کے مقابلے میں دائیں بازو کے اسرائیلی یہودیوں کی انفرادیت پر زور دیتے ہیں۔ ماضی کے یہودیوں کی اکثریت کئی اعتبار سے ویسی ہی تھی جیسے کہ آج کے ہیریڈم ہیں۔ چنانچہ یہودی ماضی کو یہودی انفرادیت کی شہادت مان کر اس کا احترام کرنے والے یہودی کسی حد تک مذہبی یہودیوں کا احترام اس ماضی کو دوام دینے والوں کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ دائیں بازو والے ''عمومیت'' کے تصور سے نفرت کرتے ہیں، یعنی اس تصور سے کہ یہودی دوسرے لوگوں جیسے ہی ہیں اور دوسری قوموں کی طرح استحکام کی خواہش رکھتے ہیں۔ اسرائیلی دائیں بازو کے سیکولر اور مذہبی یہودیوں کے مابین کچھ تہذیبی تعلقات بنیادی طور پر نظریاتی نہیں ہیں۔ لیکوڈ کے بہت سے حامی، سفر ڈی ہوں یا اشکینازی، روایت پسند ہیں۔ وہ ربیوں کو ایسی عظیم الشان ہستیاں تصور کرتے ہیں، جنہیں ایک پدرسری خاندان میں آباء اور ''ان کے مقام کو جاننے والی'' عورتوں نے تعلیم دی ہوتی ہے۔ دائیں بازو کے سیکولر یہودی بھی ایسی چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ دائیں بازو کے لوگ اکثر یہودی ماضی کے حسن اور برتری کے راگ الاپتے ہیں، خصوصاً اس وقت، جب وہ یہودی انفرادیت کے تحفظ کی بات کر رہے ہوں۔

دائیں بازو کے مذہبی اور سیکولر یہودیوں کے عقائد کے علاوہ خوف بھی مشترک ہیں۔ 6 اکتوبر 1993ء کے ''ہارتز'' میں، جو کہ اسرائیل کا سب سے مؤقر عبرانی زبان کا روزنامہ ہے، ڈورون روزبلم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس نے مختلف ذرائع کے حوالے سے لکھا تھا کہ لیکوڈ امن کے عمل کی وجہ سے اسرائیلیوں کو درپیش خطرات کا چرچا کر رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے ساتھ ہی لیکوڈ یہ بھی دعویٰ کرتی ہے کہ اس عمل کا آغاز لیکوڈ نے کیا تھا۔

روزبلم نے لیکوڈ سے تعلق رکھنے والے کنیسٹ کے رکن (ایم کے) اوزی لینڈاؤ کے درج ذیل بیان کو نقل کیا ہے۔ اوزی 1996ء کے انتخابات کے بعد کنیسٹ کی کمیٹی برائے دفاع و خارجہ امور کا چیئرپرسن مقرر ہوا تھا۔

> اگر شام کے حوالے سے رابن کی پالیسیوں پر عمل جاری رہا تو کسی صبح اسرائیلی یہودی دیکھیں گے کہ اسرائیلی ٹینک جولان کی پہاڑیوں سے بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اتر رہے ہیں...... تب گیلیلی کی آبادی پر 1973ء کی جنگ سے زیادہ سخت حملہ ہوگا...... چونکہ شامی اسرائیلیوں کو بے دخل کرنے کے تصور کا ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں...... اس لیے جولان کی پہاڑیوں سے اسرائیل کے پیچھے ہٹنے کا صرف یہ نتیجہ نکلے گا کہ شامی چاقو گیلیلی کے ہر باشندے کے گلے تک پہنچ جائے گا...... شامی پالیسیوں کا تعین ایک

جینیاتی ضابطے کے تحت ہوتا ہے، یہ تیز رفتار تبدیلیوں سے اثر پذیر نہیں ہوتیں۔

مغربی میڈیا نے اپنے دہرے معیار والی روش برقرار رکھتے ہوئے لینڈاؤ کے بیان پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ حالانکہ اگر کوئی غیر یہودی سیاستدان یہودی پالیسیوں کو جینیاتی ضابطے سے متاثر اور تیز رفتار تبدیلیوں سے غیر متاثر قرار دیتا تو مغربی میڈیا تقریباً یقینی طور پر غصے سے پھٹ پڑتا۔

روزمبلم نے لیکوڈ کے ایک بڑے رہنما ایم کے بنی بیگن کا حوالہ بھی دیا ہے، جس نے اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ شام اسرائیل پر حملہ کرسکتا ہے۔ اسرائیل کی بیشتر سیاسی پارٹیوں کے اراکین نے اس خوف کا اظہار کیا تھا۔ اسرائیل ہی کا خوف بقول بنی بیگن یہ تھا کہ شامی حملے کا مقصد وہی ہوگا جو کہ "کشنیف کے قاتلانِ یہود کا مقصد تھا"[2] بیگن نے مزید کہا کہ اس مرتبہ شامیوں کو ایٹمی سائنسدانوں کا تعاون بھی حاصل ہوگا۔ روسی سلطنت میں بہت کم تعداد میں موجود غیر مسلح یہودیوں سے اسرائیل اور اس کی فوج کو تشبیہہ دینے سے دائیں بازو کی اسرائیلی سیکولر اور مذہبی پارٹیوں کا یہودی ماضی کی طرف مشترکہ رجحان عیاں ہوگیا ہے۔ یہ رجحان تاریخی ارتقا کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ان کا ایقان یہی ہے کہ یہودی ہر حال میں جینٹائل کا نشانۂ ستم ہیں۔

روزمبلم، جو کہ اسرائیل اے سے تعلق رکھتا ہے، اس قسم کی تشبیہات کو لایعنی سمجھتا ہے۔ اس نے شامیوں کے لیے بھیڑوں کی تشبیہہ استعمال کرنے پر لینڈاؤ سے طنزاً پوچھا "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھیڑیے ہیں؟" اس کے بعد روزمبلم نے تجزیہ کیا ہے کہ یہ طرزِ بیان اس قدر مؤثر کیوں رہا ہے:

> طویل عرصے سے شبہ کیا جارہا ہے کہ قومی کیمپوں (یعنی دائیں بازو کے سیکولر لوگ) دنیا کے اپنے وجودی خوف کو چھپانے کے لیے زوردار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ خوف ریاستِ اسرائیل کے قیام کے بعد تھوڑا سا بھی کم نہیں ہوا ہے۔ لیبر پارٹی، اپنی خامیوں کے باوجود، اس خوف پر قابو پانے اور اس کی جگہ دنیا کا ایک تعمیری اور عملیت پسندانہ تصور اپنانے میں کامیاب رہی ہے جبکہ لیکوڈ پارٹی ایسا نہیں کرسکی۔

اسرائیل کی قوت اور مشرقِ وسطیٰ پر اپنی رائے تھوپنے کی اہلیت کے بارے میں وثوق کے ساتھ بات کرنے والے شاونیت زدہ یہودی ایسے ہی خوف کا شکار ہیں۔ یہ لوگ پیش گوئی کرتے ہیں کہ اگر اسرائیل نے عربوں کو کوئی رعایت دی تو ایک اور ہولوکاسٹ (Holocaust) فی الفور رونما ہوگا اور یہی لوگ اکثر حتمی لہجے میں کہتے ہیں کہ اگر سیاست دان، امریکی اور بائیں بازو کے یہودی اسرائیلی فوجی پر قدغن نہ لگائیں تو وہ بغداد کو ایک ہفتے کے اندر اندر فتح کرسکتی ہے۔ (ایریئل شیرون نے اکتوبر 1973ء کی جنگ شروع ہونے سے چند ماہ پہلے ایسا ہی دعویٰ حقیقتاً کیا تھا)۔ خوف اور خود اعتمادی ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ یہودی انفرادیت کا عقیدہ اس موجودگی کو تقویت دیتا ہے۔ بیشتر غیر ملکی مبصروں کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے کہ اسرائیلی یہودی عوام کی اچھی خاصی تعداد ایسے ہی شاونیت پسندانہ تصورات کی حامل ہے۔ اسرائیل میں دائیں بازو کے سیکولر اور مذہبی لوگوں کا یہ خوف اور

خود اعتقادی سامیت دشمنوں کے رویے سے مماثل ہے جو کہ یہودیوں کو بیک وقت طاقتور اور فتح کیے جانے کے قابل تصور کرتے ہیں۔ دیگر کے علاوہ اس وجہ سے بھی دائیں بازو کے اسرائیلی یہودی جینٹائل، بالخصوص عربوں، سے بالکل ویسا ہی سلوک روا رکھے ہوئے ہیں جیسا کہ سامیت دشمنوں نے یہودیوں سے روا رکھا تھا۔

دائیں بازو کے سیکولر اور مذہبی یہودیوں کے دیگر خوف بھی مشترکہ ہیں۔ وہ مغرب اور مغربی عوام کی رائے سے خوف زدہ ہیں۔ وہ بائیں بازو کے یہودیوں سے، جن میں لیبر پارٹی کے بیشتر لوگ شامل کیے جاتے ہیں، خوف کھاتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ اطمینان بخش حد تک یہودی نہیں ہیں، کہ وہ عربوں کو یہودیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ کہ وہ الگ تھلگ جی رہے ہیں۔ وہ بائیں بازو سے اس وجہ سے بھی خوف زدہ ہیں کہ اس میں نئے لوگوں کو، بالخصوص ملک کی دانشور اشرافیہ کے لوگوں کو، اپنی طرف مائل کرنے کی اہلیت ہے۔

یہودیوں کے نارمل ہو جانے کا مسئلہ ایسا ہے جس نے دائیں بازو اور بائیں بازو کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ بائیں بازو کے لوگوں کی شدید آرزو ہے کہ یہودی نارمل ہو جائیں اور دوسری تمام قوموں جیسی ایک قوم بن جائیں۔ اس کے برعکس دائیں بازو کے تمام لوگ نارمل ہو جانے کے تصور سے ہی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہودی غیر معمولی لوگ ہیں...... دنیا کے دوسرے لوگوں اور قوموں سے بالکل مختلف۔ قومی ماضی کا احترام اس انفرادیت کو تقویت دیتا ہے۔ مذہبی یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے یہودیوں کو منفرد تخلیق کیا تھا۔ دائیں بازو کے بہت سے سیکولر لوگوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ یہودی منفرد لوگ ہیں اور وہ منفرد ہی رہیں گے۔

دائیں بازو کے سیکولر اور مذہبی لوگوں کے درمیان تعلق کی ایک وجہ اور بھی ہے، گو کہ وہ کم اہمیت رکھتی ہے۔ وہ وجہ یہ ہے کہ مذہبی یہودی اسرائیل پر یہودیوں کی دائمی حکمرانی اور فلسطینیوں کے بنیادی حقوق کی پامالی کے لیے "قائل کرنے والے" دلائل دینے کے اہل ہیں۔ ان دلائل کے مطابق ان علاقوں پر حکمرانی کا حق یہودیوں کو خدا نے دیا تھا۔ لیکوڈ کے سیکولر سکالر اور سیاست دان یہودی ماضی اور یہودی اقدار سے اس طرح کٹے ہوئے ہیں کہ وہ ان کے حوالے سے مؤثر انداز میں بات نہیں کر سکتے بلکہ اس طرح کے معاملات کو درست طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے۔ لیکوڈ کی پالیسیوں کو عمیق جواز صرف مذہبی لوگ ہی مہیا کر سکتے ہیں، ان پالیسیوں کو قلیل المیعاد سٹریٹیجک مقاصد کے تحت نہیں بلکہ خدا اور اس کے منتخب لوگوں کے درمیان تعلق کی طویل تاریخ کے تناظر میں بنایا گیا ہے۔

اگرچہ یہ جذبات اسرائیل بی میں بہت زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہیں، تاہم اسرائیل اے سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں بھی انہیں پایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے عیاں ہوتا ہے کہ مذہبی پارٹیوں کو سیاسی رعائتیں کیوں دی جاتی ہیں۔ (غیر ملکی مبصر غلطی کرتے ہیں، جب وہ ان رعائتوں کی وجہ صرف مذہبی پارٹیوں کے سائز اور/یا لابنگ کرنے کی ان کی قوت کو قرار دیتے ہیں)۔ ان جذبات نے یہودی تاریخ نویسی اور تعلیم پر بھی اثر ڈالا ہے۔ 1950ء کی دہائی سے، اور خاص طور پر 1967ء کی جنگ کے بعد سے، یہودی مؤرخ، متعلقہ علوم کے

سکالراوران کے خیالات کو عام کرنے والے یہودی تو غیر ملکوں میں رہنے والے اپنے یہودی ساتھیوں کی نسبتاً زیادہ دیانتداری برتتے ہوئے، ماضی کے یہودی معاشروں کو بہت زیادہ حسین اور سحر آفریں بنا کر پیش کرتے ہیں اور نارمل تنقید سے گریز کرتے ہیں۔اس سے ایک نئے رجحان کا آغاز ہوا ہے۔انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک ابتدائی صیہونی اور دیگر جدیدیت پسند یہودی تحریکوں کے پیروکار خود اپنی مذہبی تہذیبی روایت پر سخت تنقید اور اسے بدلنے کی کوشش کرتے تھے، بلکہ کئی مثالوں میں تو انہوں نے اس کے کئی اجزا کو تباہ کرنے کی کوششیں بھی کیں۔1980ء کی دہائی کے اواخر سے کچھ نسبتاً کم عمر یہودی مؤرخوں نے، شاید اسرائیلی یہودی معاشرے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے متاثر ہو کر، ایسی کتابیں شائع کروائیں جنہوں نے آج تک چلے آرہے معذرت خواہانہ رجحان کو ہلا کر رکھ دیا۔

دائیں بازو کے سیکولر یہودیوں کے تصورِ جہان اور خوف کا ہیریڈم کے تصورِ جہان اور خوف سے موازنہ مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔دنیا کے بارے میں ہیریڈی کے تصور کو صرف ماقبلِ جدید زمانوں کی یادگار کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ مینا کم فرائڈ مین مغربیت کو اپنا لینے والے باعمل یہودی ہیں۔انہیں انقلابی فلسطین اور ریاستِ اسرائیل ہر دو مقامات میں ہیریڈم پر ایک انتہائی مؤثق اتھارٹی مانا جاتا ہے۔ وہ مذہبی یونیورسٹی ''بار ایلان'' میں پروفیسر ہیں۔انہوں نے ''داور'' کے 4 نومبر 1988ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں ان ہیریڈی تصورات کو نہایت عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔فرائڈ مین نے یہ مضمون 1988ء میں فلسطینیوں کے ساتھ اعتدال برتنے کا پرچار کرنے والے کچھ مذہبی امیدواروں کی ناکامی کے حوالے سے انتخابی منظر نامے کی توضیح کرتے ہوئے لکھا تھا۔انہوں نے لکھا تھا:

> ہیریڈی دنیا کا مرکز یہودیت ہے۔ ہیریڈی فکر کی اساس یہ تصور ہے کہ یہودیوں اور جینٹائل کے مابین ایک اتھاہ گہرائی حائل ہے جو انہیں یکسر الگ الگ کر رہی ہے۔اسی وجہ سے لیبر پارٹی اور ہیریڈی فاختاؤں کے مابین کوئی اتحاد ناممکن ہے۔حقیقتاً ہیریڈی فاختہ نامی کوئی شے وجود نہیں رکھتی ہے۔ جو لوگ ہیریڈی دنیا کے بارے میں بات کرتے ہیں انہیں عموماً علم نہیں ہوتا کہ اس کی علامتوں کا کیا مفہوم ہے۔وہ اس دنیا کو سمجھتے ہیں نہ اس کی ممتاز شخصیات کو۔ ہیریڈی فاختاؤں اور شکروں میں فرق بہت کم ہے۔دونوں ہی یہودیوں اور غیر یہودیوں کے تعلق کو اسی زاوئے سے دیکھتے ہیں، جس زاوئے سے اسرائیل کے قیام سے پہلے دیکھتے تھے۔ان کا ایقان ہے کہ یہودیوں اور غیر یہودیوں میں قطبین کا فرق ہے۔ غیر یہودی لوگ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا اور تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ یہودیوں میں اختلافات صرف اس بات پر ہیں کہ غیر یہودی لوگوں کی اس خواہش پر کس انداز سے ردعمل ظاہر کیا جائے۔اس وقت

اس مشترک مفروضے کے دو متبادل ہیریڈی ردعمل ہیں۔ ربی شاک (دو ہیریڈی فرقوں میں سے ایک کا روحانی پیشوا) کہتا ہے چونکہ غیر یہودی لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم خاموش رہیں اور انہیں اپنی موجودگی یاد دلا کر بھڑکانے سے باز رہیں۔ لوبوچر ربی کہتا ہے کہ ہمیں مضبوط ہونا چاہیے۔ (لوبوچر ربی یعنی ربی مینا کم سکیرسن، متوفی 1992ء)۔ یہ ہیں دو متبادل حل، دونوں اس مشترک تصور سے ابھرے ہیں کہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین گہرا خلا موجود ہے۔ ربی شاک شلا مائٹ ایلونی (میریٹز پارٹی کا ایک سابق رہنما) کی طرح کی فاختہ نہیں ہے۔ ایلونی فاختہ ہے کیونکہ وہ انسان دوستی پر یقین رکھتی ہے جو کہ تمام انسانوں اور اقوام کی بنیادی مساوات اور تمام مختلف انسانوں اور اقوام کے مابین مکالمے کی اہلیت پر زور دیتی ہے۔ ربی شاک کا عقیدہ ہے کہ غیر یہودی لوگوں کے ساتھ معاملہ ممکن نہیں ہے اور یہ کہ وہ صرف اس قابل ہو سکتے ہیں کہ یہودیوں کے وجود کو بھلا دیں۔ لوبوچر ربی کہتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ اپنی تباہی کے خواہاں غیر یہودیوں سے اپنے دفاع کے لیے مضبوط ہونا چاہیے۔ دونوں لیڈروں کے درمیان فرق مصر کے ساتھ ہونے والے امن معاہدے کے حوالے سے دونوں کے رویے سے واضح ہے۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ کوئی امن نہیں ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مصری ہمیں فنا کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم ربی شاک مزید کہتا ہے کہ ہمیں خاموش رہ کر یہودیوں کے جانی نقصان کو کم کرنا چاہیے۔ لوبوچر ربی کہتا ہے چونکہ امن تو کسی صورت وجود نہیں رکھتا لہٰذا ہمیں کوئی بھی رعایت دینے سے انکار کر دینا چاہیے۔ ہیریڈی فاختہ کسی قسم کے امن پر یقین نہیں رکھتی۔ چنانچہ لیبر پارٹی کی قیادت میں ہیریڈم کے ساتھ قائم ہونے والے کسی اتحاد کی بات سراسر بے بنیاد ہے۔

اسرائیل میں ہونے والی سیاسی پیشرفتوں، بشمول مئی 1996ء کے تعین یا ہو والے انتخابات نے پروفیسر فرائڈمین کے تجزیئے کو درست ثابت کر دیا۔ شاس پارٹی کے روحانی رہنما ربی اوویدیا یوسف نے ایک دوسرے ہیریڈی زاویہ نظر سے اس مضمون کی توثیق کر دی۔ 18 ستمبر 1989ء کے یاتید نیامین میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں ربی یوسف نے لکھا کہ اسرائیل اتنا کمزور ہے کہ وہ مقدس سرزمین پر موجود تمام گرجا گھروں کو منہدم نہیں کر سکتا اور وہ اتنا کمزور بھی ہے کہ اپنے مفتوحہ علاقوں پر قابو بھی نہیں رکھ سکتا۔ ربی یوسف نے اس استدلال کے ذریعے یہ موقف پیش کیا کہ اسرائیل کو یہودی جانوں کے زیاں کا باعث بننے والی جنگ سے بچنے کے لیے علاقائی رعائتیں دینا ہوں گی۔ ربی یوسف نے نہ تو فلسطینیوں کا ذکر کیا اور نہ ہی ان کے بنیادی حقوق کا۔

ہیریڈی کا ورلڈ ویو ویسا ہی ہے جیسا کہ دائیں بازو کے سیکولر یہودیوں کا۔ لیکوڈ کے سیاستدانوں کا ورلڈ ویو، جس کی ان کے پیروکار ولولہ انگیز تائید کرتے ہیں، بنیادی طور پر مذہبی یہودیوں والا کلاسیک ورلڈ ویو ہی ہے، یہ اہم سیکولرائزیشن سے تو گزرا ہے، تاہم اس کی جوہری خصوصیات اب بھی باقی ہیں۔

دائیں بازو کی سیکولر اور مذہبی پارٹیوں کے اتحاد کے نتیجے میں 1996ء کے انتخاب میں نیتن یاہو کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ یہ اتحاد متعلقہ پارٹیوں میں دو گہرے سیاسی اختلافات کے باوجود تشکیل دیا گیا تھا۔ پہلا اختلاف جمہوریت کے حوالے سے ہے، خاص طور پر جیسا کہ اسرائیلی پارٹیوں کے ڈھانچے سے عیاں ہوتا ہے۔ دوسرا اختلاف صیہونیت کا ہے۔

ہیریڈی کے علاوہ اسرائیل کی تمام سیاسی پارٹیوں کو مغربی ملکوں، خصوصاً امریکہ کی سیاسی پارٹیوں والے خطوط پر تشکیل دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بیشتر اسرائیلی پارٹیوں نے کنیسٹ کے انتخابات کے لیے امیدواروں کے چناؤ کے واسطے پرائمریز (Primaries) کو متعارف کروایا۔ تاہم ہیریڈی پارٹی سٹرکچر مختلف ہے، جو شاید صرف ایران سے مشابہہ ہے۔ تمام ہیریڈی پارٹیاں دو درجوں والا سٹرکچر رکھتی ہیں۔ جو درجہ کمتر ہے، اس میں فعال سیاست دان شامل ہیں، جو خواہ وزیر ہوں یا کنیسٹ کے ممبر، عوام میں عاجزانہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ تو صرف پارٹی کی مذہبی کونسل کی خدمات بجالا رہے ہیں، جن سے وہ ہر فیصلے سے قبل ہدایات لیتے ہیں۔ کسی ہیریڈی پارٹی کا کوئی سیاستدان دوسری ہیریڈی پارٹی کی کونسل کی ہدایت قبول نہیں کرتا ہے۔ ربیوں کی ہدایات کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ ان کے فیصلوں سے کسی صورت روگردانی نہیں کی جاسکتی کیونکہ انہیں الوہی فیصلے مانا جاتا ہے۔ اس مشاورتی کونسل کے اراکین کو نہ ربی منتخب کرتے ہیں اور نہ عام لوگ۔ کونسل کے کسی رکن کے مرجانے کی صورت میں باقی اراکین اس کے جانشین کا تقرر کرتے ہیں۔ ہیریڈی پارٹی کونسلوں کے مذہبی اراکین، جنہیں ان کے پیروکار عموماً اپنے روحانی رہنما مانتے ہیں، تمام فیصلے کرتے ہیں اور پارٹی کے عمومی سٹرکچر کو شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیونکہ وہ اسے اختراعی اور جدید تصور کرتے ہیں۔ رکنیت، شاخوں، داخلی انتخابات اور بہت سی دوسری ایسی خصوصیات سمیت جو کہ این آر پی میں موجود ہیں، جدید پارٹی سٹرکچر ہیریڈی پارٹیوں میں بالکل بھی موجود نہیں ہے۔ ہیریڈی پارٹیاں مختلف روحانی رہنماؤں کی پیروی کی وجہ سے ایک دوسری سے اختلاف بلکہ نفرت کرتی ہیں۔ ہیریڈی سیاسی سٹرکچر مردانہ اجارہ داری کا حامل ہے۔ ہیریڈی سیاستدانوں میں آج تک کوئی عورت نہیں ہے۔ ہیریڈی عدم اتفاقی نے اسرائیلی معاشرے کو تیز رفتار ہیریڈائزیشن سے بچا رکھا ہے۔ یہودی کمیونٹیوں میں ہیریڈی سے ملتا جلتا سٹرکچر دوسری صدی عیسوی سے لے کر جدید قومی ریاستوں میں یہودی کمیونل خودمختاری کے خاتمے تک برقرار رہا۔ ہیریڈی سرگرمیوں کا مقصد جدید دور سے پہلے کے یہودی طرز زندگی کو محفوظ رکھنا ہے۔ ہیریڈی پارٹیاں این آر پی کی اپنائی ہوئی جدیدیت کی سیاسی مخالفت کرتی ہیں۔ بہت سے دوسروں کی طرح ہیریڈی کا ردعمل اکثر ایک ایسے ماضی کو واپسی کی رومانوی خواہش کا بہروپ دھار لیتا ہے، جس کے بارے

میں کہا جاتا ہے کہ وہ یہودیوں کے لیے تشکیک اور غیر یقینیت سے معمور جدید زندگی سے زیادہ پُر مسرت اور جذباتی اعتبار سے زیادہ محفوظ تھا۔ ہیریڈی کمیونٹی اپنے افراد کے شکوک کو دبا دینے کی کوشش کرتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ اس طرح خوشی حاصل ہوجاتی ہے۔

صیہونیت کے حوالے سے ہیریڈم اور دیگر بیشتر اسرائیلی یہودیوں کا اختلاف پیچیدہ ہے۔ ہیریڈم اور صیہونی مرکزی اہمیت کے حامل اس صیہونی اصول پر متفق ہیں کہ تمام غیر یہودی لوگ ازلی سامیت دشمن ہیں اور یہ کہ سامیت دشمنی زینوفوبیا اور/یا دوسری اقلیتوں سے نفرت سے مختلف ہے۔ یہ تصور ویسا ہی ہے، جیسا کہ سامیت دشمن یہودیوں کے حوالے سے رکھتے ہیں۔ (شاید اسی یکسانیت کی وجہ سے ہرزل کے دور سے کچھ صیہونیوں اور "معتدل" سامیت دشمنوں کے مابین سیاسی رابطہ قائم ہوا۔ یہ معتدل سامیت دشمن صرف اپنے معاشروں کو یہودیوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں یا انہیں قتل کیے بغیر اپنے معاشروں میں ان کی تعداد کو محدود کرنا چاہتے ہیں)۔ دائیں بازو کے سیکولر یہودیوں اور ہیریڈم میں سامیت دشمنی کا خوف مشترک ہے جبکہ لیکوڈ بائیں بازو کی لیبر پارٹی اور میرٹز پارٹی پر تواتر کے ساتھ الزام دھرتی آئی ہے کہ وہ اطمینان بخش حد تک صیہونیت پسند نہیں ہیں۔

تاہم کچھ خاص نکات پر ہیریڈی آئیڈیالوجی اور صیہونیت میں تصادم بھی ہیں۔ صیہونیوں کا ایک بڑا مقصد فلسطین میں ریاست کا قیام ہے اور دوسرا بڑا مقصد اس ریاست میں سارے یا جتنا زیادہ ممکن ہو یہودیوں کو لا کر آباد کرنا ہے۔ یہ مقاصد ہیریڈی کے تالمود اور تالمودی تبصروں کی تعبیروں سے متضاد ہیں۔ انہیں تضادات کی وجہ سے ہیریڈم مستقل طور پر صیہونیت کی شدید مخالفت کرتے آئے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ریاستِ اسرائیل بھی یہودیوں کے لیے ایک اور ایسی سرزمین ہے جو کہ ان کا وطن نہیں ہے۔ وہ صیہونی علامتوں کو استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہیریڈی کے علاوہ این آر پی سمیت ہر اسرائیلی سیاسی پارٹی اپنے کنونشنوں کے آغاز یا اختتام پر اسرائیل کا قومی اور عالمی صیہونی تحریک کا ترانہ گاتی ہے۔ ہیریڈی پارٹیاں اور تنظیمیں ایسا نہیں کرتیں بلکہ یہودی دعائیں پڑھتی ہیں۔ میڈیا "ہاتکوا" نہ گانے پر ہیریڈم پر اکثر تنقید کرتا ہے۔ اسرائیل میں منعقد ہونے والے تمام بین الاقوامی صیہونی کنونشنوں میں صرف اسرائیل کا جھنڈا لہرایا جاتا ہے جبکہ اسرائیل میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی ہیریڈی کنونشنوں میں اسرائیل کے علاوہ جس جس ملک سے مندوبین آئے ہوئے ہوں، ان ملکوں کے جھنڈے حروفِ تہجی کے اعتبار سے لہرائے جاتے ہیں۔

ہیریڈی صیہونیت پر جو اعتراض کرتے ہیں اس کی بنیاد کلاسیکی یہودیت، جس کو جاری رکھنے والے ہیریڈی ہیں، اور صیہونیت میں پایا جانے والا تضاد ہے۔ بدقسمتی سے لاتعداد صیہونی مؤرخوں نے اس معاملے کو الجھا دیا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے تفصیل سے بات کرنا ضروری ہے۔ ٹریکٹیٹ کیتوبوت (Tractate Ketubot) صفحہ 111 پر ایک مشہور تالمودی عبارت ہے، جس کی بازگشت تالمود کے دوسرے حصوں میں بھی ہے، جس کے

مطابق خدا نے یہودیوں سے تین عہد لیے تھے۔ ان میں سے صیہونیت سے واضح تضاد رکھنے والے دو عہد یہ ہیں: (1) یہودیوں کو غیر یہودیوں کے خلاف بغاوت نہیں کرنی چاہیے (2) مسیح کی آمد سے پہلے فلسطین کی طرف اجتماعی نقل مکانی نہیں کرنی چاہیے۔ (تیسرا عہد، جس کا موجودہ بحث سے تعلق نہیں، یہ ہے کہ یہودیوں کو مسیح کی آمد کے لیے بہت زیادہ عبادت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ آمد مقررہ وقت سے پہلے نہیں ہوگی)۔ ساری مابعدِ تالمود یہودی تاریخ کے دوران ربی ان تین عہدوں پر بحث کرتے رہے ہیں۔ موجودہ بحث سے متعلقہ سوال یہ ہے کہ کیا فلسطین کی طرف نقل مکانی ممنوع ہے یا نہیں۔ 1500 سالہ ماضی کے دوران روایت پسندانہ یہودیت کے ربیوں کی اکثریت نے ان تین عہدوں کی تعبیر یہی کی کہ جلاوطنی یہودیوں کا مذہبی فریضہ ہے اور یہ ان کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے ان پر عائد کی تھی۔

حالیہ برسوں میں متعدد اسرائیلی یہودی سکالروں نے، جو کہ مجموعی طور پر ایک زیادہ دیانتدارانہ یہودی تاریخ نویسی کو ترویج دے چکے ہیں، تین عہدوں کی مذہبی تعبیروں کے جوہر پر توجہ مرکوز کی ہے۔ مثال کے طور پر ایویازر ریوتز کی نے اپنی انتہائی قابلِ قدر عالمانہ کتاب Messianism, Zionism and Jewish Religious Radicalism میں (جو کہ 1993ء میں عبرانی زبان میں شائع ہوئی تھی) پانچویں صدی عیسوی سے کی جانے والی تین عہدوں کی مذہبی تعبیروں کا ایک عمدہ خلاصہ پیش کیا ہے۔ ریوتز کی اپنے تجزیے میں لکھتا ہے کہ نویں صدی میں فلسطینی یہودیوں کے ایک اہم لیڈر ربی شموئیل ولد ہوشانا نے ایک نظم میں خدا کے الفاظ کو یوں درج کیا ہے: ''میں نے اپنے لوگوں سے عہد لیا ہے کہ وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اس وقت تک خاموشی اختیار کریں جب تک میں خود انہیں ویسے ہی تباہ نہ کردوں جیسے سدوم کو کیا تھا۔'' ریوتز کی مزید لکھتا ہے کہ تیرھویں صدی کے دوران جب کچھ ربی اور شاعر مذہبی وجوہات *3 کے تحت فلسطین چلے گئے تو دنیا کے دوسرے حصوں میں موجود ربیوں نے اس امکانی طور پر خطرناک مظہر کے پھیلاؤ پر تین عہدوں کے حوالے سے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ وورٹزبرگ جرمنی میں ایک یہودی مذہبی گروہ کے روحانی رہنما ربی ایلیازر ولد موشے نے تیرھویں صدی میں فلسطین جانے والے یہودیوں کو انتباہ دیا کہ وہ غلطی کر رہے ہیں اور خدا اس کی سزا موت کی صورت میں انہیں دے گا۔ تقریباً اسی زمانے میں گیرونا سپین کے ربی ایذرا نے، جو کہ ایک مشہور کبالائی تھا، لکھا کہ جو یہودی فلسطین کو نقل مکانی کر جاتا ہے وہ خدا کو فراموش کر دیتا ہے، جبکہ صرف فلسطین سے باہر، جہاں پر کہ یہودیوں کی اکثریت رہتی ہے، موجود ہے۔ ریوتز کی اس کتاب میں زور دے کر لکھتا ہے کہ انیسویں صدی تک ایسے ہی اور اس سے زیادہ انتہائی تصورات کا اظہار جاری رہا۔ ممتاز جرمن ربی یہاناتھن آئبشٹز نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں لکھا کہ فلسطین کی طرف یہودیوں کی کثیر تعداد میں نقل مکانی، خواہ اسے دنیا کی اقوام کی تائید ہی کیوں نہ حاصل ہو، مسیح کی آمد سے پہلے ممنوع ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں موشے مینڈل سن اور یہودی روشن خیالی کے دوسرے حامی نیز جرمنی میں جدید آرتھوڈوکسی کے بانی ربی رافائیل ہرش جیسے ان کے مخالفین تین

عہدوں سے اخذ شدہ ممانعت پر متفق تھے۔ ہرش نے 1837ء میں لکھا کہ خدا نے یہودیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ "اپنی کوششوں سے کبھی اپنی ریاست قائم نہ کریں۔" وسطی یورپ کے ربی تو اس بھی زیادہ آگے چلے گئے تھے۔ 1837ء میں، یعنی اسی برس کہ جب ہرش نے یہودیوں کو ایک یہودی ریاست کے قیام سے منع کیا تھا، شمالی فلسطین میں زلزلہ آیا، جس میں صفاد میں رہنے والوں کی اکثریت ہلاک ہوگئی، جن میں سے بہت سے لوگ یہودی تھے اور ان میں سے بہت سوں نے تھوڑا عرصہ پہلے نقل مکانی کر کے وہاں رہائش اختیار کی تھی۔ ہنگری کے ایک ممتاز ربی موشے ٹائٹل بام نے زلزلے کو فلسطین کی طرف یہودیوں کی نقل مکانی پر خدا کی ناراضگی قرار دیا۔ ٹائٹل بام نے کہا "خدا کی رضا یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی کوششوں اور ارادے سے سرزمینِ اسرائیل کو جائیں۔" ربی موشے نیکمینڈ یز، جو کہ 1270ء میں فوت ہوا، واحد ایسا غیر معمولی یہودی رہنما تھا جس کی رائے یہ تھی کہ یہودیوں کو نہ صرف فلسطین کی طرف نقل مکانی کرنی چاہیے بلکہ اسے فتح کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک کے اہم ربیوں نے نیکمینڈ یز کے تصور کو یا نظر انداز کر دیا یا اس کی سخت مخالفت کی۔

1970ء کی دہائی میں، اپنی وفات کے سات سو سال بعد، نیکمینڈ یز این آر پی اور گش ایمونم کے آباد کاروں کا سرپرست سینٹ (Saint) بن گیا۔ این آر پی کے ربی یہ دعویٰ بھی کر چکے ہیں کہ زمانہ مسیح پر تین عہدوں کا اطلاق نہیں ہوتا اور یہ کہ اگرچہ مسیح کی آمد ابھی تک ہوئی نہیں ہے تاہم آغازِ نجات کہلانے والے کائناتی عمل کی شروعات ہو چکی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس عرصے کے دوران بعض سابقہ مذہبی قوانین کو نظر انداز اور دیگر قوانین کو تبدیل کر دیا جانا چاہیے۔ اس طرح این آر پی اور ہیریڈم کے مابین تنازعہ اس بات پر ہے کہ یہودی نارمل زمانے میں جی رہے ہیں یا نجات کے آغاز کے زمانے میں۔ 1988ء کے قومی انتخابات میں سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد ہیریڈم میں خود اعتمادی بڑھی ہے اور انہوں نے صیہونیت اور این آر پی کی اصولی مخالفت میں شدت پیدا کی ہے۔ 1989ء میں دو انتہائی اہم ہیریڈم ربیوں، ربی شاک اور ربی یوسف نے بنی براک اسرائیل میں ایک صیہونیت مخالف کونشن منعقد کیا۔ انہوں نے صیہونیت اور نجات کے آغاز کے فلسفے کی اصولی مخالفت کا اظہار کرنے کے لیے جو تقریریں کیں، وہ ہیریڈی اخبار یامید نیامین کے 18 ستمبر 1989ء کے شمارے میں شائع ہوئیں۔ دونوں ربیوں نے ہلاکائی نقطۂ نظر سے اسرائیلی سیاست کے اس اہم موضوع پر بھی خطاب کیا کہ ارضِ اسرائیل کے کچھ حصے غیر یہودیوں یعنی فلسطینیوں کو دے دیئے جائیں یا نہیں۔ انہوں نے این آر پی اور گش ایمونم کے اس نظریئے کو مسترد کر دیا کہ نجات کا آغاز ہونے کی وجہ سے ارضِ اسرائیل کا کوئی حصہ غیر یہودیوں کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ ربی یوسف اور ربی شاک نے کہا کہ یہودی اب بھی ایسے نارمل زمانے میں جی رہے ہیں کہ جس میں یہودی جانوں کے تحفظ کے لیے ہمیشہ خدا کی دکھائی دینے والی مدد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اپنی ہلاکائی علمیت کے حوالے سے مشہور ربی یوسف نے عمیق تجزیہ پیش کیا اور اس امر کی طرف درست توجہ دلائی کہ ربی شاک اس سے کامل اتفاق کرتا ہے۔ ربی یوسف نے این آر پی اور گش ایمونم کے ربیوں

کے اس نظریئے سے اختلاف کیا کہ نجات کا آغاز ہو چکا ہے اور خدا کا حکم ہے کہ ارضِ اسرائیل کو فتح کر لیا جائے۔ ربی یوسف نے کہا کہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فتح کی جنگ میں ضائع ہو جانے والی یہودی جانوں کو بچایا جائے۔ ربی یوسف نے تسلیم کیا کہ زمانۂ مسیح میں یہودی غیر یہودیوں سے زیادہ طاقتور ہو جائیں گے، اس وقت ان پر ارضِ اسرائیل کو فتح کرنا، تمام غیر یہودیوں کو نکال باہر کرنا اور بت پرست (Idolatrous) عیسائیوں کے گرجا گھروں کو مسمار کر دینا فرض ہوگا۔ تاہم ربی یوسف نے کہا کہ نجات کا زمانۂ مسیح ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> درحقیقت یہودی غیر یہودیوں سے زیادہ طاقتور نہیں ہیں اور ارضِ اسرائیل سے غیر یہودیوں کو نکال باہر کرنے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ یہودی غیر یہودیوں سے خوفزدہ ہیں...... لہٰذا خدا کا حکم ابھی مؤثر نہیں ہے...... غیر یہودی بت پرست ہمارے درمیان اس امکان کے بغیر رہتے ہیں کہ انہیں نکالا جا سکتا ہے۔ اسرائیلی حکومت بین الاقوامی قانون کے تحت اس امر کی پابند ہے کہ ارضِ اسرائیل پر موجود عیسائیوں کے گرجا گھروں کی حفاظت کرے، حالانکہ یہ گرجا گھر یقینی طور پر بت پرستی کے مقامات ہیں۔ ایسا ہمارے مذہبی قانون کے اس حکم کے باوجود ہے کہ ہمیں ارضِ اسرائیل اور ہر اس علاقے سے جس کو ہم فتح کرنے کے قابل ہوں، بت پرستی اور اس پر عمل کرنے والے تمام لوگوں کو نکال باہر کر دینا چاہیے...... یقینی طور پر اس حقیقت سے اسرائیلی فوج کی 1967ء کی فتوحات کی مذہبی معنویت کمزور ہو رہی ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس سے اسرائیل کی حقیقی سیاست کا ایک پہلو خوب واضح ہو جاتا ہے۔ 1996ء کے انتخابات سے قبل، پیریز اور نیتن یاہو دونوں ہی ربی یوسف کو ایک اہم سیاسی شخصیت مانتے تھے اور کھلم کھلا اس سے ملتے تھے۔ وہ ربی یوسف کے اس اعلانیہ فلسفے سے آگاہ ہوتے ہوئے اس سے ملتے تھے کہ یہودیوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ اطمینان بخش حد تک طاقتور ہو جانے کے بعد ملک سے تمام غیر یہودیوں کو نکال دیں اور تمام گرجا گھروں کو مسمار کر دیں۔ اسرائیل کے بائیں بازو کے لوگوں اور امن کے بیشتر وکیلوں نے ربی یوسف اور شاک کی تعریف کی کہ وہ مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کے انخلا کے حامی ہیں، تاہم ان لوگوں نے نہ صرف ربی یوسف اور شاک کے حقیقی فلسفے کو نظر انداز کر دیا بلکہ اس پر پردہ ڈالا۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے ربی یوسف کی تقریر کے بیشتر اہم نکات کو نشر کرنے سے گریز کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یوسف ۔۔۔ شاک نظریہ اسرائیلی سیاست کے انتہا پسندانہ رخ کا عکاس ہے۔

ربی یوسف نے اپنی تقریر میں اس ہلاکائی ممانعت کو بھی تسلیم کیا کہ ارضِ اسرائیل کی زمین غیر یہودیوں کو نہیں بیچی جا سکتی، تاہم اس نے اس ممانعت کو اس وقت غیر مؤثر قرار دیا کہ جب ایسا کرنے سے یہودی

جانوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو۔ اسی نے اس معاملے پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ جنگ کے خطرے سے بچنے کے لیے یہودیوں کو حفاظتی اقدام کرنے چاہئیں یا صرف خدا کی مدد کی امید کرنی چاہیے۔ ربی یوسف نے کہا کہ یہ مسئلہ ویسا ہی ہے جیسا کہ یہ مسئلہ کہ یوم کپور کو کسی بیمار یہودی کی جان بچانے کے لیے اسے کھانا کھانے دینا چاہیے یا نہیں۔ ربی یوسف نے کہا اگر طبی ماہرین کسی روزہ دار یہودی بیمار کے زندہ بچنے یا مر جانے کے حوالے سے متفق نہ بھی ہوں تب بھی اسے کھانا کھلا دینا چاہیے۔ ربی یوسف نے اس استدلال کے تحت کہا کہ خواہ عسکری ماہرین اس امر پر ایک دوسرے سے متفق نہ ہوں کہ انخلا سے جنگ ٹل سکتی ہے یا نہیں، حکومت کو انخلا کا حکم دے دینا چاہیے۔ ربی یوسف نے خدا کی مدد والی دلیل پر اعتماد نہ کرتے ہوئے کہا کہ سابقہ جنگوں میں یہودی ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ دنیا پر خدا کی حاکمیت قائم کرنے والے مسیح کی آمد کسی ایک یہودی جان کے نقصان کے بغیر عمل میں آئے گی۔ ربی یوسف نے یہ بھی کہا کہ ریاستِ اسرائیل گناہ گار یہودیوں سے بھری ہوئی ہے، جن سے خدا ناراض ہے۔ اس نے متعدد مستند ربیوں کے حوالے سے ثابت کیا کہ تین عہد آج بھی مؤثر ہیں۔

رابن، پیریز اور نیتن یاہو نے ربی یوسف کے نظریئے میں دلچسپی نہیں لی۔ مزید برآں تین صفحوں پر محیط چھوٹے پوائنٹ میں شائع ہونے والے ربی یوسف کے علمیت کے خیرہ کن اظہار نے این آر پی کے کسی ایک ربی کو بھی قائل نہیں کیا۔ ربی یوسف اور ربی شاک، جو تھوڑے عرصے بعد ایک دوسرے کے دشمن بن گئے، صیہونیت اور نجات کے آغاز کے فلسفے کی مخالفت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قسم کی یہودی بنیاد پرستی کی ترویج بھی جاری رکھی۔ وہ 1996ء میں 120 رکنی کنیسٹ کے اپنے وفادار چودہ اراکین کو ہدایات بھی دیتے رہے۔ ربی شاک نے، جو کہ ربی یوسف کے مقابلے میں صیہونیت کا زیادہ سخت مخالف ہے، اپنی سیاسی پارٹی یہادوت ہاتورہ سے تعلق رکھنے والے کنیسٹ کے اراکین کو نیتن یاہو کی صیہونی حکومت میں وزیر بننے سے منع کر دیا۔ تاہم شاک نے انہیں نیتن یاہو حکومت کی حمایت کرنے کا حکم دیا۔ نیتن یاہو نے بڑی چالاکی کے ساتھ اس حمایت کے صلے میں یہادوت ہاتورہ کو ہاؤسنگ کی وزارت عطا کر دی۔ اس نے ایسا کیا کہ وہ خود ہاؤسنگ کا وزیر بن گیا اور یہادوت ہاتورہ سے تعلق رکھنے والے راوتز کو نائب وزیر بنا دیا۔ پھر نائب وزیر نے جس حکم پر اس کے دستخط کروانے چاہے، اس نے کر دیئے۔ یہ عمل واضح طور پر اس لیے کیا گیا تھا کہ یہادوت ہاتورہ ایک صیہونی حکومت میں باقاعدہ شرکت کے الزام سے بھی بچ جائے اور اس کے ثمرات سے بھی فیض یاب ہو سکے۔ ربی شاک کے برعکس ربی یوسف نے اپنی پارٹی کے اراکین کو نیتن یاہو حکومت میں وزیر بننے کا حکم دیا۔ ان حقائق سے ربی یوسف اور ربی شاک کی سیاسی اہمیت عیاں ہوتی ہے۔

مقبوضہ علاقوں کے حوالے سے ربی یوسف کے واضح طور پر بیان کردہ خیالات نہ صرف ہیریڈی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ ریاستِ اسرائیل کی حقیقی خارجہ پالیسی کے ایک بڑے حصے سے بھی واضح مشابہت رکھتے ہیں۔ ربی یوسف کا استدلال ہے کہ ریاستِ اسرائیل سے تمام عیسائیوں کو نکالنا یہودیوں کا مذہبی فریضہ ہے

اوراس فریضے کو صرف اس وقت تک پورا نہیں کرنا چاہیئے جب تک کہ یہودی جانوں کو خطرہ ہو۔ ربی یوسف صرف اور صرف یہودیوں کو نقصان پہنچنے کی بنیاد پر ریاستِ اسرائیل میں غیر یہودیوں کو رعائتیں دینے یا نہ دینے کا تعین کرتا ہے۔ اگر ربی یوسف کو یقین ہوتا کہ مقبوضہ علاقوں پر تسلط برقرار رکھنے سے عربوں کو یہودیوں کو نقصان پہنچانے کی تحریک نہیں ملے گی تو وہ ان علاقوں پر مستقل قبضے کی حمایت کرتا۔ جون 1967ء کے بعد سے اسرائیلی حکومتی لیڈروں کو اسرائیلی یہودیوں کی تقریباً مکمل تائیدوحمایت کے ساتھ یقین ہے کہ عرب اسرائیل کو نقصان پہنچانے کے اہل نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ انہیں کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں تھے۔ صرف 1973ء کی جنگ میں شدید نقصانات اٹھا کرنیز ایک اور جنگ کے خوف سے ریاستِ اسرائیل کی حکومت نے ایک بار پھر اسرائیلی یہودیوں کی تقریباً مکمل تائیدوحمایت کے ساتھ سینائی مصر کو واپس کرنے سے اتفاق کیا تھا۔ 1983ء میں، صابرہ اور شتیلہ میں خون کی ہولی کھیلنے کے بعد، اسرائیلی لیڈروں نے ایک تہائی لبنان پر مستقل قبضے اور باقی ماندہ دوتہائی لبنان پر قبضہ کرنے کا سوچا تھا۔ شیرون نے انہی شرائط پر اس وقت کی لبنان کی کٹھ پتلی حکومت کے ساتھ امن سمجھوتہ کیا تھا۔ تاہم 1984ء اور 1985ء میں لبنانیوں کی گوریلا جنگی کارروائیوں کے بعد، جن میں اسرائیلی مسلسل ہلاک ہو رہے تھے، اسرائیلی لیڈروں نے ان منصوبوں کو ترک کرنے اور پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ اسرائیلی خارجہ پالیسی کو سیکولر یہودی بناتے ہیں تاہم آج تک جوہری طور پر اسے یہودی ماضی سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ درحقیقت صیہونی تحریک بھی، جو کسی حد تک سیکولرائزیشن سے گزر چکی ہے، بہت سے بنیادی یہودی مذہبی اصولوں پر عمل کرتی ہے۔ پالیسی کے حوالے سے ربی یوسف، بن گوریان، شیرون اور تمام بڑے اسرائیلی سیاست دانوں کا موقف یکساں ہے۔



دوسرا باب

اسرائیل میں ہیریڈم کا ابھار

اگرچہ یہودی مذہبی بنیاد پرستی 1970ء کے عشرے کی ابتدا سے ہی تیزی سے پھیل رہی تھی تاہم اس نے 1988ء تک سیکولر بنیادوں والے اسرائیلی معاشرے کو نسبتاً کم متاثر کیا تھا۔ اسرائیلی شہروں میں الگ تھلگ علاقوں میں رہنے والے اور اپنے تفکرات و خدشات میں ڈوبے ہوئے مختلف ہیریڈی فرقے دوسرے لوگوں کو عجیب وغریب لگتے تھے۔ اگرچہ ان فرقوں کے بعض لوگوں کے اسرائیلی معاشرے کے سیکولر حصے کے ساتھ بعض خاص مسائل پر تصادم بھی ہوئے اور انہیں تھوڑی بہت عوامی توجہ بھی حاصل ہوئی تاہم انہیں زیادہ تر نظرانداز ہی کر دیا گیا تھا۔ 1988ء کے پارلیمانی انتخابات میں سنسنی خیز ہیریڈی کامیابی نے، جس کی پیش گوئی کسی انتخابی تجزیہ نگار نے نہیں کی تھی، بہت سے لوگوں کو حیران کر دیا۔ 1990ء کے عشرے میں ہوتے والے انتخابات میں مسلسل کامیابیاں حاصل کر کے ہیریڈم کئی مرتبہ ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ وہ اسرائیل کی سیکولر اکثریت سے اپنی بات منوانے کے قابل ہو گئے۔

ہیریڈی سیاسی کامیابیوں نے نہ صرف بہت سے اسرائیلی یہودیوں کو ہیریڈم میں زیادہ دلچسپی لینے پر مائل کیا بلکہ دیگر ملک، بالخصوص امریکہ، بھی ان میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ امریکہ میں انگریزی زبان میں ہیریڈم کے حوالے سے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بہت سی نئی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے، تاہم بدقسمتی سے زیادہ تر مصنفوں نے ان کی اساسی آئیڈیالوجی اور ورلڈ آؤٹ لک کو نظرانداز کر دیا۔ درج ذیل بحث میں ہیریڈی ابھار کی سیاسی اہمیت کا تجزیہ کیا جائے، خصوصاً ان قارئین کے لیے جو عبرانی زبان سے ناواقف ہیں۔ اس تجزیے کا ایک اہم نکتہ اس تصور کی قبولیت ہے کہ دائیں بازو کی ساری اسرائیلی سیاست کی تفہیم کا انحصار ہیریڈی سیاست کے بنیادی عناصر کی تفہیم پر ہے۔ ہم دو بڑے سوالات کا جائزہ لیں گے:

☆ ہیریڈی پارٹیوں کا سیاسی اثر کس طرح برقرار ہے؟

☆ہیریڈی نے کس تنظیمی ڈھانچے کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سیاسی کامیابی حاصل کی؟

ان دونوں سوالوں کا جواب تعلیم میں موجود ہے۔ ہیریڈی اپنے اور دوسرے یہودی بچوں کو کامیابی سے تعلیم دے چکے ہیں۔ وہ ان بچوں پر ایک سرپرستانہ تسلط رکھتے ہیں جس کو ایک اعتبار سے تسلسل کی ضمانت حاصل ہے۔ ہیریڈی متعدد سکول نیٹ ورکس پر براہ راست اتھارٹی اور متعدد دوسرے سکولوں پر بالواسطہ اثر رکھنے کی وجہ سے بہت سے اسرائیلی یہودیوں پر اثر انداز ہو چکے ہیں۔

پوری بیسویں صدی کے دوران ہیریڈم یہودی تعلیم کو زیادہ تر ویسا ہی رکھنے کی کوشش کرتے رہے جیسی کہ وہ یہودی معاشرے کے روشن خیالی سے متاثر ہونے سے پہلے پردیس (Diaspora) میں تھی۔ تاہم جن ملکوں میں ہیریڈم رہتے تھے، ان کی حکومتوں نے بعض اوقات نصاب میں جدید مواد شامل کرنے پر زور دیا جو کہ یہودی سکولوں میں پہلے پڑھائے جانے والے مواد سے متضاد تھا۔ اسرائیل کی صورت حال 1980ء تک ایسی ہی تھی۔ 1980ء سے ہیریڈم نے حکومت کی فیاضانہ سبسڈیز کے ذریعے اسرائیلی صوبوں کے بہت سے غریب شہروں اور بڑے اسرائیلی شہروں کی غریبوں کی آبادیوں میں پرانی طرز کی یہودی تعلیم اور پرانے طرز کا سکول نیٹ ورکنگ سسٹم قائم کر لیا۔ ہیریڈی کا واضح مقصد زیادہ سے زیادہ اسرائیلی بچوں پر اپنا تعلیمی اثر دائمی طور پر قائم کرنا رہا ہے۔

تاریخی طور پر مرد یہودیوں کی تعلیم ''ہیڈر'' میں تیرہ چودہ سال کی عمر میں داخلے سے شروع ہوتی تھی۔ (ہیڈر عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے کمرہ۔ یہ روایتی یہودی ایلیمنٹری سکول کا نام ہوتا تھا جو کہ عیسوی سن کی ابتدائی صدیوں کے تالمودی عہد سے لے کر اولین جدید قومی ریاستوں کے ظہور تک موجود رہا ہے)۔ ہیڈر پہلے صرف مردوں کے لیے ہوتا تھا۔ تالمود اور ہلاکا کے مطابق عورتوں کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور انہیں کسی قسم کی تعلیم دینے سے واضح طور پر منع کیا گیا ہے۔ جدید دور کے آغاز سے پہلے تک بیشتر یہودی عورتیں باقاعدہ تعلیم سے محروم ہوتی تھیں اور اکثر تو بالکل جاہل ہوتی تھیں۔ یہودی مردوں سے موازنہ کیا جائے تو یہ صورت حال حیران کر دیتی ہے۔ جدید قومی ریاستوں کے قائم ہونے اور بہت سے یہودیوں کے ردعمل پر ہیریڈم نے ہیریڈی بچیوں کو پست درجے کی تعلیم دینے اور ان میں ہیریڈی نظریات راسخ کرنے کے لیے خصوصی ادارے قائم کیے۔ ہیڈر میں صرف یہودی مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ریاضی، غیر ملکی زبانوں، سائنس، ادب اور عبرانی گرائمر سمیت سیکولر مضمون نہیں پڑھائے جاتے۔ بائبل کے بیشتر حصوں کو بھی نہیں پڑھایا جاتا۔ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کو رشی (ربی شلوموعتزاک، متوفی 1099ء) کی تشریح کے ساتھ پڑھانے کے بعد طلبا کو تالمود کے آسان حصے پڑھائے جاتے ہیں۔ تقریباً آٹھ سال کی تعلیم کے بعد کم اہل بچوں کو کوئی ہنر یا کاروبار سیکھنے کے لیے مختلف مقامات پر بھجوا دیا جاتا ہے، زیادہ اہل بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے ادارے میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اس ادارے کو یشیوا کہتے ہیں۔ (عبرانی میں یشیوا کا مطلب ہے نشست یا اجلاس)۔ عمومی طور پر مختلف درجوں کے ''یشیووت'' (یشیوا کی جمع) موجود ہیں۔ ہر درجے میں طلبا کو خارج کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ کم اہل طلبا کو

چھوٹے ربیوں یا ریستورانوں، ہسپتالوں، فوج اور دیگر اداروں میں مذہبی کشروت قوانین کی نگرانی پر فائز کر دیا جاتا ہے۔

زیادہ اہل طلبا کو ایک درجے کے یشیوا سے دوسرے اعلیٰ درجے کے یشیوا میں ترقی دی جاتی ہے۔ اعلیٰ ترین یشیوا سے گریجویشن کرنے اور شادی کے بعد بہترین طلبا اپنی زندگیاں کولیل کہلانے والے ادارے میں گزارتے ہیں (کولیل کی اصطلاح جس لفظ سے اخذ کی گئی ہے اس کا مطلب ہے "پورا")۔ یہاں وہ سارا وقت تالمودی ادب کے مطالعے میں گزارتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہل چند طلبا کو بعد ازاں اعلیٰ مذہبی عہدوں پر فائز کر دیا جاتا ہے یا یشیوا یا کولیل کا سربراہ بنا دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے مذکورہ بالا روایتی یہودی تعلیم میں کوئی سیکولر یا بشری مضمون شامل نہیں ہوتا۔ یہاں دوبارہ یہ بتانا اہم ہوگا کہ نہ صرف ریاضی، تمام سائنسوں اور غیر ملکی زبانوں کو پڑھایا نہیں جاتا بلکہ عبرانی ادب، جس میں مذہبی موضوعات پر کی گئی شاعری بھی شامل ہوتی ہے، گرائمر اور یہودی تاریخ بھی نہیں پڑھائی جاتی۔ لہٰذا اس امر پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ہیریڈم عبرانی مذہبی شاعری، حتیٰ کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شاہ کاروں تک سے، ناواقف ہیں۔ صرف مقدس مضامین ممکنہ حد تک شدت کے ساتھ پڑھائے جاتے ہیں۔ مقدس مضامین میں تالمود اور کچھ تالمودی ادب شامل ہے۔ یشیوا میں اعلیٰ ترین درجے میں بارہ سے چودہ گھنٹوں پر محیط مقدس تعلیم میں سے صرف ایک گھنٹہ اخلاقیات کی تعلیم کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور اس میں بھی مذہبی احکامات کی معمولی سی خلاف ورزی پر بھی خدا کی طرف سے اس زندگی میں اور جہنم میں دی جانے والی سزاؤں کا بیان ہوتا ہے۔ انجیلی پیغمبروں (Biblical Prophets) کتابِ ایوبؑ اور بائبل کے دوسرے بے شمار حصے نہ تو ہیڈروں میں اور نہ یشیووت میں پڑھائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ہیریڈم ان سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کے علاوہ ہیریڈم کو بائبل کے صرف ان حصوں کا علم ہوتا ہے جو تالمود میں شامل ہیں اور ان کی تعبیر بھی تالمودی تناظر میں کی جاتی ہے۔ عمومی طور پر ہیریڈم بائبل کے بنیادی حصوں سے لاعلم ہوتے ہیں۔ علم کا یہ فقدان ہیریڈم اور دوسرے مذہبی نیز سیکولر اسرائیلی یہودیوں کے مابین اختلافات کا ایک سرچشمہ ہے۔ یشیوا کے طلبا اکثر نیند سے محروم ہوتے ہیں۔ سولہ برس کی عمر کو پہنچنے پر یشیوا کے طلبا کو بارہ سے چودہ گھنٹے روزانہ تعلیم میں صرف کرنا ہوتے ہیں۔ کلاسوں میں شور ہوتا ہے کیونکہ طلبا اونچی آواز میں اپنے سبق کو پڑھتے ہیں۔ خاموشی سے پڑھنے کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ نتیجتاً کلاس میں اکثر ہڑبونگ مچی رہتی ہے، کیونکہ مختلف طلبا اونچی آواز میں مختلف سبق پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ طلبا سبق کے حوالے سے تو سوال کر سکتے ہیں۔ تاہم وہ ان مفروضوں کے بارے میں سوال نہیں اٹھا سکتے جن پر تعبیرات کی گئی ہوتی ہیں اور بیرونی دنیا کے حوالے سے بھی سوال کرنا منع ہوتا ہے۔ طلبا بیرونی دنیا خصوصاً سیکولر دنیا سے تقریباً مکمل طور پر کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا طرز کی تعلیم انسانی کردار کی صورت گری کرتی ہے۔ ناگزیر طور پر یہ منحرفین کو بھی جنم دیتی ہے۔ جدید دور میں یہودیت کے اولین منحرفین نے اس قسم کی تعلیم کے خلاف بغاوت کی اور مذہب کے اصولی

مخالف بن گئے جو کہ ان کے زاویہ نظر سے انہیں اس قسم کے آمرانہ کنٹرولز کے ذریعے جکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہیریڈی روایت والے سکولوں میں پڑھے ہوئے بعض دوسرے افراد آخر جدیدیت کی ترغیبات سے متاثر ہو گئے، مثلاً ٹیلیویژن اور فلمیں دیکھنا۔ اس کا نتیجہ ہیریڈی یہودیت کی کمزوری کی صورت میں تو نکلا ہے تاہم اس کا استرداد شاذ ہی وقوع پذیر ہوا ہے۔ اسرائیل میں ایسے لوگوں کو اب بھی "روایت پسند" یا "میسوراتی" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ سیکھتے ہیں اس پر عموماً ظاہری طور پر تنقید نہیں کرتے، وہ ممنوعہ سیکولر لذتوں کی ممانعت کے استرداد کی قیمت ادا کیے بغیر کرشاتی ربیوں کی پرستش جاری رکھتے ہیں۔ منحرف ہو جانے والے دیگر افراد ایسے بھی ہیں کہ جو عارضی وقفے کے بعد مقدس تعلیم کی طرف واپس آ گئے ہیں۔

ہیریڈم مقدس تعلیم کے تقدس اور اس کی انتہائی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مقدس تعلیم میں مشغول لوگوں کے اس نیک عمل سے ہی یہودیوں کو تمام اچھی چیزیں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقدس تعلیم میں مشغول لوگوں کو اپنی روزی کمانے کی ضرورت نہیں ہوتی، انہیں بے شمار مراعات حاصل ہوتی ہیں اور وہ کمیونل ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ان روایات کا آغاز تالمودی دور میں ہوا تھا اور اس دور کے تمام یہودی انہیں مانتے تھے۔ خود مختار کمیونٹیوں کی صورت میں رہتے ہوئے یہودی مقدس تعلیم میں مصروف لوگوں کو ٹیکس ادا کرنے اور دیگر ذمہ داریوں کے بوجھ سے مستثنیٰ کر سکتے تھے اور کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مقدس تعلیم میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبا کو یہودی کمیونٹی اپنی استطاعت کے مطابق خصوصی مراعات سے نوازتی تھی۔ مثال کے طور پر تالمودی دور (500ء—200ء) کے دوران عراق کے یہودی قصبوں میں مقدس تعلیم حاصل کرنے والے ایسے لوگوں کو جو تجارت بھی کیا کرتے تھے، یہ استحقاق ہوتا تھا کہ وہ عام یہودی تاجروں کے مقابلے میں اپنی اشیا پہلے بیچ سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان طلبا کو تجارت میں کوئی مسابقت درپیش نہیں ہوتی تھی۔

یہ یہودی تاریخ اور اسرائیلی سیاست کا ایک سلگتا ہوا مسئلہ ہے کہ ربی اور مذہبی طلبا اپنی روزی کس طرح کمائیں۔ اسرائیل کے ٹیکس دہندگان، جن میں سے بیشتر مذہبی نہیں ہیں، مستقل طور پر بڑھتے ہوئے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اشتعال پیدا ہو چکا ہے اور مسلسل پیدا ہو رہا ہے، خاص طور پر اس حقیقت کی موجودگی میں کہ مذہبی طلبا کی اکثریت کو فوج میں خدمات ادا نہیں کرنا پڑتیں۔ بیشتر اسرائیلی مذہبی یہودی، بالخصوص ہیریڈم، ریاستی سرپرستی اور فوجی خدمات سے استثنا کے حق میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہودی اور یہودی ریاست کا وجود ان مذہبی طلبا کے تالمودی مطالعے کی وجہ سے برقرار ہے۔ تصور کیا جاتا ہے کہ ان کی مدد کرنے کے صلے میں خدا کی مدد حاصل ہوتی ہے، جس میں یہ بھی شامل ہے کہ خدا اسرائیل کو اس کی جنگوں میں فتح دلواتا ہے۔ یہ دلیل، جو کہ دوسرے مذاہب کے مذہبی پیشوا بھی دیتے ہیں اور جس کو اکثر اسرائیلی میڈیا سے نشر کیا جاتا ہے، کہتی ہے کہ جنگیں فوج نہیں جیتتی بلکہ خدا کی مدد جیت کا باعث ہوتی ہے۔ اس دلیل میں اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ دوسرے فوائد بھی خدا ہی عطا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ تالمود کے مطالعے میں اپنا بیشتر وقت گزارنے والے ربیوں اور مذہبی طلبا کی وجہ سے اچھا موسم عطا کرتا ہے۔ عبادت کرنے، خیرات دینے یا دوسرے نیک کام کرنے

کے بجائے تالمود کا مطالعہ جنت میں داخل کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ جو لوگ تالمود کے مطالعے میں منہمک رہتے ہیں، وہ اپنے لیے، اپنے خاندانوں، اپنے مالی مددگاروں اور کسی حد تک دوسرے یہودیوں کے جنت میں داخلے کا سبب بنتے ہیں۔

تاہم ربیوں اور تالمود کے طلبا کی براہ راست مالی مدد کرنا یہودیت میں ایک اختراع ہے۔ تالمود کی جمع و ترتیب (Composition) کے طویل عرصے، تقریباً سن 50 قبل از مسیح سے سن 500 عیسوی تک نیز اس کے بھی صدیوں بعد تک، ربیوں اور طلبا کو تالمودی مطالعے کے عوض تنخواہ یا کسی قسم کی مالی مدد نہیں ملتی تھی۔ (بچوں کو بائبل پڑھانے والے ایلیمنٹری ٹیچروں کو تنخواہ دی جایا کرتی تھی)۔ کچھ تالمودی فضلا (Talmudic Sages) ورکنگ کلاس سے تعلق رکھتے تھے، معروف پیشوں کے حامل تھے اور کام کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ تالمودی فاضل کے لیے جس مالی مدد کی اجازت تھی وہ کام نہ کرنے کی ایک تلافی ہوتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک انتہائی اہم فاضل ابائے کی ایک تالمودی حکایت سے ہو سکتی ہے، جو چوتھی صدی عیسوی میں بابل میں رہتا تھا۔ ابائے کاشتکار تھا اور اپنی زمینیں خود کاشت کیا کرتا تھا۔ جب کوئی شخص اس سے کوئی سوال پوچھتا تو وہ اسے کہتا ''میری جگہ اس نہر پر کام کرو، میں تمہارے سوال پر غور کرتا ہوں۔'' اس رویے کی تائید کرنے والا آخری اہم ربی میمون (Memonides) تھا، جو 1204ء میں فوت ہوا تھا۔ میمون نے اپنی کتاب Learning Torah Laws (باب 3، جز 10) میں لکھا ہے:

> ''جو شخص تالمود کے مطالعے میں منہمک ہونے کے باعث اپنی روزی خیرات سے حاصل کرے اسے ایسا شخص تصور کیا جانا چاہیے جو کہ مذہب کی شمع کو بجھا چکا ہو، تورات کی بے حرمتی کر چکا ہو، اپنے لیے بدی کا باعث بن چکا ہو اور جنت میں داخل ہونے کا موقع کھو چکا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں تورات کے ذریعے منافع کمانا منع ہے۔ داناؤں نے کہا ہے: ''تورات سے نفع کمانے والا ہر شخص اپنی زندگی گنوا دیتا ہے۔'' داناؤں نے یہ بھی حکم دیا ہے: ''تورات کو نہ تو شان و شوکت کا ذریعہ بننے والا تاج بناؤ نہ ہی محنت کا ذریعہ کلہاڑی۔'' اس کے علاوہ داناؤں نے حکم دیا ہے: ''محنت سے محبت اور رہبانیت سے نفرت کرو۔'' محنت نہ کرنا تورات کی نفی ہے اور جو شخص تورات سے نفع کمائے وہ لٹیرا ہے۔''

بہت سے سیکولر اسرائیلی یہودی تمام ربیوں، بالخصوص اسرائیل کے ربیوں، کو میمون کے اس بیان کے حوالے سے لٹیرے قرار دیتے ہیں۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ صدیوں سے تقریباً تمام مذہبی یہودیوں نے میمون کی اس رائے پر توجہ نہیں دی ہے، حالانکہ اس نے اس کے حق میں تالمود کے بہت سے اقتباسات بھی درج کیے تھے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مذہبی یہودی تالمود اور میمون کی تحریروں سمیت ہر مقدس تحریر کو صرف انتہائی مقدس تشریحوں کے وسیلے سے

پڑھتے ہیں جو کہ مسلمہ مذہبی آراء کا درجہ پا چکی ہیں۔ میمون کی محولہ بالا تحریر کے بعد انتہائی اہم تشریح ''کیسف مشنے'' (چاندی کا اضافہ) ہے۔ جسے ربی جوزف کیرو متوفی 1575ء نے لکھا تھا۔ آج تک ہیریڈم میں سب سے مستند چلی آنے والی کتاب ''شلہان اریوک'' کے مصنف کیرو نے اس مسئلے پر میمون سے اختلاف کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''کیسف مشنے'' کے آغاز میں لکھتا ہے کہ میمون نے مشنے کی اپنی تشریح میں ربیوں کے معاوضوں پر تفصیل سے لکھا ہے اور ایسے ربیوں کی طویل فہرست درج کی ہے، جو تالمودی مطالعات کا معاوضہ وصول کرنے کی بجائے محنت مشقت کر کے روزی کماتے تھے۔ کیرو نے لکھا ہے:

> ''میمون نے ہلیل کی مثال دی ہے، جو تالمود کا طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ترکھان بھی تھا۔ یہ ثبوت نہیں ہے۔ ہمیں لازماً یہ قیاس کرنا ہوگا کہ ہلیل اپنے مطالعے کے آغاز میں محنت کرتا ہوگا۔ ہلیل کے زمانے میں ہزاروں تالمودی طلبا ہوتے تھے، شاید وہ ان میں سے بہت زیادہ مشہور طلبا کی مالی مدد کیا کرتے تھے...... تاہم ہم کس طرح یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ جب ہلیل مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں کو تعلیم دے رہا تھا تو وہ اس کی مالی مدد نہیں کرتے تھے؟''

اسرائیل کے مذہبی یہودی موجودہ ربیوں کے حق میں اس طرح کے دلائل دیتے ہیں۔ سیکولر اسرائیلی یہودی اکثر اس طرح کے دلائل پر ایک لطیفے کے ذریعے طنز کرتے ہیں۔ یہ لطیفہ تقریباً ہر اسرائیلی یہودی نے سنا ہوا ہے۔ یہ لطیفہ اس حقیقت کی بنیاد پر بنایا گیا ہے کہ اگرچہ یہودی مردوں کو سر پر ٹوپی رکھنے کا کوئی ہلاکائی حوالہ موجود نہیں ہے تاہم ایسی کوئی اور واضح روایت نہیں ہے، جس پر مذہبی یہودی آفاقی طور پر کاربند نہ ہوں۔ دراصل عبرانی میں سیکولر بن جانے والے مذہبی یہودی کے لیے معروف مقولہ ہے: ''اس نے اپنی ٹوپی اتار دی ہے۔'' اس لطیفے کا مرکزی کردار ایک ربی ہے جس سے کہا جاتا ہے کہ وہ یہودی مردوں کے ٹوپی پہننے کے فریضے کے حوالے سے ثبوت مہیا کرے۔ ربی جواب دیتا ہے ''بائبل کہتی ہے: حضرت ابراہیمؑ کسی جگہ گئے۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ وہ سر پر ٹوپی رکھے بغیر کہیں گئے ہوں گے؟'' اس لطیفے میں ربیوں کے استدلال کے عمومی انداز کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

کیرو کہتا ہے کہ تمام مشہور داناؤں کو، جن کا تذکرہ خود تالمود میں محنت کشوں یا ہنرمندوں کے طور پر آیا ہے، لازماً مالی مدد دی جاتی ہوگی۔ کیرو دلیل دیتا ہے کہ معبدوں کے پروہتوں کو ان کے کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے لہٰذا ربیوں کو بھی معاوضہ دیا جانا چاہیے۔ کیرو کہتا ہے کہ تالمودی طلبا کو معاوضہ دیا جانا چاہیے کیونکہ طلبا نہ ہوں تو ربی بھی نہیں ہوں گے۔ وہ کہتا ہے ''یہودی مذہبی اجتماعات میں عمومی مصارف کے نگرانوں کو ربیوں کو معاوضہ دینے پر مجبور کیا جانا چاہیے۔ حالیہ روایت یہ ہے کہ تمام یہودی ربیوں کو یہودی عوام سے معاوضہ ملتا ہے۔'' سولھویں صدی میں یہ عمومی روایت تھی، سوائے یمن جیسے دور دراز علاقوں کے۔ مواقع بڑھنے کے ساتھ ساتھ ربیوں کے معاوضے بھی بڑھتے گئے۔ سترہویں صدی کے اواخر سے ربیوں کی بدعنوانی کے وافر شواہد دستیاب ہیں۔ اس بدعنوانی کے بہت سے پہلوؤں میں سے دو یہ تھے کہ ربی امیر یہودیوں کے ساتھ مل کر غریب یہودیوں، بالخصوص اشکینازی

یہودیوں، پر جبر و استبداد کرتے تھے، نیز ربیوں کے تقرر کے لیے رشوت دی جاتی تھی اور ناجائز اثر و رسوخ استعمال کیا جاتا تھا۔ اسرائیلی عبرانی اخبارات نے ہیریڈی اور این آر پی کے متعدد ربیوں کی بدعنوانیوں کی خبریں خوب چھاپی ہیں اور پورے اسرائیل میں لوگ اس سے آگاہ ہیں۔ یہ بدعنوانی ایک پرانے رجحان کا تسلسل ہے۔

مقدس تعلیم حاصل کرنے والوں کو خصوصی مراعات دینے کا رواج جدید اسرائیلی معاشرے میں موجود ہے۔ یشیووت کے بیشتر گریجویٹس یا طلبا کو فوجی خدمات سے عارضی طور پر مستثنیٰ قرار دیا جانا ریاستِ اسرائیل میں ایک انتہائی متنازعہ معاملہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ پہلے ان طلبا اور گریجویٹس کو یشیووت کے سربراہوں کی طرف سے جاری ہونے والے ڈیکلریشن کی بنیاد پر فوجی بھرتی سے عارضی استثنا ملتا ہے۔ اس استثنا کی مدت ختم ہو جانے کے بعد یا تو فوجی ملازمت سے مکمل طور پر مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا ہے یا مختصر اور رسمی تربیت کے بعد براہِ راست آرمی ریزرو فورسز میں بھیج دیا جاتا ہے۔ انہیں ہر خطرناک، حتیٰ کہ ناخوشگوار عہدے پر خدمات انجام دینے سے استثنا حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے جنگ کے زمانے میں ان کے ہلاک یا زخمی ہونے کے امکانات بہت ہی کم ہو جاتے ہیں۔ اٹھارہ سے اکیس سال تک کے تمام اسرائیلی یہودی مردوں کے لیے تین سال تک فوجی ملازمت کرنا لازمی ہے، تاہم یشیووت کے طلبا اور گریجویٹس اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ایہوداشیری نے ہارتز کے 22 اگست 1996ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طرح 5 فیصد یہودی مردوں کو استثنا حاصل ہوتا ہے۔

اس مسئلے سے نیز اس کے حوالے سے ہونے والی بحثوں سے جذبات بہت زیادہ بھڑکے ہیں اور یوں اسرائیلی سیکولر یہودیوں اور ہیریڈم کے حامیوں کے مابین خلیج زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے سیکولر یہودیوں کو شکایت ہے، جیسا کہ انہیں اور دوسروں کو ماضی میں تھی، کہ ہیریڈم دوسرے اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ مل کر معاشرے کی ذمہ داریاں نہیں نبھاتے۔ ہیریڈم کہتے ہیں، جیسا کہ وہ ماضی میں مسلسل کہتے تھے، کہ یہ بات غلط ہے۔ ہیریڈم اپنی تعلیم کے زیرِ اثر یقین رکھتے ہیں کہ اسرائیلی فوج کی تمام فتوحات اور شکستیں خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور یہ کہ خدا تالمودی مطالعے میں منہمک یہودیوں کی تعداد اور کارکردگی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ ہیریڈم اس موقف کی تائید میں تالمود اور تالمودی ادب سے حوالے پیش کرتے ہیں۔ نہ صرف یشیووت کے طلبا اور گریجویٹس ہیریڈم کی تائید کرتے ہیں بلکہ روایت پرست اسرائیلی یہودی بھی ان کی تائید کرتے ہیں اور اس موقف کے حق میں مقدس تحریروں سے حوالے پیش کرتے ہیں۔

مذہبی تعلیم اور تالمود کے حوالے سے اکثر سیکولر اسرائیلی یہودیوں کا رویہ ہیریڈم کے رویے سے بالکل الٹ ہے۔ سیکولر یہودیوں نے تالمود کی بہت سی معروف پیروڈیاں لکھی ہیں جو کہ اب بھی اسرائیلی معاشرے میں وافر تعداد میں موجود ہیں۔ فوجی ملازمت سے استثنا کے لیے دیئے جانے والے ہیریڈی استدلال کے حوالے سے بہت سی پیروڈیاں لکھی گئی ہیں۔ اس طرح کی بحثیں گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں یورپ کے عیسائیوں میں ہوا کرتی تھیں۔ اکثر غیر ملکی مبصرین اسرائیلی یہودی معاشرے کے جس پہلو سے بے خبر ہیں، وہ یہ ہے کہ اسرائیل

میں سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ترقی کے باوجود ہیریڈم اور بیشتر دوسرے یہودی بنیاد پرست ایک ایسے دور میں رہتے ہیں، جس میں سے کئی نسلوں پہلے عیسائی معاشرے گزرے تھے۔ ان بنیاد پرستوں نے سیکولر اسرائیلیوں کی طرح جدید زمانے میں کوانٹم جست نہیں لگائی ہے۔ چنانچہ بنیاد پرست اور سیکولر اسرائیلیوں میں کشیدگی اس حقیقت کی پیدا کردہ ہے کہ دونوں گروپ الگ الگ زمانوں میں جی رہے ہیں۔

ہیریڈم اکثر بہت زیادہ انتہا پسندانہ نظریات گھڑتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکثر ہیریڈی کہتے ہیں کہ ہولوکاسٹ، بشمول 15 لاکھ یہودی بچوں کی ہلاکت کے، ایک ایسی الوہی سزا تھا، جس کا بھرپور جواز موجود تھا۔ اس سزا کی وجہ نہ صرف اکثر یہودیوں کی طرف سے جدیدیت کے گناہوں کا ارتکاب اور عقیدے کا انکار تھا بلکہ یورپ میں تالمود کی تعلیم کا زوال بھی اس کا سبب تھا۔ ہیریڈم اور ان کے روایت پرست یہودی پیروکار معصوم بچوں سمیت ہر یہودی کی موت کو فطری اسباب کی بجائے خدا کے براہ راست عمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ہیریڈم یقین رکھتے ہیں کہ خدا ہر یہودی مرد و عورت کو اس کے گناہوں کی سزا دیتا ہے اور بعض اوقات تو بے گناہوں سمیت پوری کمیونٹی کو دیگر یہودیوں کے گناہوں کی سزا دیتا ہے۔ جب 1985ء میں بارہ تیرہ سال کے بائیس بچے پیتاہ تیکوا قصبے میں بس کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تو ربی یتزاک پیریتز نے، جو کہ شاس پارٹی کا ایک رہنما ہے اور اس وقت وزیر داخلہ تھا، ٹیلیویژن پر کہا کہ یہ بچے اس لیے موت کا شکار ہوئے ہیں کہ سبت کی شام ایک مووی ہاؤس کھلا ہوا تھا۔ سیکولر یہودیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے متعدد عبرانی اخبارات نے ربی پیریتز کو ایسا بیان دینے پر بے رحمانہ تنقید کا ہدف بنایا۔ تاہم شاس پارٹی کو اگلے الیکشن میں کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اسے پیتاہ تیکوا سمیت بہت سے علاقوں میں ووٹ ملے۔ ہیریڈم ایسے ہی عقیدوں کے مالک ہیں اور اس امر کا پرچار کرتے ہیں کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں خدا یہودیوں کو ان کے گناہوں کی سزا اور اچھے کاموں کا اچھا صلہ دیتا ہے۔

1990ء کی دہائی کے اواخر میں ہیریڈم نے اپنے تعلیمی نظام کو توسیع دینے کی طرف اولین توجہ دی، خصوصاً غریب علاقوں میں، کہ جہاں وہ گرم گرم کھانوں جیسی ترغیبات دے سکتے تھے۔ ہیریڈم نے غیر ہیریڈی پبلک سکولوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا۔ بعض مقامات پر ان کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ دیگر مقامات پر تعلیم یافتہ اور سیاسی اعتبار سے بااثر والدین نے ہیریڈم کے پروپیگنڈے اور لابنگ کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ کچھ خاص مقامات پر ہیریڈی اثرات بہت زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر اسرائیل کے انتہائی مذہبی قصبوں میں سے ایک قصبے نیتیووت میں ہیریڈم نے ایک بھی پبلک ہائی سکول قائم نہیں ہونے دیا کیونکہ ایسے سکول میں سیکولر مضامین کی تعلیم دی جاتی۔ نیتیووت اسرائیل کا واحد قصبہ ہے جہاں کوئی ہائی سکول نہیں ہے۔

ہیریڈم اپنے اوہام کو پھیلانے کے لیے لوگوں کی مایوسیوں کا استحصال کرتے ہیں۔ شدید علالت کے شکار ہسپتال میں داخل مریضوں کے رشتہ داروں، بالخصوص روایت پرستوں کے پاس کرشماتی ربی کی طرف سے قاصد بھیجا جاتا ہے، جو پہلے تو انہیں کہتا ہے کہ ڈاکٹر کوئی مدد نہیں کر سکتے اور پھر وہ انہیں ربی کا روحانی طور پر مؤثر بنایا ہوا پانی دے کر کہتا ہے کہ اسے مریض پر چھڑکا جائے۔ وہ اس مقدس پانی کے معجزانہ اثرات کے کئی قصے سناتے

ہیں۔لوگ متاثر ہوکراس پانی کوخرید لیتے ہیں۔یہ رقم قطعاً نا قابل واپسی ہوتی ہے۔یہ قاصد پانی کے بے کار ثابت ہونے کی کہانی کبھی نہیں سناتے۔سیکولر عبرانی اخبارات ایسے پانی کے معجزانہ اثر دکھانے میں نا کامی کی خبریں اکثر شائع کرتے ہیں، خصوصاً جب اسے مہنگے داموں بیچا گیا ہو۔تاہم ایسی خبریں ان سیکولر عبرانی اخباروں کے قارئین اوران اخباروں سے نفرت کرنے والوں میں خلیج کو مزید گہرا کر دیتی ہیں۔ ہیریڈم اپنے اخباروں میں نہ صرف سیکولر پریس پر حملے کرتے ہیں بلکہ سیکولر اسرائیلی یہودیوں کے حوالے سے اپنی عمومی نفرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر تک اسرائیلی یہودی عوام ہیریڈی اخباروں پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر سے عوامی دلچسپی میں اچھا خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ہیریڈی معاملات کے ایک ممتاز ترین اسرائیلی ماہر ڈووالبام نے اس مسئلے پر عبرانی میں دو مضامین لکھے ہیں۔ ایک مضمون ''یدیوت اہرونوٹ'' نامی اخبار کے 30 اگست 1996ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، جبکہ دوسرا مضمون دو ماہی رسالے ہا ئین ہاشویٹ (ساتویں آنکھ) کے جولائی ـــــ اگست کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔اس رسالے کواسرائیلی ڈیموکریٹک انسٹی ٹیوٹ شائع کرتا ہےاور یہ رسالہ اسرائیلی اخبارات کے تجزیوں کے لیے وقف ہے۔البام نے یدیوت اہرونوٹ میں ہیریڈی پریس کی ساخت پر بحث کی ہے اور پھر ہا ئین ہاشویٹ میں سیکولر اسرائیلی یہودیوں کے حوالے سے ہیریڈی رجحان پر بحث کی ہے۔البام کے بقول اسرائیلی سپریم کورٹ کے صدر اہرون بارک پر ہیریڈی پریس کے شدید حملے نے عوامی توجہ میں اضافہ کیا۔ ہیریڈی پریس نے بارک کے بارے میں لکھا کہ وہ ''ہیریڈی عوام کا بدترین دشمن ہے۔'' البام نے نشان دہی کی ہے کہ بائیں بازو کے کبوتر نم، اسرائیلی فوج، سیکولر میڈیا اور بہت سے دوسرے سیکولر اداروں اور شخصیات پر ہیریڈی پریس کے حملوں نے عوام میں تھوڑی سی دلچسپی ابھاری تھی۔طویل عرصہ سے اسرائیلی سیکولر جمہوریت کی مقدس ترین علامت تصور کی جانے والی سپریم کورٹ پر حملے نے اکثر سیکولر لوگوں میں دلچسپی پیدا کی۔ وزیراعظم یتزاک رابن پر ہیریڈی پریس کے شدید حملوں کا ایسا اثر نہیں ہوا تھا۔رابن کے قتل سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے ایک بے حد مقبول ہیریڈی ہفت روزے ہاشوا (ہفتہ) نے پیش گوئی کی تھی:

> ''وہ وقت آنے والا ہے جب یہودی رابن اور پیریز کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کریں گے اوران کے سامنے پھانسی گھاٹ یا پاگل خانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ یہ شیطانی جوڑا یا تو پاگل ہو چکا ہے یا غدار۔رابن اور پیریز یہودیوں کے حافظے میں بدترین قسم کے یہودیوں کی حیثیت سے نقش ہو چکے ہیں۔ وہ یہودیت سے منحرف ہو جانے والوں یا نازیوں سے تعاون کرنے والے یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔''

البام نے اس موقف پر زور دیتے ہوئے، کہ بارک اور سپریم کورٹ پر حملے کے بعد سیکولر اسرائیلی یہودیوں کی دلچسپی ہیریڈی پریس میں بڑھی ہے، لکھا ہے کہ ہیریڈی پریس میں اپنی زندگیوں کو غلیظ اور اپنے بچوں کو نشئی قرار دیے جانے پر سیکولر اسرائیلیوں کی کثیر تعداد بے عزتی محسوس کرتی ہے۔البام لکھتا ہے:

''ہیریڈی صحافی سیکولر معاشرے کے عام واقعات کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ قتل، شراب نوشی اور منشیات خوری کو سیکولر یہودی معاشرے کی خصوصیات بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سیکولر یہودیوں پر انتہائی پست لفظوں میں بہتان باندھتے ہیں۔ ان کا مقصد سیکولر یہودی طرز زندگی کی مکمل طور پر تذلیل کرنا ہے۔''

ہیریڈی صحافیوں کی اس طرح کی تحریروں کو نازی پروپیگنڈے سے مشابہہ قرار دینا دشوار نہیں ہے۔

ہیریڈی پریس کی ساخت مخصوص طرز کی ہے۔ الیام نے ربی شاک کی سربراہی میں کام کرنے والے ڈیگال ہاتورا دھڑے کے اخبار یاتید نیمین کا حوالہ دیا ہے، جو کہ ہیریڈی آئیڈیالوجی کے تناظر میں ایک رجحان ساز اخبار ہے۔ الیام واضح کرتا ہے کہ پانچ ربیوں پر مشتمل کمیٹی یاتید نیمین کی کڑی نگرانی کرتی ہے۔ اس کمیٹی کے پانچوں اراکین کو ربی شاک منتخب کرتا ہے جبکہ اس کا سربراہ ربی ناتن زوہا ہوسکی ہے۔ سبت کے علاوہ ہر رات کمیٹی کا کم از کم ایک ربی اخبار کے دفتر میں موجود ہوتا ہے۔ ہر اشتہار، ہر اعلان اور ہر مضمون کا ہر لفظ ڈیوٹی پر موجود ربی یا ربیوں کی منظوری لے کر شائع کیا جاتا ہے۔ ایڈز اور ٹیلیویژن جیسے کچھ خاص الفاظ کو شائع کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ''ریڈکراس'' کی اصطلاح کو، عیسائیت سے نسبت کی وجہ سے، استعمال کرنے پر خصوصی پابندی ہے۔

یاتید نیمین کے مضامین میں اکثر اوقات مخالف ہیریڈی دھڑوں پر شدید حملے کیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ شاس پارٹی کی معاشرتی تقریبات کے حوالے سے کوئی بھی اشتہار شائع کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس پابندی کی اہمیت اس وقت عیاں ہوئی جب ربی شاک اور شاس پارٹی کے مابین جاری روحانی جنگ میں بظاہر وقفے کے دوران اخبار کے ایک ایڈیٹر نے آریہ دیری کے بیٹے کی بار متزوا کا اشتہار چھاپنے کی جسارت کر ڈالی۔ (آریہ دیری کنیسٹ کا رکن اور شاس کا ایک اہم لیڈر رہے)۔ ربی شاک نے اس اشتہار کو دیکھا تو آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے کمیٹی کے سربراہ کو بری طرح پھٹکارا۔

دوسرے ہیریڈی اخباروں میں بھی شائع ہونے والی ہر تحریر کو روحانی سنسر شپ کمیٹیاں منظوری دیتی ہیں۔ الیام لکھتا ہے: ''ہیریڈی پریس میں فریڈم آف پریس ایک انجانا تصور ہے۔'' الیام کے بقول ہیریڈی ایڈیٹر ایک مختلف طرز کی آزادی کا اعلان کرتے ہیں: ''کچھ خاص باتوں کو جاننے کا ہمارا عوام کو حق نہیں ہے۔'' سنسر کرنے والے ربی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ عوام کو کیا نہیں جاننا چاہیے۔

ہیریڈی اخبارات سیکولر یہودیوں کے حوالے سے عمومی ہیریڈی رجحان کی عکاسی کرتے ہوئے اکثر ایسے دلائل سے بھرپور مضامین شائع کرتے ہیں، جو کہ سامیت دشمنوں کے سارے یہودیوں کے خلاف دلائل کی یاد دلا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر الیام نے فروری 1996ء کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جس میں اسرائیل فرائڈمین نے اس موقف کو زور دے کر پیش کیا تھا کہ اسرائیل کی سرزمین صرف ہیریڈم سے تعلق رکھتی ہے اور سیکولر یہودیوں اور فلسطینیوں کو اسرائیل سے نکل جانا چاہیے۔ فرائڈمین سیکولر یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے

لکھتا ہے "یہاں سے دفع ہو جاؤ...... ہم تمہیں دوستانہ انداز میں کہہ رہے ہیں۔ دفع ہو جاؤ۔ جرائم پرور امریکی معاشرہ شراب اور منشیات کے عادی اور کانوں میں بالیاں لٹکانے والے مجرم سیکولر نوجوانوں کو بآسانی جذب کر لے گا۔ وہ ہمارا خون پینے والی بلائیں ہیں۔ انہیں ہمارے وطن میں رہنے کی جسارت کیسے ہوئی۔ الیام نے ایک اور مضمون میں یاحید نیمین کے ایک ایڈیٹر ناتھن زیوگراسمین کا حوالہ دیا ہے، جس نے یورپی ملکوں میں نیونازی ازم کے ابھار کو "رابن حکومت کا اثر" قرار دیا تھا۔ گراسمین نے تمام کبوتزم کو نازی ادارے قرار دیا اور تجویز دی کہ "نیورمبرگ کے مثال کے تحت ان پر بھی مقدمہ چلایا جائے۔"

ہیریڈم کا مطالبہ ہے کہ دوسرے یہودی، کم از کم عوام میں ان کے احکامات کی پیروی کریں۔ ہیریڈی مطالبے، جن کی تائید اکثر روایت پرست یہودی کرتے ہیں، اسرائیلی سیاست میں سکینڈل کھڑے کرتے رہتے ہیں۔ کسی بھی دوسری وجہ کی نسبت مذہبی سکینڈلوں کی وجہ سے اسرائیلی حکومت زیادہ بحرانوں کا شکار ہو چکی ہے۔ ہیریڈم اپنے سیاسی مفادات کے لیے کچھ خاص علامتوں کے استعمال پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے اس اصرار نے اسرائیلی سیاست میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسرائیل سے باہر رہنے والے یہودیوں کی کثیر تعداد اور بہت سے اسرائیلی یہودی مذہبی علامتوں کے استعمال کے ہیریڈی مطالبوں کی تائید کرتے ہیں۔ ایسی تائید سے سکینڈل رونما ہوئے ہیں۔ 1992ء میں خزاں کے موسم میں ایک ایسا ہی سکینڈل رونما ہوا تھا اور کئی مہینوں تک اسرائیلی سیاست پر چھایا رہا تھا۔ اس سکینڈل کے دوران ہیریڈی پارٹی شاس نے رابن حکومت سے نکل جانے کی دھمکی دی تھی، جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ رابن فلسطینیوں سے معاملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا یا شامیوں کو رعائتیں دیئے جانے کا امکان تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی وزیر تعلیم شلا میت ایلونی کی نزارتھ کے دورے کے دوران ایک عرب ریستوران میں ایسی خوراک کھاتے ہوئے تصویر شائع ہوئی تھی، جو کہ پاک خوراک کی یہودی مذہبی علامت کی پامالی تھی۔ ایلونی معاملے سے صرف چھ ماہ پہلے کنیسٹ کے ایک رکن کا سکینڈل رونما ہوا تھا۔ پائیل مدایان کی تصویر شائع ہوئی کہ وہ یوم کپور کو نہانے کے لباس میں تل ابیب کے ایک ساحل پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ تمام مذہبی سیاسی جماعتیں مشتعل ہو گئیں اور انہوں نے اس عمل کو "یہودیت کو ناپاک کرنا" قرار دیا۔ لیبر پارٹی کے روایتی مذہبی اراکین پارلیمنٹ کی تقریریں سن کر وزیر اعظم رابن نے بھی اس الزام کو دہرایا۔

شلا میت ایلونی نے اپنی وزارت کے دوران لاتعداد ایسے بیان دیئے جنہیں یہودیت کی علامتوں کے خلاف اور یوں توہین آمیز قرار دیا گیا۔ ان بیانات سے سکینڈل رونما ہوئے۔ مثال کے طور پر عرب ریستوران میں کھانا کھانے والے سکینڈل سے ایک مہینے پہلے ایلونی نے عوامی سطح پر تسلیم کیا کہ دنیا کے چھ دن میں تخلیق نہ ہونے کا مفروضہ درست ہے۔ اس نے عوامی سطح پر یہ متنازعہ بیان بھی دیا کہ ریاست کے سیکولر سکولوں میں دی جانے والی یہودیت کی تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی لائی جانی چاہیے۔ (وہ ریاست کے مذہبی سکولوں میں یہودیت کی تعلیم کو جوں کا توں رکھنے کی خواہاں تھی)۔ ایلونی نے جب عوامی سطح پر بائبل کی کچھ شخصیات پر نکتہ چینی کی تو لوگوں میں بہت زیادہ اشتعال پیدا ہوا۔ ایک محترم اسرائیلی خاتون صحافی ریتی ٹالمور نے ہداشوٹ اخبار کے 14 اکتوبر

1992ء کے شمارے میں لکھا:

> ایلونی گیلیلیو والے انجام سے بال بال بچی ہے۔ کچھ نام نہاد روشن خیال سیکولر یہودی سرگوشیاں کرتے کہ "بے شک وہ ٹھیک کہ رہی ہے، تاہم عوام میں بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" عظیم یہودی محتسب خوش ہوئے کہ انہوں نے کمزور ذہن والے کافروں کے خلاف ایک اور فتح پالی ہے۔

جب رابن نے ایلونی کو مجبور کیا کہ وہ شاس پارٹی کے روحانی سربراہ ربی اوویدیا یوسف کے نام کھلے خط میں عوامی سطح پر معافی مانگے تو یہودی محتسبوں نے ایلونی کو زیادہ ہراساں کیا۔ ایک مشہور اسرائیلی صحافی یوئیل مارکس نے 13 نومبر 1992ء کے ہارٹز میں شائع ہونے والے مضمون میں لکھا:

> جیسا کہ سب جانتے ہیں، ایسے معاملات میں ہر رعایت سے مزید رعایتوں کا مطالبہ جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی مذہبی مطالبوں کے آگے لیبر اور میریتز پارٹیوں کے اراکین کی سپراندازی نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ رابن نے ایک انٹیلی جنس رپورٹ پر اقدام کرنے کا وعدہ کیا، جو اسے این آر پی نے بھجوائی تھی اور جس میں بتایا گیا تھا کہ ایلونی نے سبت کی توہین کی ہے اور اسرائیل میں اور اسرائیل کے باہر غیر کوشر غذا کھائی ہے۔ کنیسٹ میں لیبر پارٹی کے چیئرمین (ایلی دایان) نے عوامی سطح پر ایلونی اور کنیسٹ کے رکن یائیل دایان کی مذمت کی۔

این آر پی نے معاوضے پر سراغرسانوں کی خدمات حاصل کی تھیں کہ وہ یہ پتا چلائیں کہ کون کون سے وزیر یہودی مذہب کے احکامات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اس طرح کی جاسوسی رابن اور پیریز کے ادوار اقتدار میں بھی جاری رہی۔ جب رابن اور پیریز وزیر اعظم تھے تو انہیں ان سراغرسانوں کی رپورٹیں باقاعدگی سے ملتی تھیں اور وہ مسلسل کوشش کرتے تھے کہ ان کے وزراء عوامی سطح پر کسی مذہبی قانون کو پامال نہیں کریں۔

ہارٹز میں شائع ہونے والے مضمون میں یوئیل مارکس نے بہت سے ایسے خدشات کا اظہار کیا، جن میں اسرائیلی یہودی عوام کی اچھی خاصی تعداد بھی مبتلا ہے:

> ہم ایسے مطالبات کی بھی توقع کر سکتے ہیں کہ ہر وزیر اور کنیسٹ کا رکن اپنے ساتھ ایک کشروت انسپکٹر رکھے، جو کہ اس کام پر کل وقتی طور پر مامور ہو۔ نیز اسرائیل کے ہر شہر اور ہر گلی میں ایسے انسپکٹر متعین کیے جائیں، جو اس امر پر نگاہ رکھیں کہ کشروت غذا ہی کھائی جا رہی ہے۔ یہ مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ بدی پر قابو پانے والے سکواڈ بنائے جائیں جو گھروں پر چھاپے مار کر اس امر کو یقینی بنائیں کہ کشروت غذا ہی کھائی جا رہی ہے یا خدا معاف کرے کوئی عورت اپنے خاوند کے ساتھ ماہواری کے ناپاک ایام کے دوران ہم بستری تو نہیں کر رہی۔ (یہ وقفہ آٹھ سے چودہ دن تک چلتا ہے)۔

دوسرے اسرائیلی صحافیوں نے بھی ایسے ہی خدشات کا اظہار کیا اور اپنے مضامین میں مارکس سے آگے نکل گئے۔ کچھ نے نہ صرف مذہبی بلکہ سیکولر یہودیوں پر بھی شدید تنقید کہ جو اپنے اوپر ہونے والے حملوں کے باوجود خاموش رہے اور ان کے رویے کی وجہ سے مذہبی یہودیوں کو اپنی برین واشنگ کی مہم منظم انداز میں چلانے کا موقعہ ملا۔ اکثر اسرائیلی یہودی، جن کی آراء کی ترجمانی ان صحافیوں نے کی تھی، ان مذہبی فرقوں کی سرگرمیوں اور فتوحات کو اسرائیل میں ایک ہمہ گیر یہودی ''خمینی ازم'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔

ایلونی سکینڈل پر بحث اسرائیلی اخبارات میں ہفتوں جاری رہی اور بڑھتے بڑھتے سیاسی ہو گئی۔ ناہوم بیرینا نے 23 اکتوبر 1992ء کے یدیوت اہرونوٹ میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا:

> رابن نے ''امن یا ایلونی'' کا نعرہ لگا کر ایلونی مخالف پروپیگنڈہ کرنے والوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ امن اور ایلونی کی کھانے کی ترجیحات میں بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟............
>
> رابن نے ایلونی کی پارٹی میریتز کے لیڈروں کو چار مرتبہ اپنے دفتر بلا کر انہیں شاس پارٹی کے روحانی سربراہ ربی اوویدیا یوسف کی ایلونی بارے شکایات سے آگاہ کیا۔

23 نومبر 1992ء کے داور میں شائع ہونے والے مضمون میں امیر اورین نے ربی اوویدیا یوسف کی فرمانبرداری اختیار کرنے پر رابن کی مذمت کی نیز ربی کی قوت کو سٹالن سے تشبیہ دی۔ اورین نے لکھا کہ شاس پارٹی اسرائیل میں وہی کردار ادا کر رہی ہے جو لبنان میں شیعہ ادا کر رہے ہیں۔ اورین کے خیال میں اسرائیل ''مشرقِ وسطیٰ کی واحد جمہوریت ہوتا تو درکنار لبنان اور ایران کی نقل کر رہا ہے اور نصف انارکی اور نصف تھیوکریسی کی حامل ریاست بن چکا ہے۔''

ایمنن ابراموورتز نے 23 اکتوبر 1992ء کے ماریو میں شائع ہونے والے مضمون میں ایلونی سکینڈل کو کسی حد تک مختلف موڑ دیا۔ اس نے لکھا:

''ایلونی کے ساتھ مذہبی یہودیوں کے توہین آمیز برتاؤ نے عوام میں اس کے لیے ہمدردی پیدا کر دی ہے۔ ایلونی کو ہراساں کرنے سے مذہبی جوش و خروش، بنیاد پرستی اور جنسیت پرستی کی ایک کراہت انگیز بدبو پیدا ہوئی ہے۔'' ابراموورتز نے رابن پر الزام لگایا کہ اس نے ہراساں کرنے کے اس عمل کو بڑھاوا دیا ہے، تاہم اس نے مزید لکھا کہ ایلونی نے اپنی ساری باتوں اور غیر کوشر غذا کھانے کے باوجود مذہبی اداروں، بالخصوص شاس کے اداروں کو ہر سابقہ وزیر تعلیم سے زیادہ مالی امداد دی ہے۔ ابراموورتز نے لکھا: ''ممکن ہے ایلونی خدا کے بارے میں توہین آمیز باتیں کرتی ہو، تاہم وہ اس کے ماننے والوں کے ساتھ بہت زیادہ فیاضانہ برتاؤ کرتی ہے۔''

لیبر پارٹی کے لیڈروں اور اس کے غیر روایت پرست ہمدردوں نے اوسلو معاہدے پر محولہ بالا خدشات کے حوالے سے کہا کہ امن کے عمل کو تقویت دینے کے لیے ہیریڈم کے مطالبات پورا کرنا ضروری ہے۔ اکثر سیکولر یہودی ان کی اس تجویز سے مطمئن نہیں تھے۔ مارکس نے ہمہ گیر سیکولر رائے کو یوں بیان کیا ہے:

> رابن کی شاس کی چاپلوسی کرنے کی وجہ سیاست ہے۔ لیبر پارٹی کے مذہب کے ماہرین

ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اگر شاس پارٹی نے یہ محسوس کیا کہ وہ دیگر ہیریڈی حلقوں کے دباؤ کو مزید برداشت نہیں کر سکتی تو ممکن ہے وہ اتحاد سے نکل جائے.......... ایسی باتوں کا حاصل یہ ہے کہ لیبر کو انہیں قابو میں رکھنے کے لیے اپنی سی بہترین کوششیں کرنی چاہئیں.......... سیاست اہم ہے، تاہم ضمیر کی آزادی اور ہر شخص کا اپنے عقیدے پر عمل کرنے کا حق کہیں زیادہ اہم ہے۔ یہودی سیکولرازم ایک عقیدہ ہے۔ وزراء جس خام منافقت سے جعلی مذہبیت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اُس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ خود ان کی حکومت غیر مستحکم ہوتی ہے۔ اگر شاس رابن کے اتحاد سے نکلنا چاہتی ہے تو وہ اپنے ربیوں کے حکم پر ایسا کرے گی۔ تب اگر رابن ہیریڈی ٹوپی پہن لے اور ایا ایلونی سر منڈا کر اسے ڈھانپ لے تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (یہاں روایتی یہودیت کے ایک مذہبی حکم کی طرف اشارہ ہے کہ ہر عورت کو شادی سے پہلے اپنا سر منڈوا کر اسے ڈھانپے رکھنا چاہیے۔ ہیریڈی اس قانون پر عمل کروانے کی سخت کوششیں کرتے ہیں۔ بہت سی یہودی مذہبی عورتیں صرف اپنے تھوڑے سے بال کٹواتی ہیں اور باقیوں کو وگ سے ڈھانپ لیتی ہیں۔ اکثر سیکولر یہودی عورتیں اس قانون پر غصے کا اظہار کرتی ہیں)۔''

ہیریڈی ربی اور سیاست دان سوچ سمجھ کر سیکولر خاتون سیاستدانوں کو حملوں کا اولین ہدف بناتے ہیں، حالانکہ وہ مذہبی قوانین کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے سیکولر مرد سیاستدانوں کو بھی زیادہ نہیں تو ان کے برابر ہی تنقید کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ہیریڈم سیاستدان یہودی عورتوں کو جادوگرنی، کتیا اور چڑیل کا خطاب مسلسل دیتے تھے۔ اگرچہ ہیریڈم کی زبان قدرے زیادہ غیر شائستہ ہے تاہم ان کی سوچ عورتوں کے حوالے سے روایتی یہودیت کے وسیع البنیاد موقف کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ موقف نہ صرف عورتوں کو حقوق سے محروم کرتا ہے بلکہ ان کی تذلیل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کم تالمودی تعلیم پائے ہوئے یہودیوں کے لیے ایک ابتدائی نصابی کتاب کنٹر ورشلہان ایروک (شلہان ایروک کا خلاصہ) کے باب 3 قانون 8 میں آیا ہے: ''مرد کو دو عورتوں، دو کتوں یا دو سؤروں کے درمیان نہیں چلنا چاہیے۔ اسی طرح دو مردوں کو کسی عورت، کتے یا سؤر کو اپنے درمیان نہیں چلنے دینا چاہیے۔''

دس سے بارہ برس کی عمر کے تمام ہیریڈی لڑکے اس قانون کو پڑھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ (ہیریڈی علاقوں میں کتے بہت ہی کم ہوتے ہیں اور سؤر تو ایک بھی نہیں پایا جاتا)۔ روایتی یہودیت عورتوں کو سیاست اور ایا کسی بھی ایسی عوامی سرگرمی میں غیر اہم کردار ادا کرنے تک سے روکتی ہے، جس میں وہ مردوں سے نمایاں دکھائی دے سکتی ہوں۔ عورتوں کے بس یا ٹیکسیاں چلانے پر پابندی ہے، وہ ذاتی کاریں صرف اس صورت میں چلا سکتی ہیں کہ ان کے خاندان کے مردوں یا دوسری عورتوں کے علاوہ کوئی اور کار میں موجود نہیں ہو۔

ہیر یڈی علاقوں میں اس اور بہت سے ایسے ہی قوانین پر عمل کیا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں "بے حیائی والا" لباس پہننے والی عورتوں کی تذلیل کی جاتی ہے اور ایا ان پر حملے کیے جاتے ہیں۔ ہیر یڈی علاقوں کے باہر رہنے والے روایت پرست مذہبی یہودی مرد، جو کہ تکلیف دہ مذہبی احکامات پر عمل نہیں کرتے، سیاست میں عورتوں کی مخالفت کرنے والے ہیر یڈم سے دو ہاتھ آگے نکل چکے ہیں۔ یہ روایت پرست مذہبی مرد عورتوں کی سیاست میں شمولیت کو اپنے خاندانوں میں اپنی برتری کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں۔

تالمود میں عورت کے خلاف بہت ہی سخت باتیں موجود ہیں۔ ایک جگہ آیا ہے "عورت غلاظت سے بھری بوری ہے۔" جدید عبرانی میں لکھے گئے تالمودی انسائیکلوپیڈیا میں "عورتوں کی فطرت اور رویے" کے عنوان سے پورا ایک حصہ وقف کیا گیا ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا جدید عبرانی میں لکھا گیا ہے لہٰذا ہر تعلیم یافتہ یہودی اسے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کے اس حصے میں لکھا گیا ہے کہ مردوں میں عورتوں سے زیادہ شہوت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دلیل یہ دی گئی ہے کہ مردوں میں شہوت زیادہ ہوتی ہے اسی لیے وہ طوائفوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہلاکا میں ایسی عورت کو زیادہ سخت سزا سنائی گئی ہے جو اپنے خاوند کی جنسی خواہش پوری کرنے سے انکار کرے جبکہ اپنی بیوی کی جنسی خواہش پورا کرنے سے انکاری مرد کی سزا کم رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرد کو تو اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے کی اجازت ہے لیکن عورت کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے ہونے والے خاوند کو دیکھے مزید برآں یہودی مرد اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھنے کے بعد قاصد کے ذریعے اس سے شادی کر سکتا ہے۔ یہودیوں کی لوک کہانیوں میں اس عمل کے بہت سے حوالے ملتے ہیں۔

ہلاکا میں عورت کے تالمود اور ایا بائبل پڑھنے پر پابندی لگائی گئی ہے، جس پر ماضی میں عمل ہوتا تھا اور جو آج بھی بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ روایتی یہودیت میں تورات کا پڑھنا بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہر نیک مرد یہودی کا فریضہ ہے کہ وہ دن رات کے کسی حصے میں، چھٹیوں اور کام کے دنوں میں تھوڑی بہت تورات ضرور پڑھے۔ تالمود کا ایک بنیادی قانون عورتوں کو وقت سے آزاد فریضے ادا کرنے کا پابند بناتا ہے۔ مثال کے طور پر عورتوں کو سبت یا چوبیس گھنٹوں پر محیط ایسی ہی مقدس تعطیلات منانے کا حکم ہے۔ دوسری طرف عورتوں کو نئے سال کے موقع پر بجایا جانے والا شوفر (مینڈھے کا سینگ) سننا فرض نہیں ہے، کیونکہ اس کی آواز مختصر وقت تک رہتی ہے، لہٰذا اسے وقت سے آزاد تصور نہیں کیا جاتا (اس قانون کے چند استثنا ہیں)۔ عورت کو ایسے کام کرنے کی اجازت ہے، جو اس پر فرض نہیں ہیں، لہٰذا وہ نئے سال کے موقعے پر بجائے جانے والے قرنا کی آواز سن سکتی ہے۔ اس قانون سے مرد کے مقابلے میں عورت کی مذہبا کمتری واضح ہوتی ہے، کیونکہ تالمود کے ایک اور حکم کے مطابق جو شخص اپنے فرائض ادا کرتا ہے، اسے ایسے شخص کی نسبت بہت زیادہ صلہ ملے گا جو کہ خود پر فرض نہ کیے گئے کام کرے۔

روایتی یہودیت کے مطابق جو عورت نئے سال کے موقعے پر سینا گوگ جاتی ہے اور قرنا پھونکے جانے کی آواز سنتی ہے، اسے یہی عمل کرنے والے مرد کی نسبت خدا کم صلہ دے گا۔ کیونکہ عورت پر قرنا کی آواز سننا

فرض نہیں ہے جبکہ مرد پر فرض ہے۔ تاہم تالمود میں Tractate Kiddushin (صفحہ 34 اے) پر آیا ہے کہ عورتوں پر "تورات پڑھنا" فرض نہیں ہے، حالانکہ یہ وقت سے آزاد فریضہ ہے۔ یہ قانون ہلاکا کا حصہ ہے۔ بعد ازاں اس قانون کا مطلب یہ لیا گیا کہ عورتوں کو صرف یہ جاننا چاہیے کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ چنانچہ مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ عورتوں کو مقدس مطالعات کے کن حصوں سے فیضیاب ہونے کی اجازت ہے اور کن حصوں سے فیضیاب ہونے کی اجازت نہیں ہے؟ میمون نے اس سوال کا جواب تالمود کے کئی حوالوں کے ساتھ دیا ہے۔ وہ اپنی کتاب "تورات پڑھنے کے قوانین" (باب اول، قانون 13) میں لکھتا ہے:

> تورات پڑھنے والی عورت کو خدا صلہ تو دیتا ہے لیکن یہ تورات پڑھنے والے مرد کو ملنے والے صلے سے کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر تورات پڑھنا فرض نہیں ہے اور ہر ایسا شخص جو خود پر فرض نہ کیے گئے کام کرتا ہے، کم صلہ پاتا ہے بہ نسبت ایسے شخص کے جو کہ خود پر فرض کیے گئے کام کرتا ہے۔ تاہم عورت کو صلہ ضرور ملتا ہے۔ داناؤں نے ایک شخص کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو تورات کی تعلیم نہ دے کیونکہ بیشتر عورتیں تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتیں اور وہ ناسمجھی کے باعث تورات کی تعلیم کو بے معنی بنا دیتی ہیں۔ داناؤں نے کہا ہے: "جو شخص اپنی بیٹی کو تورات پڑھاتا ہے وہ اس شخص جیسا ہے جو اپنی بیٹی کو بے مزہ معاملات سکھاتا ہے۔" تاہم یہ قانون صرف تالمود پڑھانے پر عائد ہوتا ہے۔ اگر کسی عورت کو بائبل کی تعلیم دی جائے تو ایسا کرنا اسے بے مزہ معاملات کی تعلیم دینے کے مترادف نہیں ہوگا۔

ہلاکا کے مستند مجموعے شلہان اریوک (یوراہ ڈیہہ، قانون 246، پیراگراف 6) میں اس کا ایک مختصر روپ دیا گیا ہے۔ جدید دور میں ہیریڈم نے ان قوانین کو کسی حد تک جدید بنانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنی لڑکیوں کو تالمود کے آسان حصوں کی تعلیم دی ہے اور اب بھی دیتے ہیں۔ ان میں وہ حصے شامل نہیں ہوتے جن میں ربیوں کی بحثیں ہیں اور جن کو "کمزور نسائی ذہن" کے لیے خطرناک تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہیریڈم بائبل کی پہلی پانچ کتابیں بھی اپنی لڑکیوں کو پڑھاتے ہیں لیکن اعلیٰ ترین درجے والے اور انتہائی سنجیدہ تبصروں کی تعلیم صرف لڑکوں کو دی جاتی ہے۔ ہیریڈم اپنے سکولوں میں اس امر کا سختی سے اہتمام کرتے ہیں کہ لڑکیوں اور لڑکوں کو الگ الگ رکھا جائے نیز یہ کہ لڑکیاں سکول کے میدان میں کھیلنے والے لڑکوں کو دیکھ نہ سکیں۔

لڑکپن اور جوانی میں تالمود کی مکمل تعلیم حاصل کرنے والے بہت سے اسرائیلی یہودیوں نے بعد ازاں عورتوں کے حوالے سے آرتھوڈوکس یہودیت کے رویے پر سخت اشتعال آمیز ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ان میں سے کچھ یہودیوں نے مضامین لکھے ہیں جو کہ اسرائیلی عبرانی اخبارات میں شائع ہوئے ہیں، تاہم ان کا ترجمہ انگریزی میں کبھی نہیں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اسرائیل کے مشہور صحافی کا دید لیپر نے نوجوانی میں ایک یشیوا میں تعلیم حاصل کی تھی اور بعد میں سیکولر بن گیا تھا۔ اس نے 18 اپریل 1997ء کے ہائر میں شائع ہونے والے

اپنے مضمون بعنوان ''عورت: غلاظت سے بھری بوری'' میں لکھا:

مار پیٹ، جنسی درندگی، سفاکی، حقوق سے محرومی، عورت کا صرف ایک جنسی تسکین دینے والی شے کی طرح استعمال .... تم ان سب باتوں کو تالمود میں پا سکتے ہو............ دو ہزار برسوں سے عورتوں کو یہودی مذہب (آرتھوڈوکس یہودیت) میں ایک اچھا مقام حاصل ہے۔ یہ اس مقام سے مختلف ہے جیسا کہ ربی بیان کرتے ہیں۔ ہلاکا کے مطابق جانوروں اور مویشیوں کی طرح عورت کا مقام کوڑے کا ڈھیر ہے۔ یہودی مذہب (آرتھوڈوکس یہودیت) کے مطابق ایک مرد بیوی کہلانے والی غلام عورت کو محض کھانے اور لباس کے عوض جنسی عمل کے لیے خریدتا ہے۔''

اس قسم کے مطبوعہ مضامین اور عورتوں کو ربیوں کی طرف سے ہراساں کرنے کی رپورٹوں سے نہ صرف اسرائیلی یہودی معاشرے کی دھڑے بندی کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ انہوں نے ہیریڈم کے لیے سیکولر یہودیوں کی دشمنی میں خاصا اضافہ کر دیا ہے۔

اسرائیلی یہودی معاشرے کے بہت سے حصوں میں ہیریڈم نے اپنی علیحدگی جاری رکھی ہوئی ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے یہودی ہیریڈی احکام پر عمل کریں۔ اس کی عمدہ عکاسی میڈیشن کے شعبے کی ایک مثال سے ہوتی ہے۔ یدیوت اہرونوت کے 25 دسمبر 1995ء کے شمارے میں شائع ہونے والے مضمون میں ڈوو الیام نے دو ہفتے پہلے اسرائیلی وزارتِ صحت کو دی گئی ہیریڈم کی ایک درخواست پر اظہارِ خیال کیا تھا:

''میڈیسن بائی لا'' نامی تنظیم کے سربراہ ربی یہوشوا شائمر گر نے مذہبی یہودیوں کے لیے رعایت کی بظاہر معصومانہ درخواست دی ہے۔ طریقۂ کار یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی مریض کو خون دیتا ہے تو اسے بلڈ بنک میں خون دے کر رسید لینا ہوتی ہے جبکہ درخواست میں کہا گیا ہے کہ لوگوں کو ذاتی طور پر خون دینے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر خون کا عطیہ دینے والے اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ ہسپتالوں یا فرسٹ ایڈ سٹیشنوں کو اپنا خون خاص مریضوں کے لیے ہی دیں۔

ربی شائمر گر اور دوسرے اہم ربیوں نے دلیل دی کہ ہیریڈم جو مجموعی طور پر خون کا عطیہ نہیں دیتے اس اقدام کے بعد اپنے رویے میں تبدیلی کا مطالبہ مان لیں گے۔ الیام نے اپنے مضمون میں اس درخواست کے پسِ پردہ دیگر محرکات بھی بیان کیے تھے:

سطح کے نیچے ایک اور مکمل طور پر مختلف مسئلہ موجود ہے جو ربیوں کو وزارتِ صحت تک لے گیا ہے۔ حالیہ برسوں میں ہیریڈی مذہبی قانون دانوں کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا ہے کہ ''کیا ایک نیک یہودی مذہبی قوانین پر عمل نہ کرنے والے یہودی یا کسی غیر یہودی کا خون لگوا سکتا ہے؟'' ہیریڈی ربیوں کو خدشہ ہے کہ کسی سیکولر یہودی کا

''داغدار'' خون یا کسی غیر یہودی کا خون نیک یہودی پر برا اثر نہ ڈالے اور خدا مخالف کرے کہیں اس کے یہودی مذہبی قوانین پر عمل کرنے کے معمول کو نقصان نہ پہنچائے۔

محولہ بالا درخواست سے کئی ماہ پہلے ربی اویدیا یوسف نے اپنی نئی کتاب Questions and Answers— Statements میں اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا تھا۔ ''ممنوعہ (یعنی غیر کوشر) خوراک سے بننے والا خون، خون لگوانے والے یہودی پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔ یہ بری صفات بھی پیدا کرسکتا ہے مثلاً سفاکی اور/یا بے حیائی...... چنانچہ جس نیک یہودی کو خون لگوانے کی فوری ضرورت تو ہو مگر کسی نیک یہودی کا خون ملنے کا انتظار کرنے میں خطرہ نہ ہو تو اسے انتظار کرنا چاہیے۔'' ربی یوسف اعضا بدلوانے کے ضرورت مند نیک یہودیوں کو بھی یہی ہدایت دیتا ہے۔ وہ انہیں صرف نیک یہودیوں کی طرف سے عطیہ کیے گئے اعضا قبول کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اس ہدایت سے اسرائیل کے ربیوں میں ایک ایسی سنجیدہ بحث پھوٹ پڑی کہ اکثر سیکولر یہودی حیران رہ گئے۔ الیام نے اپنے ایک اور مطبوعہ مضمون میں بتایا ہے کہ اسرائیل کے ایک سابق چیف ربی مورڈیکائی ایلیا ہونے ربی یوسف سے اختلاف کیا اور کہا: ''جب ایک سیکولر یہودی پیدا ہوتا ہے تو وہ کوشر خون کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں وہ جتنی بھی ممنوعہ غذائیں کھاتا ہے وہ تحلیل ہو کر اس کے خون میں بہت معمولی حد تک رہ جاتی ہیں۔'' تاہم غیر یہودیوں کے حوالے سے ربی ایلیا ہونے ربی یوسف سے کافی حد تک اتفاق کیا اور کہا کہ مذہبی یہودیوں کو ان سے خون کا عطیہ لینے سے گریز کرنا چاہیے۔ ربی ایلیا ہو غیر یہودیوں سے یہودیوں کے خون لینے کو مکمل طور پر ممنوع قرار نہیں دیتا۔ وہ لکھتا ہے:

> یہودیوں کو خاص موقعوں پر اجازت ہے کہ وہ غیر یہودی خون لگوا سکتے ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ ایسا خون ان کے یہودی خواص اور روح کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ خون آہستہ آہستہ منتقل ہوتا ہے اور یہودی بدن میں گردش کرنے والے خون کے مقابلے میں بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ تاہم جب ممکن ہو تو یہودیوں کو ایسا خون لینے سے گریز کرنا چاہیے۔''

آخر ربی شاعمر گر نے تسلیم کر لیا کہ اس نے انہیں ہدایات کی بنیاد پر درخواست دی تھی: ''اس حوالے سے ہیریڈی کمیونٹی کو ایک مسئلہ درپیش ہے۔ ہیریڈم کے لیے کوشر غذا کھانے والے یہودی کا خون اس یہودی کے خون کے مقابلے میں ترجیح کے قابل ہے جو غذا کے قوانین پر عمل نہیں کرتا۔'' دیگر ہیریڈی ربی اس سے متفق تھے۔ ربی لیوی یتزاک ہالپیرین نے جو کہ سائنسی مذہبی انسٹی ٹیوٹ برائے یہودی قانونی مسائل کا سربراہ ہے، واضح کیا: ''غیر یہودیوں یا ممنوعہ غذائیں کھانے والے یہودیوں کے خون کے عطیات ایک مسئلہ ہیں۔ یہودی مذہبی قانون کہتا ہے کہ کسی یہودی بچے کو غیر یہودی عورت کا دودھ نہیں پلایا جانا چاہیے کیونکہ اس کے خون میں ممنوعہ غذائیں شامل ہوتی ہیں جو کہ یہودی بچے کو ناپاک کر سکتی ہیں۔'' ایسی باتوں نے سیکولر یہودیوں کو بے حد مشتعل کر دیا اور اسرائیل میں طب کے پیشے سے منسلک افراد کی اکثریت نے ان باتوں کی زبردست مخالفت کی۔

1994ء میں ربی شائمبر گر نے ایک ایسی ہی درخواست دے کر تنازعہ بھڑکایا اور سکینڈل کو جنم دیا تھا۔
وہ اسرائیل ٹرانسپلانٹ ایسوسی ایشن کے سینئر فزیشنز سے ملا اور ان سے اعضا عطیہ کرنے پر عائد امتناع کے حوالے سے بحث کی۔ اسرائیل کے ہیریڈی یہودی اپنے رشتہ داروں کی لاشوں کے اعضا لگوانے اور یا اعضا دینے سے انکار کرتے ہیں۔ اس مسئلے پر ہیریڈی موقف بہت سے لوگوں کو مذہبی وجوہات سے نہیں بلکہ اوہام کی وجہ سے متاثر کرتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل میں اعضا کی منتقلی کا انتظام کرنا دشوار ہے۔ سرجن ہیریڈی ربیوں سے اکثر درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے پیروکاروں کو آمادہ کریں کہ زندگی بچانے کے لیے اپنے رشتہ داروں کی لاشوں کے اعضا کو ٹرانسپلانٹ کرنے دیا کریں۔ سرجن اپنے موقف کے حق میں یہودی جان بچانے کو ترجیح دینے کے یہودی مذہبی قانون کو استعمال کرتے ہیں۔ ربی شائمبر گر نے بحث کے دوران شرط عائد کی کہ صرف ایک ہیریڈی ربی ہی اس طرح کے ٹرانسپلانٹ کی اجازت دے سکتا ہے۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''یہودی مذہبی قانون کہتا ہے کہ یہودی اعضا کو غیر یہودیوں یا نیک عمل نہ کرنے والے یہودیوں کو لگانا منع ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہودیوں کے اعضا عربوں کو لگانا ہر صورت میں منع ہے، کیونکہ وہ سب یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں۔'' جب ربی شائمبر گر سے نیک یہودی کی تعریف پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ ہر یہودی کی حیثیت کا تعین ایک ربی کو کرنا چاہیے۔ شائمبر گر کی درخواست کو رد کر دیا گیا تھا۔

بہت سے غیر ہیریڈی ربی کسی یہودی کی جان بچانے کے لیے کسی غیر یہودی کا کوئی عضو اسے لگانے کی اجازت دیتے ہیں۔ تاہم وہ کسی یہودی کا کوئی عضو کسی غیر یہودی کو لگانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ کچھ اہم ربی طبی معاملات پر یہودیوں اور غیر یہودیوں کے درمیان موجود اختلافات پر بحث کرتے اور فیصلے سناتے سناتے بہت آگے نکل گئے۔ مثال کے طور پر ہبد تحریک کے ایک بااثر رکن اور نابلوس کے نزدیک واقع ایک یشیوا کے سربراہ ربی یتزاک گنسبرگ نے 26 اپریل 1996ء کے ''جیوئش ویک'' میں شائع ہونے والے مضمون میں، جو کہ ہارتز نے بھی اسی روز شائع کیا تھا، اس رائے کا اظہار کیا: ''اگر ایک یہودی جسم کا ہر خلیہ الوہیت کا حامل ہے اور یوں خدا کا جزو ہے تو پھر ڈی این اے کا ہر ریشہ خدا کا جزو ہے۔ چنانچہ یہودی ڈی این اے خاص ہوتا ہے۔'' ربی گنسبرگ نے اس بیان سے دو نتائج اخذ کیے ہیں: ''اگر کسی یہودی کو جگر کی ضرورت ہو تو کیا وہ خود کو بچانے کے لیے کسی معصوم غیر یہودی کا جگر لے سکتا ہے؟ شاید تورات اس کی اجازت دیتی ہے۔ یہودی زندگی لامحدود قدر کی حامل ہے۔ غیر یہودی زندگی کے مقابلے میں یہودی زندگی زیادہ مقدس اور منفرد ہے۔'' یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ربی گنسبرگ نے اصحابِ کہف کی غار میں خون کی ہولی کھیلنے والے باروک گولڈ شائن کی تعریف میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں گنسبرگ نے ایک باب اس موضوع پر لکھا تھا کہ یہودی مذہب کی رو سے غیر یہودیوں کی جان لینے والا یہودی قتل کا مرتکب نہیں ہوتا اور یہ کہ انتقاماً معصوم عربوں کو ہلاک کرنا ایک یہودی نیکی ہے۔ کسی بااثر اسرائیلی ربی نے گنسبرگ کے بیانات کی عوامی سطح پر مخالفت نہیں کی، بیشتر اسرائیلی سیاست دان خاموش رہے جبکہ کچھ اسرائیلی سیاستدانوں نے اس کی کھلم کھلا تائید کی۔

حالیہ برسوں میں این آر پی کے زیادہ نیک ارا کین نے ریاستِ اسرائیل کا قانون ہلا کا کو بنانے کے ہیر یڈی مطالبے کی تائید کی ہے۔اس مطالبے کے اہم نکات یہ ہیں:

☆ خدا کی سیاسی حاکمیت کو باقاعدہ اور عدالتی طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔خدا کے سند یافتہ ایجنٹوں یعنی ربیوں کو فیصلہ ساز ہونا چاہیے۔

☆ تمام سماجی اداروں کا نگران ربیوں کو ہونا چاہیے، تمام مسئلے انہیں حل کرنے چاہئیں، تمام معاشرتی خدمات کے حتمی فیصلے انہیں کرنے چاہئیں۔

☆ تمام مطبوعہ، تصویری اور نوائی (Audio) مواد کو سنسر کرنا چاہیے۔

☆ سبت، دیگر مذہبی قوانین، عوامی مقامات پر عورتوں کی مردوں سے علیحدگی نیز عورتوں کے لباس اور طرزِ عمل میں "حیاداری" کو بذریعہ قانون لاگو کیا جانا چاہیے۔

☆ لوگوں پر قانوناً فرض ہونا چاہیے کہ وہ ربیوں کی توہین کرنے والوں کی رپورٹ کریں۔

ہلا کا کے ریاستِ اسرائیل کا قانون ہونے کے ہیریڈی مطالبے کی تھیوکریٹک اور آمرانہ ساخت واضح ہے۔



تیسرا باب

دو بڑے ہیریڈی گروپ

دو بڑے ہیریڈی گروپوں اشکینازی اور مشرقی، جنھیں پہلے سفرڈی کہا جاتا تھا، کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو سمجھنے کے لیے تاریخی پس منظر پر اختصار کے ساتھ نظر ڈالنا ضروری ہے۔ یہودی اپنی ساری تاریخ کے دوران مختلف ملکوں میں بکھرے رہے ہیں۔ چنانچہ اس امر پر چنداں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ بہت سے ملکوں میں الگ الگ یہودی فرقے ابھرے یا ایک ہی ملک کے اندر کئی مختلف یہودی فرقے سامنے آئے۔ 1050ء تک ایک خاص یہودی فرقہ ایسے مرکز کے طور پر موجود تھا، جسے دوسرے فرقے ساری دنیا کے یہودیوں کو جوڑنے والے قوانین اور ہدایات دینے والی اتھارٹی تسلیم کرتے تھے۔ اس طرح کا آخری مرکز عراق میں رہنے والا یہودی فرقہ تھا۔ عراق میں آخری مرکز کے انہدام کے بعد یہودی فرقوں کے باہمی اختلافات بڑھ گئے۔ مثال کے طور پر کچھ فرقوں نے تمام یہودیوں میں مشترک کچھ قدیم عبادات کے ساتھ ساتھ نئی عبادات وضع کر لیں۔ حد تو یہ ہے کہ مختلف فرقوں میں عبادت کے دوران پڑھی جانے والی عبارتوں میں بھی فرق رونما ہو گئے۔ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق مذہبی قوانین بھی، جن پر نیک یہودی کاربند تھے، مختلف فرقوں میں کسی حد تک مختلف ہو گئے۔

دسویں سے بارھویں صدی کے دوران فرانس اور جرمنی میں فرقہ ابھرا یہ فرقہ جارجیا جیسے دور دراز ملکوں کے چھوٹے فرقوں کے سوا باقی سب فرقوں سے زیادہ اختراع پسند بن گیا اور پہلے سے مستحکم روایات سے انحراف کرنے لگا۔ اشکینازی نے جو انحراف کیے وہ مستقل نوعیت اختیار کر گئے۔ مثال کے طور پر آج تک بھی بیشتر نیک اشکینازی یہودی گوشت یا گوشت آمیز ایسی ہر شے کھانے سے انکار کر دیتے ہیں، جو کہ غیر اشکینازی ربیوں کی نگرانی میں تیار ہوئی ہو۔ دوسرے یہودی فرقے کسی دوسرے فرقے کے ربی کی نگرانی میں تیار ہونے والے کھانے کھا لیتے ہیں۔ چنانچہ کسی نیک اشکینازی یہودی سے ملنے گیا ہوا نیک سفرڈی یہودی اس کی تیار کردہ

غذا کھالے گا لیکن ایک نیک سفرڈی یہودی سے ملنے گیا ہوا نیک ایشکینازی یہودی گوشت والی کوئی غذا بلکہ اکثر و بیشتر کوئی بھی شے کھانے سے انکار کر دے گا۔ ایشکینازی کی یہ خصوصیت ان کے مذہبی رویے کے بہت سے دوسرے پہلوؤں سے بھی عیاں ہوتی ہے۔ دوسری طرف سفرڈیوں نے بارہویں صدی میں اپنی طرز کی ایک خصوصیت پیدا کر لی تھی، جس کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ وہ دوسرے یہودیوں سے برتر ہیں۔ سپین اور پرتگال کے رہنے والے سفرڈی یہودیوں نے بالخصوص ''خالص نسل'' کا افتخار گھڑ لیا تھا۔ (عبرانی میں سفرڈی کا مطلب ہوتا ہے سپینی)۔ ان میں سے بیشتر ایشکینازی یہودیوں کے ہاں شادی کرنے کو رد کر دیتے تھے بلکہ ان سے میل جول کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے۔ موسیٰ بن میمون نے جو 1204ء تک زندہ رہا اور ازمنۂ وسطیٰ کا ایک ربی اور عظیم یہودی فلسفی تھا، اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی:

> اپنی روح کی حفاظت کرنا اور ایشکینازی ربیوں کی لکھی ہوئی کتابیں مت پڑھنا۔ یہ لوگ صرف تب لارڈ پر ایمان لاتے ہیں جب سرکے اور لہسن میں پکایا ہوا گوشت کھاتے ہیں۔ ان کا ایقان ہے کہ سرکے اور لہسن کی مہک ان کے نتھنوں میں داخل ہوگی اور انہیں فہم عطا کرے گی کہ لارڈ ان کے قریب ہے.......... اے میرے بیٹے! صرف اپنے سفرڈی بھائیوں کی صحبت اختیار کرنا، جو کہ اہالیانِ اندلسیہ کہلاتے ہیں۔ صرف یہی لوگ ذہین ہیں۔

یہودی ادب میں ایک فرقے کی دوسرے فرقوں سے برتری کا اظہار کرنے والی تحریروں کی کثرت ہے۔ حد تو یہ ہے کہ 1960ء کی دہائی تک بوڑھے سفرڈی ربی اور یروشلم کے دوسرے سفرڈی دستخط کرتے وقت اپنے نام سے پہلے عبرانی میں لکھتے تھے ''خالص ہسپانوی''۔ تاہم ایشکینازی انفرادیت پسندی سفرڈی انفرادیت پسندی سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

انفرادیت پسندی کی جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی وجوہات تھیں۔ ایشکینازی فرقے کے وجود میں آنے سے پہلے تقریباً تمام یہودی بحیرۂ روم کے طاس یا عراق جیسے ملکوں میں رہتے تھے، جو تجارتی راستوں کے ذریعے اس طاس سے جڑے ہوئے تھے۔ دسویں صدی میں بحیرۂ روم کے بیشتر ممالک یا مسلمانوں کے یا بازنطینیوں کے زیرِ حکومت تھے۔ اس علاقے اور ابھرتے ہوئے فیوڈل یورپ کے درمیان ابلاغ بڑی حد تک ناموجود تھا کیونکہ مغربی عیسائی علاقوں میں یونانی اور عربی سے کوئی واقف نہیں تھا تو مشرق میں لاطینی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہودی ہمیشہ اسی ملک کی زبان بولتے تھے جس میں رہتے تھے، انہیں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ابلاغ کی رکاوٹ درپیش تھی۔ چنانچہ ایشکینازی فرقے نے پرانے یہودی فرقوں سے مختلف طرزِ حیات پروان چڑھا لیا۔ ایشکینازی یہودی طرزِ حیات یورپ میں ابھرتے ہوئے فیوڈل ازم کے تناظر میں صورت پذیر ہوا تھا، جو کہ اس زمانے کے دوسرے علاقوں کے نظاموں سے کئی حوالوں سے مختلف تھا۔ ایشکینازی فرقے نے مشرق کی طرف

وسطی اور مشرقی یورپ کی ابھرتی ہوئی ریاستوں میں پھیلتے ہوئے اپنے تشخص کو مزید ٹھوس بنالیا۔ سیکولر اشکینازی یہودیوں سے زیادہ یہ تشخص مذہبی اشکینازی یہودیوں میں موجود ہے۔

1492ء میں سپین سے اور 1498ء میں پرتگال سے نکلنے کے بعد سفرڈی یہودی نہ صرف دوسرے یہودی فرقوں کے ساتھ رہنے لگے بلکہ انہیں تبدیل بھی کر دیا۔ سفرڈی تارکین وطن ان فرقوں کے دوسرے یہودیوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ چونکہ وہ مقابلتاً زیادہ ترقی یافتہ معاشرے سے آ کر کم ترقی یافتہ ملکوں میں آباد ہوئے تھے، اس لیے جلد ہی وہ بہت امیر ہو گئے، تعلیم میں دوسروں سے آگے نکل گئے اور بحیرۂ روم کے ملکوں کے سب سے زیادہ متحد یہودی بن گئے۔ سالونیکی میں (جو کہ اب یونان میں ہے لیکن اس زمانے میں عثمانی سلطنت کا حصہ تھا) آباد ہونے والے سفرڈی یہودیوں کو عثمانی سلطان کی طرف سے مراعات حاصل ہو گئیں کیونکہ وہ عمدہ کپڑا تیار کرتے تھے اور عثمانی فوج کے اعلیٰ ترین دستوں کے لیے یونیفارم کا کپڑا مہیا کرتے تھے۔ سالونیکی سفرڈی یہودیوں نے تقریباً 130 سال تک یہ اجارہ داری برقرار رکھی، جس کا خاتمہ صرف اسی وقت ہوا جب انگلینڈ اور ہالینڈ سے زیادہ جدید کپڑا درآمد ہونے لگا۔ سپینی یہودیوں نے زیادہ تر اور اطالوی یہودیوں نے ان سے قدرے کم درجے میں ازمنۂ وسطیٰ کے یہودی کلچر کے تمام شعبوں میں بیشتر تخلیقی کام کیے۔ سفرڈی جن ملکوں میں آباد ہوئے تھے، وہاں ان کی دولت اور تعلیم کی وجہ سے ان کی روایات، زبان اور نام یہودی فرقوں پر حاوی ہو گئے۔ اس کی ایک اچھی مثال بلقان میں، جو کہ اب ترکی ہے، رونما ہوئی۔ ان فرقوں کے لوگ خود کو ''رومانیول'' کہلاتے تھے، جو کہ بازنطینی سلطنت کے معروف نام ''رومانیہ'' سے اخذ کیا گیا تھا۔ وہ 1550ء تک یونانی زبان بولتے تھے۔ اس کے بعد سفرڈی تارکینِ وطن کے زیرِ اثر انہوں نے خود کو سفرڈی کہلانا اور سپینی زبان کی ایک قدیم قسم لاڈینو بولنا شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ نمائے آئبیریا سے نقل مکانی کرنے والوں، ان کی اولادوں یا سفرڈی فرقے میں گھل مل جانے والوں کے علاوہ کوئی اور سفرڈی کمیونٹی وجود نہیں رکھتی تھی۔ یورپی سیاحوں اور کچھ اشکینازی یہودیوں نے غلطی سے تمام غیر اشکینازی یہودیوں کو سفرڈی کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی سفرڈی یہودیوں نے دوسرے یہودی فرقوں پر طویل عرصے تک غلبہ پائے رکھا۔ بہت سے غیر اشکینازی یہودی فرقے اپنے آپ کو یہودی کے علاوہ عراقی، مراکشی، اطالوی یا کسی دوسری قومیت سے منسوب کرتے ہیں، جو کہ زیادہ درست عمل ہے۔

سترہویں صدی کے اختتام تک اشکینازی یہودی دنیا بھر کے یہودیوں میں ایک چھوٹی سی اقلیت ہی تھے۔ تہذیبی ترقی کے حوالے سے وہ دوسرے یہودی فرقوں سے بہت پیچھے تھے۔ اٹھارہویں صدی سے بحیرۂ روم کے ملکوں، بالخصوص عثمانی سلطنت کے لوگوں کو معاشی اور آبادیاتی حوالے سے زوال آنے لگا۔ ان ملکوں کے یہودی فرقے بھی اس رجحان سے بہت متاثر ہوئے۔ 1700ء سے 1850ء کے درمیانی عرصے میں ان علاقوں میں یہودیوں کی تعداد تیزی سے کم ہوئی اور وہ غریب سے غریب تر ہونے لگے۔ 1850ء سے 1914ء کے

درمیان یہودی آبادی میں تھوڑا اضافہ ہوا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے یورپ میں ہونے والی ٹیکنالوجیکل اور سیاسی ترقی نے اشکینازی فرقے پر بھی اثر ڈالا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے اشکینازی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی اور 1800ء تک وہ دنیا بھر کے یہودیوں میں اکثریت میں آ گئے۔ انیسویں صدی میں ان کے اضافے کی شرح مزید بڑھ گئی۔ روسی سلطنت کے یورپی حصے میں رہنے والے یہودی، جو تقریباً سارے ہی اشکینازی تھے، 1795ء سے 1914ء کے دوران تعداد میں سات گنا بڑھ گئے۔ اشکینازی یہودیوں نے یہودیت میں بہت سی اختراعات کیں، جن میں سے کچھ سیکولر تھیں۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں اشکینازی یہودی باقی سب غیر اشکینازی یہودی فرقوں سے تالمود کی تعلیم سمیت ہر حوالے سے سبقت لے جا چکے تھے۔ مذہبی اشکینازی یہودیوں اور غیر اشکینازی یہودیوں میں حالیہ تقسیم کی وجہ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ دو سو سال کے دوران تقریباً تمام ممتاز ربی اشکینازی تھے۔ اس عرصے کے دوران غیر اشکینازی فرقوں میں تالمود کی تعلیم، شائع ہونے والی کتابوں حتیٰ کہ دوبارہ شائع ہونے والی پرانی کتابوں کا معیار تباہ کن حد تک زوال یافتہ تھا۔

1948ء تک صیہونیت اور فلسطین کی طرف یہودیوں کی نقل مکانی اشکینازی اختراعات تھیں۔ بیشتر مذہبی یہودی صیہونیت کو یہودیت کی دشمن تصور کرتے تھے، لہٰذا صرف اپنے مذہبی ماضی سے پیچھا چھڑا لینے والے یہودی ہی صیہونی بن سکتے تھے۔ کچھ اشکینازی صیہونیت کے قائل ہو کر فلسطین آ کر آباد ہو گئے۔ تاہم ان کی اکثریت نے صرف اس وجہ سے نقل مکانی کی تھی کہ وہ جن ملکوں میں پیدا ہوئے تھے، وہاں ان کی زندگیاں بہت زیادہ دشوار تھیں۔ 1948ء میں اسرائیل آ کر آباد ہونے والے یہودیوں کی اکثریت ان کی تھی جو یورپ میں 1932ء میں سامیت دشمنی میں اضافے اور بالخصوص جرمنی میں ہٹلر کے حکومت میں آنے کے بعد فلسطین کی طرف نقل مکانی کر آئے تھے۔ ریاست کی تخلیق کے وقت غیر اشکینازی یہودیوں کی تعداد اسرائیل میں مقابلتاً کم تھی۔ 1950ء کی دہائی اور 1960ء کی دہائی کے اوائل میں غیر اشکینازی یہودیوں میں مذہب کا مسیحانہ اثر برقرار تھا۔ 1950ء کی دہائی میں اسرائیل میں معیاراتِ زندگی گو کہ یورپ سے کمتر تھے، تاہم عرب مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ملکوں سے بہتر تھے۔ چنانچہ اسرائیلی حکومت یہودیوں کو بہت سے ملکوں مثلاً مراکش، یمن اور بلغاریہ سے اسرائیل آنے کی ترغیب دے سکتی تھی۔ عراقی یہودیوں سے نقل مکانی کروانے کے لیے اسرائیلی حکومت نے عراقی حکومت کو رشوت دی کہ وہ عراقی یہودیوں کی جائیدادیں ضبط کر لے اور ان کی شہریت ختم کر دے۔ دوسری طرف کچھ یہودی مشرقی بحیرۂ روم کے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں، مثلاً یونان اور مصر سے نقل مکانی کر کے آئے تھے۔ اسرائیلی یہودی آبادی میں غیر اشکینازی کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ 1949ء سے 1965ء کے دوران اشکینازی یہودیوں کی تعداد اسرائیل کی آبادی کے 40 فیصد تک آ کر رک گئی۔ بعد میں سابق سوویت یونین سے نقل مکانی کر کے آنے والے یہودیوں کی وجہ سے اشکینازی کا تناسب تقریباً 55 فیصد ہو گیا۔ زیادہ ترقی یافتہ ملکوں سے آنے کی وجہ سے اشکینازی یہودی بظاہر جدید اور سیکولر لگتے تھے۔ غیر اشکینازی یہودی، جنہیں سیفرڈی کی بجائے

بتدریج "مشرقی" کہا جانے لگا تھا، مذہبی ہی رہے۔ بہت سے مشرقی یہودیوں اور ان کی اولاد کی اسرائیل آمد پر اشکینازی یہودیوں نے ان کی کلچرل سوشلائزیشن کی اور اس وقت کی حکمران صیہونیت پسند لیبر پارٹی نے ان کی حمایت کی۔ جدیدیت پذیری اور نوجوانوں کو سیکولر بنانے کی کوششیں اس سوشلائزیشن کا حصہ تھیں۔ اسرائیل کے وجود میں آنے کے بعد کی دو دہائیوں کے دوران ان کوششوں کے نتائج ملے جلے رہے۔ مشرقی یہودیوں کی اکثریت روایت پرست ہی رہی یعنی وہ سبت کے دن سفر نہ کرنے جیسے مشکل مذہبی احکامات پر عمل نہ کرتے تھے بلکہ سینا گوگ میں عبادت کرنے جیسے احکامات پر ہی عمل کرتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ربیوں اور "مقدس لوگوں" کو جادوئی طاقتوں کا حامل مانتے تھے۔ آج تک صرف چند مشرقی سیاستدانوں نے عوامی سطح پر ربیوں پر تنقید کرنے کی جرأت دکھائی ہے۔ وہ اس وقت بھی ربیوں پر تنقید نہیں کرتے جب وہ ان کی شدید مخالفت کرتے ہیں یا انہیں بددعا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اشکینازی یہودی، خواہ وہ کسی بھی سیاسی سوچ کے حامل ہوں، ربیوں پر آزادانہ تنقید کرتے ہیں۔ اشکینازی سیاستدان ربیوں کی فرمانبرداری بالکل نہیں کرتے۔ 1970ء کی دہائی کے شروع میں ابھرنے والے بلیک پینتھرز اور چھوٹی چھوٹی مشرقی امن تحریکوں کے ارکان سمیت تقریباً تمام مشرقی سیاستدان عوامی سطح پر ربیوں کے سامنے جھکتے اور ان کے ہاتھ چومتے ہیں۔

اشکینازی مذہبی اقلیت، خصوصاً اس کی ہیریڈی شاخ، مشرقی یہودیوں کی سیکولرائزیشن کی مزاحمت کر چکی ہے۔ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہے، خاص طور پر ایک اقلیت کو یہودیت کے احکامات پر کاربند رہنے کا قائل کرنے میں انہوں نے مشرقیوں کے لیے الگ مذہبی سکول یشیووت قائم کیے ہیں اور انہوں نے اپنے سکولوں اور یشیووت میں مشرقی بچوں کو داخلے بھی دیئے ہیں، گو کہ بہت محدود تعداد میں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسرائیل میں ربیوں اور تالمودی سکالروں کا ایک مشرقی ہیریڈی ایلیٹ گروپ ابھر چکا ہے۔ اس گروپ کے اراکین کی تربیت اشکینازی ہیریڈی ربیوں نے کی ہے۔

1990ء کی دہائی کے آغاز تک الیشکنازی انفرادیت پسندی کے بے لچک ہیریڈی روپ اور مشرقی روایت پرستی، جو کہ پہلے امکانی طور پر دھماکہ خیز تھی، کے درمیان تصادم پھوٹ پڑا۔ اشکینازی ہیریڈی تحریک نے اس امر پر زور دیا کہ 1860ء میں وسطی اور مشرقی یورپ میں وجود رکھنے والی صورتِ حال کو مکمل طور پر منجمد کر دیا جائے۔ اشکینازی ہیریڈی یہودیوں کے تربیت یافتہ مشرقی یہودیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا روایتی لباس ترک کر کے سیاہ رنگ کا اشکینازی لباس پہنیں اور یدش زبان پڑھیں اور بولیں۔ ہیریڈی یشیووت میں زبانی تدریس یدش میں ہوتی ہے جبکہ تحریر کی زبان عبرانی ہے۔ مشرقی روایت پرستوں کو اس پر بھی مجبور کیا گیا ہے کہ وہ عبادت کا اشکینازی طریقہ اپنائیں، جو کہ ان کے سابقہ طریقے سے کئی حوالوں سے مختلف ہے۔ یہ تبدیلیاں ان ربیوں نے کی تھیں جو مطلق حاکمیت کے حامل تھے اور جنہیں تقریباً کوئی مخالفت درپیش نہیں تھی۔ اس کے برعکس 1950ء کی دہائی میں لیبر تحریک نے مشرقیوں کو جدیدیت آشنا کرنے کی کوشش کی تو مشرقی عوام میں مخالفت کا آتش فشاں

پھٹ پڑا تھا۔ مشرقی عوام سیاستدانوں کو تو اکثر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تاہم ربیوں پر کبھی کبھار ہی تنقید کرتے ہیں۔

اشکینازی ہیریڈی یشیووت میں کامل فرماں برداری کے ساتھ مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے مشرقی طلبا اور بعد ازاں ربی بن جانے والوں کو اپنے ساتھی طلبا اور ربیوں کے مساوی حیثیت نہیں دی جاتی ہے۔ وہ ان کا تذلیل آمیز رویہ برداشت کر چکے ہیں اور آج بھی برداشت کیے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس رویے کی ایک عمدہ مثال ایک دوسرے کے ہاں شادیاں کرنے میں نابرابری ہے۔ تمام یہودی فرقوں میں ایک بہت پرانی رسم چلی آ رہی ہے کہ یشیوا کا سربراہ یشیوا کے طلبا کی شادیوں کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ طلبا کے لیے بیویوں کے طور پر امیر اور نیک یہودیوں کی بیٹیوں کا انتخاب بڑی احتیاط کے ساتھ کرتا ہے۔ زیادہ ذہین طلبا کے لیے امیر ترین والدین کی بیٹیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ (یشیوا کا سربراہ ربیوں کی بیٹیوں کے لیے بھی امیر ترین گھرانوں میں بر تلاش کرتا ہے)۔ یشیوا کے طلبا خلوص کے ساتھ اس کی پسند پر صاد کہتے ہیں، ناپسندیدگی کے اظہار کو سنگین گناہ سمجھا جاتا تھا اور آج بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ رسم اس لیے شروع کی گئی تھی کہ یشیوا کے طلبا کے پاس روزی کمانے کے لیے کوئی ہنر نہیں ہوتا لہٰذا یوں ان کی اور کے خاندانوں کے اعانت ہو جاتی ہے۔ یوں طلبا اپنی مقدس تعلیم جاری رکھ پاتے تھے اور ان کی اعانت کرنے والے خاندانوں کے بارے میں فرض کیا جاتا تھا کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ ابھی حال ہی میں ایسا ہوا ہے کہ جب یشیوا کے سربراہ کوئی امیر سسر ڈھونڈنے میں ناکام رہے تو انہوں نے ہیریڈی خواتین کے لیے موزوں ہنر رکھنے والی ایسی عورتوں کو تلاش کیا جو اپنے خاوندوں کے مقدس تعلیم جاری رکھنے اور ان کا مالی بوجھ اٹھانے پر آمادہ ہوں۔ (فرض کیا جاتا ہے کہ ایسی اعانت بیویوں کو جنت میں لے جائے گی)۔ چونکہ یشیوا کے سربراہ شادیاں کرواتے ہیں لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طلبا اور ان کے خاندانوں کی کمائی اور یوں ان کی زندگیوں پر ان کا کنٹرول ہوتا ہے۔ اشکینازی ہیریڈی یہودیوں نے دوسرے فرقوں کے نیک یہودیوں سے شادی سے کبھی انکار نہیں کیا ہے۔ تاہم ایسی شادیوں کو باعث عزت تصور نہیں کیا جاتا تھا ـــــ اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشکینازی ہیریڈی یشیووت کے سربراہ مشرقی طلبا کے لیے، خواہ اپنی تعلیم میں وہ کتنے ہی ممتاز کیوں نہ ہوں، جسمانی طور پر معذور یا غریب اشکینازی دلہنیں تلاش کرتے تھے اور یہ رسم آج بھی جاری ہے۔

اس امر پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ایک ان لکھا قانون وجود میں آ چکا ہے کہ مشرقی طلبا کو، خواہ وہ کتنے ہی ممتاز کیوں نہ ہوں، نچلے درجے کے یشیوا میں بھی کسی معقول تدریسی منصب پر فائز نہیں کیا جاتا، حالانکہ نچلے درجے کے یشیووت میں صرف مشرقی طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ یہ تدریسی منصب اشکینازی ربیوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں اور اس کا محرک یہ مفروضہ ہے کہ مشرقی یہودی ابھی اس قدر پختہ نہیں ہوئے کہ ذمہ دارانہ مذہبی عہدوں پر فائز ہو سکیں۔ جب ایک ممتاز ترین ہیریڈی لیڈر ربی شاک نے 1992ء کے انتخابات سے کچھ عرصے پہلے اس موقف کا بتاکید اظہار کیا تو بہت سے اشکینازی سیکولر یہودیوں نے اسے نسل پرست قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی تھی۔ تاہم مشرقی ربیوں اور مشرقی سیاسی کارکنوں نے عوامی سطح پر ایک بھی تنقیدی جملہ نہیں کہا تھا۔

ہیریڈی سیاسی پارٹی شاس کی تشکیل میں مشرقیوں کا کوئی کردار نہیں ہے۔ ربی شاک نے 1988ء کے انتخابات سے قبل شاس کو تشکیل دیا تھا کیونکہ اسے ایسے کنیسٹ ارکان کی ضرورت تھی جو صرف اور صرف اس کے تابع فرمان ہوں۔ چنانچہ اس نے خالصتاً اشکینازی پارٹی ڈیگل ہاتورا اور خالصتاً مشرقی پارٹی شاس بنانے کے لیے اپنے شاگردوں کو حکم دیا۔ دونوں پارٹیوں کی تشکیل کے بعد پارٹی لیڈروں نے عوامی سطح پر اعلان کیا کہ ربی شاک ان کے لیے اعلیٰ ترین روحانی اتھارٹی ہے اور وہ اس کی غیر مشروط اطاعت کرتے ہیں۔ غیر ہیریڈی مشرقیوں کو مائل کرنے کے لیے شاک نے ایک غیر ہیریڈی مشرقی ربی اوویدیا یوسف کو، کہ جس پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا، پھانسا۔ ربی اوویدیا یوسف اسرائیل کا سابق چیف ربی ہے۔ شاک نے اسے پارٹی کا نمائشی سربراہ بنا دیا۔ تاہم شاک ہی پارٹی کا اصل سربراہ تھا۔ شاک کے لیے یوسف میں خوبی یہ تھی کہ وہ این آر پی سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی کہ شاک۔ وجہ یہ تھی کہ این آر پی نے ربی یوسف کو دوسری مرتبہ اسرائیل کا چیف ربی بنانے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسرائیل میں یہ بات بہت معروف ہے کہ سیکولر یہودیوں کے اندر باہمی نفرت اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی کہ مذہبی یہودیوں کے مختلف گروپوں کی ترجمانی کرنے والے ربیوں میں۔ شاک کو بھرپور توقع تھی کہ ربی یوسف این آر پی کے ربیوں سے نفرت میں اس کا وفادار اور اپنے فرمانبردارانہ کردار پر قانع رہے گا۔

کچھ عرصہ تک تو ہر کام شاک کے منصوبے کے مطابق ہوا۔ 1988ء کے انتخابات میں شاک کے زیر اثر کام کرنے والی دو پارٹیوں نے کنیسٹ کی آٹھ نشستیں جیت لیں۔ ڈیگل ہاتورہ نے دو اور شاس نے چھ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ ہیریڈی پارٹی اگودات اسرائیل، جس کے خلاف شاک نے اپنی پارٹیاں تشکیل دی تھیں، صرف پانچ نشستیں جیت سکی۔ ڈیگل ہاتورہ اور شاس نے لیکوڈ حکومت کو ترجیح دی اور 1988ء کے انتخابات کے بعد وزیراعظم کے طور پر اسحاق شمیر کی حمایت کی۔ ان کی حمایت فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ 1990ء کے بعد شمیر ان کی مدد کے بغیر کنیسٹ میں اکثریت حاصل نہیں کر پایا۔ لیبر پارٹی کے لیڈر شمعون پیریز کی اس صورت حال کو الٹانے کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ پیریز نے ربی شاک سے ملاقات کرنے کی ناکام کوشش کی، تاہم شاک متعدد کم اہمیت کے حامل سیکولر سیاستدانوں سے تو ملا لیکن پیریز سے نہیں۔ پیریز نے عوامی سطح پر اعلان کیا کہ وہ یہودیت کی عمومی طور پر اور ہیریڈی ربیوں کی خصوصی طور پر انتہائی توقیر کرتا ہے۔ تاہم پیریز نے جو اقدام بھی کیا، ناکامی سے دوچار ہوا۔ شاک اور اس کے رقیب ہیریڈی ربیوں نے شمیر کی حمایت میں لچک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ 1992ء کے انتخابات سے پہلے لیبر پارٹی کی ذیلی تنظیموں میں قیادت کے حوالے سے اسحاق رابن شمیر پر حاوی ہو گیا، جس کی وجہ شمیر کی ہیریڈی یہودیوں کی تائید حاصل کرنے میں ناکامی تھی۔ اس تجربے کے باوجود پیریز نے ایسی ہی کوششیں دوبارہ کیں اور 1996ء کے انتخابات میں بھی وہی نتیجہ برآمد ہوا۔ ہیریڈی پارٹی نے 1988ء کے بعد سیاسی قوت حاصل کی، خصوصاً 90-1988ء کے دورانیے میں۔ 1988ء کے بعد پیریز نے ان کے مطالبوں کی

تائید کی جبکہ وزیراعظم کی حیثیت سے شمیر نے ان کی کہیں زیادہ تائید کی تھی۔ ہیریڈی سیاسی کامیابی کو اس رقم سے بھی ناپا جاسکتا ہے جو دو ہیریڈی پارٹیاں ''خصوصی رقم'' کہلانے والی گرانٹس کی صورت میں اکٹھی کرسکتی ہیں، جو کہ ریاست کے مالی کنٹرول سے آزاد ہوتی ہے۔ یہ خصوصی رقم ایک رضا کار تنظیم کے ذریعے اکٹھی کی جاتی ہے جس کا سربراہ کنیسٹ کا کوئی رکن یا اس کے دوست ہوتے ہیں۔ خزانے کی وزارت ایسی تنظیموں کو ریاستی بجٹ میں سے گرانٹس دیتی ہے، جن کے خرچ پر اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ بے انتہا کرپشن کی صورت میں نکلا، جو کہ ریاستِ اسرائیل کی ساری تاریخ میں عدیم النظیر سطح پر پہنچ گئی اور آخرِ کار اس طرح کی خصوصی گرانٹس کے ختم کیے جانے کا باعث بنی۔

ان خصوصی گرانٹس کے حصول کے لیے ہونے والی بے پناہ کرپشن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رقم کو غیر قانونی طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ شاس نے بیشتر گرانٹس کو ایسے اداروں کا ایک نیٹ ورک قائم کرنے پر خرچ کیا جو اس کے اثر ورسوخ کو تقویت دینے میں مدد دیں نیز ایسے عسکریت پسندوں کی تربیت پر کہ جو عوام پر پارٹی کی گرفت مضبوط کرنے کا کام کریں۔ اس نیٹ ورک میں ایسے تعلیمی ادارے بھی شامل تھے، جن میں صرف یہودی لڑکوں کو صرف مذہبی مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ (شاس لڑکیوں کو تعلیم دینے کی زیادہ حامی نہیں ہے)۔ 40 سے 50 سال کی عمر کے بالغ مردوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اپنے کاروبار یا پیشوں کو چھوڑ کر ان اداروں میں داخلہ لیں اور مقدس تعلیم حاصل کریں۔ انہیں اس کے صلے میں وظائف دیئے جاتے تھے۔ گو کہ وظائف کی مالیت بہت کم ہوتی تھی تاہم ان گنت لوگوں نے دنیاوی کاموں پر مقدس تعلیم کو ترجیح دی۔ یہ رنگروٹ (Recruits) تالمود پڑھنے کے علاوہ بھی کام کرتے تھے۔ وہ شاس کے لیے سیاسی کام کرتے تھے۔ جلد ہی یہ رنگروٹ شاس کا سیاسی کیڈر (Cader) بن گئے اور انہوں نے ہیریڈی علاقوں کو انتخابی حلقوں میں بدل دیا۔

اسرائیلی سیاست کے باعلم مبصروں نے تسلیم کیا ہے کہ اس طرح کی ہیریڈی سیاسی سرگرمیوں کا عوامی اور سیاسی اثر مرتب ہوا ہے۔ 1992ء کے انتخابات کے دوران رابن کے ایک اہم سٹرٹیجی مشیر پروفیسر گڈیون ڈورون نے 26 جون 1992ء کے ''البمیشر'' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں رابن کی فتح کے بعد واضح کیا کہ شاس کے غلبے والے علاقوں میں لیبر پارٹی لوگوں کو قائل کرنے میں کیوں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی:

> یہ ایک ایسی پارٹی ہے جو اپنے عوام کو انتخابات کے دوران اور بعد میں اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے...... شاس انتخابی نتائج کو رقوم کے حصول کا ذریعہ بنانا اور اس رقم کو چار سال کے دوران خرچ کرنا جانتی ہے (دو انتخابات کا درمیانی وقفہ چار سال کا ہوتا ہے)۔ یہ طریقہ کامیاب رہا ہے۔ یہ لوگ جادو ٹونا بھی استعمال کرتے ہیں، تعویز اور بددعائیں بھی دیتے ہیں، تاہم ان کا کردار ثانوی ہوتا ہے۔

ڈورون کے بقول شاس کے انتخابی حلقے کو مائل کرنے کا بہترین طریقہ تنخواہ یافتہ ایلیٹ کے ذریعے

ایسا کرتا ہے جس کا کام بہر طور اس انتخابی حلقے کو اپنے کنٹرول میں رکھنا ہو۔ ڈورون نشاندہی کرتا ہے کہ محولہ بالا ایلیٹ کے علاوہ شاس کے پیروکار بنیادی طور پر ویسے ہی ہیں جیسے کہ "لیکوڈ پارٹی کے روایت ذہن والے مشرقی یہودی حامی۔" شاس کے لیڈروں، بالخصوص ربی یوسف میں سیاسی طاقت کے حصول سے خود اعتمادی پیدا ہوئی اور انہوں نے اشکنازی ہیریڈی ربیوں کی سرپرستی سے آزاد ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ شاس کے غلبے والے علاقوں میں ربی شاک کی بجائے ربی یوسف کو دنیا کا عظیم ترین ربی تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ کئی برس تک مسلسل عوامی داد و ستائش حاصل کرتے رہنے کے بعد ربی یوسف کو یقین ہو گیا کہ اسے ربی شاک کی فرمانبرداری کی مزید ضرورت نہیں رہی۔

1992ء کے انتخابات کے بعد ربی شاک اور شاس پارٹی میں خلیج پیدا ہو گئی اور اسے ایک مسئلے نے بڑھا دیا۔ یہ خلیج ربی شاک اور ربی یوسف کے اس دعوے سے پیدا ہوئی تھی کہ وہ شاس پارٹی کے روحانی سربراہ ہیں۔ رابن نے اتحاد بنایا تو شاس کے مطالبوں کو مان لیا۔ معاہدے پر دستخط سے پہلے شاس نے ربی شاک سے منظوری مانگی۔ ربی شاک نے انکار کر دیا، کیونکہ جیسا کہ ایک دوسرے باب میں ذکر کیا گیا ہے..... شلامیت ایلونی کو تعلیم کی وزیر بنایا جانا تھا۔ شاس کے اخبار یاتید نیمن نے اس تقرر پر اداریہ لکھا اور کہا کہ یہ ہولوکاسٹ میں دس لاکھ بچوں کی ہلاکت سے بھی بدتر اقدام ہے۔ اس کی دلیل یہ دی گئی کہ نازیوں نے بچوں کو قتل تو کیا لیکن ان کی روحوں کو جنت جانے سے نہیں روکا' جبکہ ایلونی کا تقرر یہودی روحوں میں بگاڑ پیدا اور انہیں جنت سے محروم کر سکتا ہے۔ تاہم ربی یوسف اور شاس پارٹی نے یہودی بچوں کی روحوں کو خطرے میں ڈالنا گوارا کر لیا اور رابن کی حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ ربی شاک اور پیروکاروں نے شدید اشتعال میں منفی ردِعمل کا اظہار کیا۔ ان کا اشتعال بعد میں بھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔

روحانی اتھارٹی کے معاملے پر دونوں ہیریڈی تحریکوں کا تنازعہ جادوئی میدان میں بھی جاری رہا۔ ہیریڈی عقائد کے حامل شاس لیڈروں کا عقیدہ تھا کہ ربی شاک سے روگردانی کرنا گناہ ہے، جس کی سزا میں وہ ایسی بددعائیں دے گا جن کا نتیجہ ان لیڈروں اور/یا ان کے گھرانوں کے افراد کی اموات یا بیماری کی صورت میں نکلے گا۔ اس جادوئی نتیجے کو حقیقت قرار دلوانے کے لیے ربی شاک کے پیروکاروں نے وہی حربہ استعمال کیا جو ایسی ہی صورت حال میں پہلے آزمایا جا چکا تھا۔ انہوں نے شاس لیڈروں کی اموات، ہسپتال داخلے اور/یا ٹریفک حادثوں کی جھوٹی خبریں شائع کروائیں نیز ان کے گھروں میں فون کیے اور ایمبولینسیں بھجوائیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مذہبی یہودیوں، بالخصوص ہیریڈی ربیوں میں آپس میں سخت نفرت پائی جاتی ہے۔ اس نفرت کا نتیجہ تفرقے کی صورت میں نکلا ہے جس سے ہیریڈی سیاسی قوت محدود ہو گئی ہے۔ باہمی لڑائی کے لیے جو حربے استعمال کیے جاتے ہیں وہ ہیریڈی کلچر میں اس قدر گھسے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر بہت محدود ہوتا ہے،

جو کہ ربی شاک کے پیروکاروں کی بدقسمتی ہے۔ مزید برآں جادو کے شعبے میں شاس کے پاس ایک مشہور جادوگر ربی کیڈوری ہے، جس نے اعلان کیا تھا کہ وہ کبالائی منتر پھونک کر شاس لیڈروں کے گرد حفاظتی حصار بنا دے گا۔ ربی کیڈوری نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ خدا نے اسے آگاہ کیا ہے کہ دوسرے ہیریڈی یہودیوں کی طرف سے ستائے جانے سے شاس کے لیڈر عظیم تر یہودی نیکی کے اہل ہو جائیں گے یعنی مر کر خدا کا نام بلند کر جائیں گے۔

روحانی اقتدار کی مسابقت میں یہ بحث چھڑ گئی کہ ربی یوسف روحانی اعتبار سے اس قدر عظیم ہے کہ شاک کی اتھارٹی کو چیلنج کر سکے۔ اس بحث کے بعد شاس کے سارے ربیوں نے ربی یوسف کی پیروی کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاس کے ربیوں اور شاس کے ماننے والوں نے ربی یوسف کو "اپنی نسل کا عظیم ترین ربی" کا خطاب دیا، ہر اشکینازی ربی سے بھی عظیم۔ اس سے قبل یہ اعزاز ربی شاک کو حاصل تھا۔ شاس نے آزادی حاصل کر لی تھی۔ اشکینازی ہیریڈی یہودی شاس کو شکست تو نہ دے سکے تاہم انہوں نے اس سے تمام روابط منقطع کر لیے۔ کسی اشکینازی ربی نے شاک کے اعلانات سے بریت کا اظہار نہیں کیا، بلکہ انہوں نے تو اور زیادہ زہر گھولا۔ سب سے بڑے ہسیڈی فرقے "گر ہسیڈس" کے لیڈر نے اپنے سابقہ موقف کو دہرایا کہ اسرائیل کو یوم کپور جنگ (اکتوبر 1973ء) میں اس وجہ سے شکست ہوئی تھی کہ ایک عورت یعنی گولڈا مائر وزیر اعظم تھی۔ اس نے کہا کہ اسرائیل اگلی جنگ شلامیت الیونی کی وجہ سے ہار جائے گا۔ اشکینازی ربیوں اور ان کے پیروکاروں نے اپنی بددعاؤں اور اعلانات سے زیادہ مہلک ہتھیار استعمال کیے۔ وہ سبت کے آغاز سے پہلے سینا گوگوں کو ناپاک کر دیتے چنانچہ ان کی صفائی کرتے ہوئے سبت کی خلاف ورزی ہو جاتی۔

شاس کے بہت سے لیڈروں نے اشکینازی اداروں میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ اشکینازی سینا گوگوں میں عبادت کرتے تھے۔ عبادت کے دوران انہیں خوفزدہ کیا اور مارا پیٹا گیا۔ ایک شاس لیڈر ربی پنہاسی پر سبت کی عبادت کے دوران بنی براک کے ہیریڈی قصبے میں واقع اشکینازی سینا گوگ میں تھوکا گیا اور اسے زدوکوب کیا گیا۔ کچھ شاس لیڈروں کے بچوں کے ساتھ ہولناک بدسلوکی کی گئی۔ اس وقت کے وزیر داخلہ یعواک ڈیری کو اپنے بیٹے اشکینازی یشیوا سے نکالنا پڑے، جس کے بعد ان کی سرعام تذلیل کی گئی۔ ڈیری کو بھی مسلسل ہراساں کیا گیا۔ خصوصاً جب وہ سینا گوگ میں عبادت کرنے جاتا تو شاک کے پیروکار اور مذہبی آبادکار اسے ہراساں کرتے۔ شاس کے پیروکاروں نے بھی جوابی وار کیے۔ متعدد بار انہوں نے ڈیری کو ہراساں کرنے والوں کو مارا پیٹا۔ انہوں نے اشکینازی سینا گوگوں کو بھی انتقاماً ناپاک کیا۔ شاس کے جوابی حملوں نے اپنے حریف کے اس مقصد کو پورا کیا کہ جھگڑے کو مزید بھڑکایا جائے۔

ہیریڈی یہودیوں کے باہمی جھگڑے اور تفرقے سے مشرقی یہودیوں کی مذہبی کایا کلپ کی عکاسی

ہوتی ہے۔ دو عشروں سے زیادہ عرصے تک بہت سے سیکولر مشرقی گروپ قائم ہوئے لیکن وہ جن لوگوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے تھے ان کی تائید حاصل کرنے میں ناکام رہے اور نتیجتاً ٹوٹ گئے۔ ان کی ناکامی کی وجہ یہ قرار دی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ مشرقی یہودی بنیادی طور پر اپنی شناخت مذہبی حوالے سے کرواتے ہیں۔ ہیریڈی شاس پارٹی مستقبل میں اسرائیل کی واحد مشرقی سیاسی پارٹی رہے گی۔ اس خصوصی تجزیے سے مکمل طور پر جدید نہ ہونے والے لوگوں کی مذہبی کایا کلپ کی نوعیت سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔



چوتھا باب

قومی مذہبی پارٹی اور مذہبی آبادکار

این آر پی اور 1967ء سے اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں میں آباد مذہبی گروپ گش ایمونم کی آئیڈیالوجی ہیریڈی یہودیوں کی آئیڈیالوجی کے مقابلے میں زیادہ اختراعی ہے۔ ربی ابراہام عزاک کک نے، جو کہ فلسطین کا چیف ربی اور صیہونیت کا انتہائی ممتاز حامی ربی تھا، اس آئیڈیالوجی کو 1920ء کی دہائی کے شروع میں وضع کیا تھا اور بعد میں اسے ترویج دی تھی۔ ربی کک دی ایلڈر ایک زودنویس مصنف تھا۔ اس کے پیروکاروں کا ایقان تھا کہ وہ الوہی فیضان یافتہ تھا۔ 1935ء میں فوت ہونے کے بعد اسے این آر پی کے حلقوں میں سینٹ (Saint) کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بیٹے اور این آر پی کے لیڈر کی حیثیت سے اس کے جانشین ربی زوی یہودا کک دی ینگر کو بھی سینٹ (Saint) کا درجہ حاصل ہے۔ وہ 1981ء میں 91 برس کی عمر میں فوت ہوا تھا۔ ربی کک دی ینگر نے کوئی کتاب نہیں لکھی اور اسے اپنے باپ جیسا تالمودی فہم بھی حاصل نہیں تھا تاہم وہ ایک زبردست کرشاتی شخصیت کا حامل تھا اور اس کے طلبا اس سے بہت متاثر تھے۔ اس نے اپنے باپ کی تعلیمات کے سیاسی اور سماجی حاصلات کو زبانی واضح کیا۔ یروشلم میں واقع اس کے یشیوا ''مرکز ہرو'' (ربی کا مرکز) سے فارغ التحصیل ہونے والے ربیوں نے، جو کہ اس کے وفادار پیروکار رہے، ایک سیاسی منصوبے کے ساتھ ایک یہودی فرقے کی بنیاد رکھی۔ 1974ء کے اوائل میں، 1973ء کی جنگ کے صدمے کے تقریباً فوری بعد اور شام کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط سے تھوڑا پہلے، ربی کک کے پیروکاروں نے اپنے رہنما کی آشیرواد اور روحانی رہنمائی میں گش ایمونم قائم کی۔ گش ایمونم کا مقصد مقبوضہ علاقوں میں پہلے سے موجود آبادیوں کو توسیع دینا اور نئی آبادکاری تھا۔ شیمون پیریز کی مدد سے، جو کہ 1974ء کے موسم گرما میں اسرائیل کا وزیر دفاع اور یوں مقبوضہ علاقوں کا انچارج بنا تھا، گش ایمونم نے چند برسوں کے مختصر عرصے میں اسرائیلی آبادکاری پالیسی میں کامیابی سے تبدیلی کروائی۔ پورے غربی کنارے میں توسیع پانے اور غزہ کی پٹی کے بہت بڑے رقبے پر قبضہ کر لینے والی

آبادیاں اسرائیلی معاشرے اور اسرائیلی حکومت کی پالیسیوں پر گش ایمونم کے اثرات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔

1970ء کی دہائی میں اسرائیلی آبادکاری پالیسی میں تبدیلی کروانے میں گش ایمونم کی کامیابی کی سیاسی حوالے سے وضاحت کی جاسکتی ہے۔ وزیر دفاع موشے دایان نے 1967ء کی جنگ کے اختتام سے 1974ء تک اسرائیلی آبادکاری پالیسی کو بنایا تھا۔ اس نے زیادہ علاقوں میں یہودی آبادیاں قائم نہیں ہونے دیں۔ واحد استثنا یہ تھا کہ اس نے ہیبرون کے قریب ایک یہودی گروپ کو آباد ہونے کی اجازت دی تھی۔ دایان ان گنجان آباد علاقوں کے گرد تقریباً غیر آباد وادیٔ اردن اور شمالی سینائی (یامت کے علاقے) میں آبادیاں قائم کرنا چاہتا تھا۔ دایان نے بستیوں پر مضبوط گرفت رکھنے والے فیوڈلز کے ساتھ اسرائیلی اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے ان سے وعدہ کیا کہ دیہی اراضی پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ اس نے کافی حد تک اپنے وعدے کی پاس داری کی۔ گش ایمونم نے دایان کے وعدے کے خلاف 1974ء میں بڑے بڑے جلوس نکال کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ یہ مظاہرے امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر کے خلاف بھی ہوئے تھے، جو دایان پالیسی کا پشت پناہ تھا۔ پہلی رابن حکومت (77-1974ء) میں وزیرِ دفاع بننے والے پیریز نے ایک نئی پالیسی شروع کی، جسے اس نے ''عملی مصالحت'' کا نام دیا اور جس کے لیے اس نے گش ایمونم کی اعانت و تائید حاصل کی۔ اس پالیسی کے مطابق غربی کنارے اور غزہ کی پٹی کی وہ ساری اراضی، جس کو وہاں کے لوگ استعمال نہیں کرتے تھے، یہودیوں کے استعمال کے لیے قبضے میں لی جاسکتی تھی۔ اس نئی پالیسی کو قبول کرنے والے فلسطینی سیاسی لیڈروں کو فلسطینیوں پر مطلق حاکمیت دے دی جانی تھی۔ ریاستِ اسرائیل کی حکومت فلسطینی علاقے کے صرف کچھ خاص معاملات کو کنٹرول میں رکھتی۔

وزیرِاعظم رابن نے پہلے پہل اس پالیسی کی مخالفت کی۔ 1975ء میں پیریز نے گش ایمونم کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے رابن کی مخالفت کا توڑ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ گش ایمونم نے نابلوس کے قریب ایک متروک ریلوے سٹیشن سباستیا میں ایک بہت بڑی ریلی نکالی۔ رابن نے مظاہرے پر پابندی لگا دی لیکن گش ایمونم کے مظاہرین فوج کی کھڑی کی ہوئیں رکاوٹیں عبور کر کے سباستیا میں جمع ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ طویل مذاکرات کے دوران پیریز نے گش ایمونم کی حمایت کی۔ وہاں مزید مظاہرین بھی پہنچ گئے۔ آخر ایک سمجھوتہ ہو گیا کہ گش ایمونم آبادکاری کر سکتی ہے۔ گش ایمونم کے ارکان کو اس جگہ آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی جہاں اب کیڈومم کی آبادی مزید بڑھتی جارہی ہے۔ گش ایمونم نے 1976ء میں پیریز کی مدد سے اوفرا کی آبادی عارضی ورک کیمپ کے طور پر اور شیلو کی آبادی آثارِ قدیمہ کے عارضی کیمپ کے طور پر قائم کر دیں۔ گش ایمونم نے غزہ کی پٹی میں بھی ایسی ہی پالیسیوں پر عملدرآمد شروع کر دیا اور آبادکاری کا آغاز کر دیا۔ 1975ء اور 1976ء میں پیریز کی رضامندی سے قائم ہونے والی گش ایمونم کی آبادیاں آج بھی موجود ہیں۔ 1977ء کے انتخابات کے بعد گش ایمونم اور سیکولر اسرائیلی حکومت میں ایک ''مقدس اتحاد'' قائم ہوا جو کہ آج تک برقرار ہے۔

آبادکاری پالیسی میں کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد گش ایمونم کے ربیوں نے عیاری کے ساتھ بہت سی سیاسی سازشیں کیں اور این آر پی پر غلبہ پا لیا۔ 1980ء کی دہائی کے وسط سے این آر پی گش ایمونم کی

آئیڈیالوجی کے مطابق عمل کر رہی ہے۔ ربی کک دی ینگر کی وفات کے بعد گش ایمونم کی روحانی قیادت ایک نیم خفیہ کونسل میں مرکوز ہوگی۔ اس کونسل کے اراکین کو ربی کک کے انتہائی ممتاز شاگردوں میں سے ایک پراسرار معیار کے تحت منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ ربی کبالا کے نام سے مشہور یہودی تصوف کی اپنی ہی دوراز کار تعبیرات سے اخذ کردہ آئیڈیالوجی کے اختراعی عناصر پر اپنے ایمان کی بنیاد پر پالیسی فیصلے کرتے ہیں۔ یہ سب عمل خفیہ ہوتا ہے۔ ربی کک کی تحریریں مقدس صحیفے کا کردار ادا کرتی ہیں اور انہیں شاید شعوری طور پر دیگر کبالائی تحریروں سے زیادہ مبہم رکھا گیا ہے۔ کک کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے تالمودی اور کبالائی ادب نیز دونوں کی جدید تعبیروں کا عمیق علم ضروری ہے۔ کک کے تصورات الٰہیاتی اعتبار سے بہت زیادہ اختراعی ہیں، جس کی وجہ سے وہ غیر مذہبی تعلیم یافتہ یہودیوں میں مقبول ہو گئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے گش ایمونم کی آئیڈیالوجی کے بہت کم تجزیے سامنے آئے ہیں۔ ایک اہم اور عالمانہ تجزیہ، جو پروفیسر یوائیل تل نے لکھا تھا، عبرانی میں ہارتز کے 26 ستمبر 1984ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہی مضمون انگریزی میں سہ ماہی "یروشلم" (نمبر 35، بہار 1985ء) میں Foundation of a Political Messianic Trend in Israel کے عنوان سے شائع ہوا۔ تل کا تجزیہ آج تک کا سب سے زیادہ قابل قدر تجزیہ ہے، گو کہ اس کی زبان عمرانیاتی ہے اور بعض مقامات پر موضوع سے ہم آہنگ نہیں رہا۔ کتابی صورت میں گش ایمونم کے زیادہ غیر مذہبی پہلوؤں پر عبرانی میں کچھ نسبتاً اچھے تجزیے شائع ہوئے ہیں۔ ایک کتاب انگریزی میں ایان لسٹک نے For the Land and The Lord: Jewish Fundamentalism in Israel (1988ء) کے عنوان سے شائع کروائی ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب کا محرک جوناتھن پولارڈ جاسوسی معاملے پر لسٹک کا ردِعمل ہے *1 اسے امریکی محکمۂ دفاع کے لیے ایک مقالے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کتاب میں گش ایمونم کے تغیر پذیر سیاسی اقدامات پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے جبکہ اس کی آئیڈیالوجی کے اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ عنوان کے برخلاف اس کتاب میں یہودی بنیاد پرستی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ مزید برآں کسی حد تک یہ کتاب معذرت خواہانہ ہے۔ گش ایمونم نے زیادہ انتہا پسندانہ عقائد کو منکشف نہیں کیا گیا۔ تاہم لسٹک کی کتاب میں جو مواد موجود نہیں ہے، اسے خوش قسمتی سے یہوشافت ہارکابی کی کتاب Israel's Fateful Hour (1988ء) میں "Nationalistic Judaism" کے عنوان والے باب میں پایا جا سکتا ہے۔ گش ایمونم کے نظریات اور سیاست پر بحث کرتے ہوئے لسٹک اور ہارکابی کے تجزیوں کی اہمیت اپنی جگہ تاہم تل کا تجزیہ اور دیگر عبرانی تحریروں کی افادیت ان سے بہت زیادہ ہے۔

بحث کے نکتۂ آغاز کے طور پر تالمودی ادب کے مقابلے میں کبالا میں غیر یہودیوں کے درجے اور حیثیت کو لیا جانا بہتر رہے گا۔ انگریزی، جرمن اور فرانسیسی میں کبالا پر لکھنے والے بہت سے یہودی مصنفین نے یا تو اس موضوع سے گریز کیا ہے یا اسے مغالطوں کے بادلوں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ان مصنفین نے، جن میں گرشن شولم سب سے اہم ہے، "انسان"، "نوعِ انسان" اور "کائناتی" جیسے الفاظ استعمال کر کے یہ مغالطہ پیدا کیا ہے کہ کبالا تمام نوعِ انسان کی نجات کی راہ دکھاتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کبالائی تحریروں میں،

تالمودی ادب کے برعکس، صرف یہودیوں کی نجات پر زور دیا گیا ہے۔ شولم کی کتابوں کے علاوہ عبرانی میں کبالا پر لکھی جانے والی بہت سی کتابیں نجات اور دوسرے حساس یہودی معاملات کو دیانتداری سے پیش کرتی ہیں۔ یہ نکتہ کبالا کے تازہ ترین اور سب سے موثر مکتب "لیوریائی مکتب" کے تجزیوں سے عیاں ہوتا ہے۔ اس مکتب کو سولہویں صدی کے اواخر میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا نام اس کے بانی اسحاق لیوریا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ربی لیوریا کے نظریات نے ربی کک دی ایلڈر کی الٰہیات پر گہرا اثر ڈالا تھا اور آج بھی گش ایمونم اور ہیسیڈ ازم کی آئیڈیالوجی پر اس کے گہرے اثرات قائم ہیں۔ عبرانی میں لکھنے والے مستند کبالائی مصنف یسایاہ تشبی نے اپنی عالمانہ تصنیف (The Theory of Evil and the (Satanic) Sphere in Lurianic Cabala (1942, reprinted in 1982) میں لکھا ہے: "یہ بات واضح ہے کہ نجات کی سکیم اور امکانات صرف یہودیوں کے لیے ہیں۔" تشبی نے ربی لیوریا کے سب سے بڑے شارح ربی ہائیم وٹل کی کتاب GATES OF HOLINESS سے یہ اقتباس دیا ہے "خالق قوت چاہتی تھی کہ اس زمین پر کچھ لوگ ایسے ہوں جو چار الوہی تخلیقات کی تجسیم ہوں۔ وہ لوگ یہودی ہیں، جنہیں کرۂ ارض پر چار الوہی تخلیقات کے ساتھ شرکت کے لیے چنا گیا تھا۔" غیر یہودی کے شیطانی روح ہونے کے لیوریائی فلسفے کو واضح کرنے کے لیے بھی تشبی نے وٹل کا حوالہ دیا ہے "غیر یہودیوں کی روحیں شیطانی فضا کے نسائی حصے سے آئی ہیں۔ اس وجہ سے غیر یہودیوں کی روحوں کو شر کہا گیا ہے، خیر نہیں۔ نیز انہیں الوہی (علم) سے خالی تخلیق کیا گیا ہے۔"

بینز یون کا تز اپنی عبرانی زبان میں لکھی گئی کتاب Rabbinate, Hassidim, Enlightenment: The History of Jewish Culture Between the end of the Sixteenth and the Begining of the Nineteenth Century (1956) میں بصیرت افروز اسلوب میں لکھتا ہے کہ مذکورہ بالا فلسفے ہیسیڈ ازم کا حصہ بن گئے تھے۔ عبرانی میں لکھے گئے دیگر بہت سے تجزیوں میں بھی لیوریائی فلسفوں کا درست بیان اور مذہبی یہودیوں پر ان کے وسیع اثرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری زبانوں میں لکھی جانے والی کتابوں اور مضامین میں، جو کہ غیر اسرائیلی یہودیوں اور غیر یہودیوں نے بہت اشتیاق کے ساتھ پڑھیں، اس طرح کے بیانات اور تجزیے نہیں ملتے۔ عبرانی کے علاوہ دوسری زبانوں میں کبالا پر لکھنے والے مصنفوں نے کبالا میں شیطان کے کردار کو یا تو بیان نہیں کیا یا بہت گھٹا کر پیش کیا ہے، جس کی ارضی تجسیم ہر غیر یہودی ہے۔ چنانچہ ایسے مصنف اپنے قارئین کے سامنے این آر پی اور اس کی کٹر معاصر گش ایمونم کی سیاست کی درست تصویر کشی نہیں کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا فلسفوں سے اخذ کردہ رجحانات کا جدید اور موثر اظہار مرحوم "لوبوچر ربی" ربی میناکم مینڈل سکنیرسن کی تعلیمات اور تحریروں سے عیاں ہے۔ وہ کبد تحریک کا سربراہ تھا۔ وہ اسرائیل اور امریکہ کے یہودیوں پر گہرا اثر قائم کر چکا تھا۔ سکنیرسن اور اس کے لوبووچ پیروکار ہیریڈم ہیں تاہم وہ اسرائیلی سیاست میں شامل ہو کر گش ایمونم اور این آر پی جیسے تصورات پر عمل کر رہے ہیں۔ ربی سکنیرسن کے تصورات اسرائیل میں اس

کے پیروکاروں کے لیے جاری کیے گئے ریکارڈڈ پیغامات پر مشتمل کتاب سے لیے گئے ہیں۔ جس کا عنوان Gatherings of Conversations ہے اور جو 1965ء میں ارضِ مقدس سے شائع ہوئی تھی۔ اپنی موت سے پہلے کے تین عشروں میں ربی سکنیرسن اپنے نظریات پر سختی سے قائم رہا اور اس نے اپنی آراء میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔ ربی سکنیرسن نے جو کچھ کہا وہ فوری طور پر لوبووچ ہیسیڈک عقیدہ بن گیا۔

غیر یہودیوں کے حوالے سے لوبووچر ربی کے نظریات واضح ہیں، جو قدرے بے ربط ہیں۔ ''تالمود سے اخذ شدہ ہلاکا نے اس طریقے سے ظاہر کیا کہ اگر کوئی غیر یہودی کسی عورت کا حمل ضائع کر دے، خواہ وہ غیر یہودی بچہ ہو، تو اس کی سزا موت ہے۔ اگر کوئی یہودی کسی یہودی عورت کا حمل ضائع کر دے تو اسے موت کی سزا نہیں دی جانی چاہیے۔'' ایک ہی جیسے جرائم پر کسی یہودی اور غیر یہودی کو دی جانے والی سزا کا فرق تالمود اور ہلاکا میں مشترک طور پر موجود ہے۔

لوبووچر ربی لکھتا ہے:

> یہودیوں اور غیر یہودیوں میں فرق اس جملے سے ابھرتا ہے۔ ''آؤ ہم الگ کریں۔'' لہٰذا ہمارے سامنے گہری تبدیلی کا معاملہ نہیں ہے جس میں کوئی شخص محض برتر سطح پر ہوتا ہے۔ بلکہ ہمارے سامنے تو دو بالکل مختلف انواع (Species) کو ''آؤ ہم الگ کریں'' والا معاملہ ہے۔ ایک یہودی کا جسم تمام دنیا کی اقوام کے لوگوں کے جسموں سے بالکل مختلف ہوتا ہے.......... (لوبووچر کے مقدس ربیوں میں سے ایک) بوڑھے ربی نے (کبد کی بنیادی کتاب) Hataya کے باب 49 کی عبارت کی تشریح یوں کی تھی: ''اور تم نے ہمیں (یہودیوں کو) چن لیا کا مطلب یہ ہے کہ (خدا) نے یہودی جسم کو چن لیا تھا، کیونکہ انتخاب ظاہری طور پر یکساں چیزوں میں ہوتا ہے۔ یہودی جسم بظاہر تو غیر یہودی جسموں جیسا ہوتا ہے تاہم مطلب یہ ہے کہ جسم صرف مادے، ظاہری صورت اور سطحی کیفیت کی حد تک یکساں ہیں۔ تاہم اندرونی کیفیت کا فرق اتنا زیادہ ہے کہ جسموں کو مکمل طور پر مختلف انواع (Species) تصور کیا جانا چاہیے۔ اس وجہ سے تالمود کہتی ہے کہ غیر یہودیوں اور یہودیوں کے جسموں کے حوالے سے ہلاکا میں فرق ہے۔'' ''ان کے جسم بے کار ہیں...... '' روحوں کے حوالے سے تو زیادہ بڑا فرق موجود ہے۔ دو مختلف قسم کی روحیں وجود رکھتی ہیں، غیر یہودی روح تین شیطانی علاقوں سے آتی ہے جبکہ یہودی روح تقدیس سے جنم لیتی ہے۔
>
> جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے پیٹ میں موجود بچہ انسان کہلاتا ہے، کیونکہ وہ روح اور جسم دونوں کا مالک ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک یہودی اور غیر یہودی پیٹ کے بچے کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ جسموں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ پیٹ کے یہودی بچے کا جسم غیر یہودی

پیٹ کے بچے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کو "آؤ ہم الگ کریں" کے جملے میں بیان کیا گیا ہے، جو کہ غیر یہودی جسم کے حوالے سے کہا گیا تھا۔ روح کے حوالے سے بھی یہی فرق موجود ہے: غیر یہودی پیٹ کے بچے کی روح، یہودی پیٹ کے بچے کی روح سے مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں: اگر کوئی غیر یہودی کسی پیٹ کے یہودی بچے کو قتل کر دے تو اسے موت کی سزا دی جائے جبکہ یہودی پیٹ کے بچے کو قتل کرنے والے یہودی کو موت کی سزا نہیں دی جانی چاہیے؟ یہودیوں اور غیر یہودیوں میں عمومی فرق کو مدِنظر رکھ کر جواب دیا جاسکتا ہے: کسی یہودی کو کسی دوسرے مقصد کے وسیلے کے طور پر پیدا نہیں کیا جاتا، وہ تو خود مقصد ہوتا ہے، کیونکہ ہر مخلوق صرف یہودیوں کی خدمت کے لیے تخلیق کی جاتی ہے۔ "ابتدا میں خدا نے آسمانوں اور زمین کو بنایا" (کتاب پیدائش 11:1) کا مطلب ہے کہ آسمانوں اور زمین کو یہودیوں کے لیے بنایا گیا تھا، "ابتدا" کا لفظ یہودیوں کے لیے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر شے، ہر دریافت، ساری ترقیاں، سب مخلوقات بشمول "آسمانوں اور زمین کے.......... یہودیوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اہم یہودی ہیں کیونکہ وہ کسی دوسرے مقصد کے لیے وجود نہیں رکھتے، وہ خود الوہی مقصد ہیں۔"

کچھ مزید کبالائی تشریحات کرنے کے بعد لوبوچ ربی لکھتا ہے:

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں اس امر کو سمجھا جاسکتا ہے کہ پیٹ کے بچے کو ہلاک کرنے والے غیر یہودی کو سزائے موت کیوں دی جانی چاہیے اور یہی جرم کرنے والے یہودی کو سزائے موت کیوں نہیں دی جانی چاہیے۔ پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد بچے میں فرق یہ ہوتا ہے کہ پیٹ کا بچہ حقیقت نہیں ہوتا بلکہ ایک جزو ہوتا ہے...... یا اپنی ماں کا یا اس حقیقت کا جو پیدائش کے بعد تخلیق ہوتی ہے کہ جب اس کی تخلیق کا الوہی مقصد پورا ہوتا ہے۔ اس کی موجودہ حالت میں مقصد ہنوز ناموجود ہوتا ہے۔ ایک غیر یہودی کی کل حقیقت صرف لایعنیت ہے۔ لکھا گیا ہے کہ "اور اجنبی تمہارے خانوادوں کو کھلائیں پلائیں گے۔" (Isaiah 61:5) غیر یہودی کی تخلیق صرف اور صرف یہودیوں کے لیے کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی غیر یہودی پیٹ کے بچے کو ہلاک کرتا ہے تو اسے سزائے موت دی جائے گی جبکہ یہودی کو، جس کا وجود نہایت اہم ہوتا ہے، کسی ضمنی شے کی وجہ سے موت کی سزا نہیں دی جانی چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ پیٹ کے بچے کو نقصان پہنچانا منع ہے کیونکہ یہ ایک ایسی شے ہے جو مستقبل میں جنم لے گی اور ایک پوشیدہ شکل میں پہلے ہی سے وجود رکھتی ہے۔ سزائے موت صرف اس وقت دی جانی

چاہیے جب دکھائی دینے والے معاملات متاثر ہوں، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، پیٹ کا بچہ تو صرف ضمنی اہمیت رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا آراء کے جزوی خلاصے اوران پر تبصرے اسرائیلی عبرانی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

1965ء میں، جب محولہ بالا آراء شائع ہوئیں، لوبوچ ربی لیبر پارٹی کا اتحادی تھا۔اس کی تحریک اس سے پہلے کی حکومتوں سے بھی کئی اہم مفادات حاصل کر چکی تھی۔ مثال کے طور پر لوبوچروں نے ریاستی مذہبی تعلیم کے دائرے میں اپنے تعلیمی نظام کے لیے خودمختاری حاصل کر لی۔ 1970ء کے عشرے میں لوبوچ ربی نے فیصلہ کیا کہ لیبر پارٹی بہت زیادہ اعتدال پسند ہے۔اس نے اپنی تحریک کی سیاسی حمایت کا رخ کبھی لیکوڈ اور کبھی ایک مذہبی پارٹی کی طرف کر دیا۔ ایریئل شیرون ربی کا پسندیدہ اسرائیلی سینئر سیاستدان تھا۔شیرون بھی جواباً عوامی سطح پر ربی کی تعریف کرتا تھا اور ربی کی موت کے بعد اس نے کنیسٹ میں ایک پُر اثر تقریر کی تھی۔1967ء کی جنگ کے زمانے سے اپنی موت تک لوبوچ ربی نے ہمیشہ اسرائیلی جنگوں کی تائید اور پسپائی کی مخالفت کی۔1974ء میں اس نے 1973ء کی جنگ میں اسرائیل کے فتح کیے ہوئے سوئز کے علاقے سے واپسی کی مخالفت کی۔اس نے کہا کہ اگر اسرائیل اس علاقے پر قبضہ برقرار رکھے گا تو خدا اس کی مدد کرے گا۔اس کی موت کے بعد اس کے ہزاروں پیروکاروں نے، جو محولہ بالا عبارت میں بیان کیے گئے نظریات پر پختہ یقین رکھتے تھے، نیتن یاہو کی انتخابی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے انتخاب سے ایک دن پہلے کئی چوکوں میں جلسے کیے اور نعرے لگائے کہ "نیتن یاہو یہودیوں کے لیے اچھا ہے۔" اگرچہ ربی کے پیروکاروں نے عرفات سے ملاقات کرنے، ہیبرون معاہدے پر دستخط کرنے اور دوسری مرتبہ انخلا پر راضی ہونے کے حوالے سے نیتن یاہو پر تنقید کی تاہم مجموعی طور پر انہوں نے نیتن یاہو حکومت کو پسند ہی کیا۔

مقبوضہ علاقے کے مذہبی آبادکاروں میں کبد ہیسیڈ ایک بے حد انتہا پسند گروپ ہے۔ باروک گولڈ سٹائن، جس نے بے شمار فلسطینیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، انہیں میں سے ایک تھا (گولڈ سٹائن پر ہم باب نمبر 6 میں بحث کریں گے)۔ربی اِتزاک گنسبرگ نے گولڈ سٹائن کی تعریف میں لکھی جانے والی کتاب میں اس کی شخصیت اور اس کے عمل پر ایک باب لکھا تھا۔وہ بھی اسی گروپ کا رکن ہے۔ گنسبرگ "مزار یوسف یشیوا" کا سابق سربراہ ہے، یہ یشیوا نابلوس کے نواح میں واقع ہے۔ربی گنسبرگ امریکہ سے اسرائیل آیا ہے اور وہ امریکہ کی لوبوچ کمیونٹی سے اچھے روابط رکھتا ہے۔وہ امریکی یہودی مطبوعات میں اکثر اپنے نظریات کا اظہار انگریزی میں کرتا ہے۔اس کا ایک انٹرویو 26 اپریل 1996ء کے "جیوئش ویکلی" (نیویارک) میں شائع ہوا تھا، جس میں اس نے کہا تھا:

> سینٹ لوئیس، جسے لوبوچ فرقے میں یہودی تصوف کی ایک ممتاز سند تصور کیا جاتا ہے، پیدائشی ولی (Saint) تھا۔اس نے ریاضی میں گریجویٹ ڈگری بھی حاصل کی ہوئی تھی اور غیر یہودیوں پر یہودی کی جینیاتی برتری پر بھی گفتگو کرنے کا اہل تھا۔وہ کہتا ہے کہ

تورات اسی لیے یہودی جان کو بے حد فوقیت دیتی ہے۔ ربی گنسبرگ نے جیوئش ویکلی سے کہا "اگر تم دو آدمیوں کو ڈوبتے ہوئے دیکھو، جن میں سے ایک یہودی اور دوسرا غیر یہودی ہو تو تورات کہتی ہے کہ تم پہلے یہودی کی جان بچاؤ۔ اگر یہودی جسم کا ہر خلیہ الوہیت کا حامل ہے تو وہ خدا کا حصہ ہے، یوں ڈی این اے کا ہر ریشہ خدا کا حصہ ہے۔ چنانچہ یہودی ڈی این اے خاص اہمیت رکھتا ہے۔" پھر ربی گنسبرگ نے خطیبانہ انداز میں کہا کہ "اگر کسی یہودی کو جگر کی ضرورت ہو تو اس کی جان بچانے کے لیے کیا تم کسی غیر یہودی راہگیر کا جگر لے سکتے ہو؟ تورات شاید اس کی اجازت دے دے گی۔ یہودی زندگی غیر یہودی زندگی سے بے حد قیمتی اور منفرد ہے۔"

اگر گنسبرگ کے بیان میں "یہودی" کی جگہ "جرمن" کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو یہ ماضی کے نازی فلسفے میں بدل جائے گا۔ جرمن نازی کامیابی کا انحصار جن نظریات پر تھا ان کے اثرات کا اندازہ پہلے بہت کم تھا۔ مسیحانہ، لوبووچ اور دوسرے فلسفے بھی نہایت ہلاکت انگیز ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہلاکا اور کبالا میں غیر یہودیوں کے حوالے سے پائے جانے والے فرق کی عکاسی ان یہودیوں سے روا رکھے جانے والے فرق سے ہوتی ہے جو پہلے غیر یہودی ہوتے تھے۔ اگرچہ ہلاکا کئی حوالوں سے ان سے امتیاز روا رکھتا ہے تاہم وہ انہیں نئے یہودی قرار دیتا ہے۔ چونکہ کبالا یہودیوں اور غیر یہودیوں میں کائناتی فرق پر زور دیتا ہے، اس لیے وہ یہ سوچ نہیں اپنا سکتا۔ کبالا یوں توضیح کرتا ہے کہ یہ یہودی روحیں تھیں "جنھیں سزا کے طور پر غیر یہودی جسموں میں محصور کر دیا گیا تھا اور اب وہ کسی مقدس فرد کی مداخلت سے یہودیت قبول کر کے سزا سے نجات پا چکے ہیں۔ یہ توضیح کبالائی عقیدے کا حصہ ہے اور ہلاکا میں موجود نہیں ہے۔ کبالا کی رو سے ایک شیطانی روح صرف سزا کاٹ کر الوہی روح نہیں بن سکتی۔

گش ایمونم کے نظریات اور سیاست کے حوالے سے جاری اس بحث میں لسٹک اور ہارکابی کے تجزیوں سے بھی استفادہ کیا جا رہا ہے تاہم بنیادی انحصار تل اور عبرانی زبان کے دوسرے مصنفوں کی تحریروں پر کیا جا رہا ہے۔ تل نے ربی یہودا امیتل کی تحریروں سے کافی زیادہ حوالے دے کر گش ایمونم کے اصولوں کا تجزیہ کیا ہے۔ ربی یہودا گش ایمونم کا ایک ممتاز لیڈر رہے جسے وزیر اعظم پیریز نے 1995ء میں بے محکمہ وزیر مقرر کیا تھا اور وہ جون 1996ء تک اس منصب پر فائز رہا۔ پیریز امیتل کو اعتدال پسند کہا کرتا تھا۔ تل نے امیتل کے نظریات کو واضح کرتے ہوئے اس کے مطبوعہ مضمون "یوم کپور جنگ (1973ء) کی اہمیت" سے کافی حوالے دیئے ہیں۔ امیتل کے روحانی جستجو اور مسیحانہ تصورات پر اصرار کی تصویر کشی کرتے ہوئے تل نے درج ذیل عبارت کا حوالہ دیا ہے:

مملکتِ اسرائیل کے پس منظر کے احیاء کے خلاف جنگ شروع ہو گئی جو اپنے مابعد الطبعیاتی (نہ کہ صرف علامتی) درجے میں مغربی دنیا میں ناپاکی کی روح کے زوال کی

آئینہ دار ہے.......... جینگائل صرف جینگائل کے طور پر اپنی بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ بدی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ خدا کی جنگوں میں شیطان کی، ناپاکی کی اور مغربی کلچر کی باقیات کی، جس کے پرچارک سیکولر یہودی ہیں، کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

تل امتیل اور یوں گش ایمونم کے بنیادی تصوررات کو مزید یوں واضح کرتا ہے:

اس سوچ کے مطابق جدید سیکولر دنیا ''بقا کی جدوجہد کر رہی ہے اور یوں ہماری جنگ مغربی کلچر کی ناپاکی کے ساتھ اور عقلیت پسندی کے خلاف ہے۔'' اس کے مطابق اجنبی کلچر کو مٹا دینا ہوگا کیونکہ ''ہر بیرونی شے ہمیں اجنبیت کے قریب تر کر دیتی ہے اور اجنبیت ہمیں بیگانگی کا شکار کر دیتی ہے۔ جیسا کہ مغربی کلچر سے وابستہ لوگوں اور منطق اثباتیت اور جمہوری کلچر کے ذریعے یہودیت کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والے لوگوں کی صورتِ حال سے عیاں ہے۔'' امتیل کی سوچ کے مطابق یوم کپور کی جنگ کی مسیحانہ جہت کو سمجھنا ہوگا یعنی یہ کہ یہ تہذیب کے خلاف ایک جنگ تھی۔

تل اپنی بحث میں امتیل سے ایک کثیر پہلو اور سنجیدہ سوال پوچھتا ہے: اس تمام ابتلا کی کیا منطق ہے؟ اگر مسیح پہلے ہی آ چکا ہے اور مملکتِ اسرائیل پہلے ہی قائم ہو چکی ہے تو جنگیں کیوں جاری ہیں؟'' امتیل نے جواب دیا؟ ''جنگ پاکی کے عمل کو شروع کرتی ہے، اسرائیل کے مذہبی لوگوں کی پاکی اور طہارت کے عمل کو۔'' تل بحث جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے ''ہمیں جنگوں کی صرف ایک توضیح فراہم کی جاتی ہے کہ یہ روح کو پاک صاف کرتی ہے۔ جونہی ناپاکی ختم ہوگی، اسرائیل کی روح...... جنگ کی وجہ سے...... پاک صاف ہو جائے گی۔ ہم زمینوں کو تو پہلے ہی فتح کر چکے ہیں، اب جو کچھ باقی ہے، وہ سب ناپاکی ہے۔''

دونوں ربی ککوں (Cooks) کے پیروکاروں نے اسرائیل کی تمام دوسری جنگوں پر مذکورہ بالا تصورات کا اطلاق کیا ہے۔ مثال کے طور پر ربی شمریا ہوا ایریئلی نے تل کے بقول واضح کیا ہے کہ 1967ء کی جنگ ایک ''مابعد الطبعیاتی کایا کلپ'' تھی اور اسرائیل کی فتح زمین کو شیطانی قوتوں کے دائرے سے نکال کر الوہی دائرے میں لے آئی تھی۔ اس سے مفروضے کی سطح پر یہ ثابت ہو گیا کہ ''مسیحانہ دور'' شروع ہو چکا ہے۔ تل نے ربی ای ہدایا کی تعلیمات سے بھی اقتباس دیا ہے: 1967ء کی فتوحات نے زمین کو دوسرے فریق (شیطان کا مہذبانہ نام) سے آزاد کرا لیا، ایک باطنی قوت سے جو کہ شر، ناپاکی اور کرپشن کی تجسیم ہے۔ یوں ہم یہودی ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں، جس میں دنیا پر مطلق حاکمیت قائم ہو جاتی ہے'' تل اس بات پر زور دیتا ہے کہ ایسے بیانات ایک انتباہ ہیں کہ مفتوحہ علاقوں سے اسرائیلی انخلا کے مابعد الطبعیاتی نتائج برآمد ہوں گے، جس سے زمین پر شیطان کا اقتدار دوبارہ قائم ہو سکتا ہے۔ گش ایمونم کے دیگر لیڈر اپنے عوامی بیانات اور تحریروں میں براہِ راست اور بالواسطہ ایسے ہی تصورات کا اظہار کرتے ہیں۔

اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ گش ایمونم اسرائیل کے یہودی مذہبی لیڈروں اور عام لوگوں پر سنجیدہ اثرات قائم کر چکی ہے۔ مثال کے طور پر لبنان پر اسرائیل کی یلغار کے زمانے میں اسرائیل کے فوجی ربیوں نے، جو کہ دونوں گروں سے واضح طور پر متاثر دکھائی دیتے تھے، تمام اسرائیلی فوجیوں کو تلقین کی کہ وہ جوشوا کے نقشِ قدم پر چلیں اور ارضِ اسرائیل کی الوہی فتح کو دوبارہ عمل میں لائیں۔ اس فتح کی تلقین میں غیر یہودیوں کو فنا کرنا بھی شامل تھا۔ فوجی ربیوں نے لبنان کا ایک ایسا نقشہ شائع کیا، جس میں لبنانی شہروں اور قصبوں کے ناموں کی بجائے وہ نام درج تھے جو کہ جوشوا کی کتاب میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر بیروت (Beirut) کا نام بی روت (Be'erot) درج کیا گیا تھا۔

لبنان کو اس نقشے میں قدیم شمالی اسرائیلی قبائل ایشرا اور میفتالی کا علاقہ قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ تل نے لکھا: ''لبنان میں اسرائیلی فوج کی موجودگی سے ڈیوٹیرونومی 11:24 میں کیا گیا انجیلی وعدہ پورا ہو گیا کہ جس جگہ تمہارے جوتے کا تلا رکھا جائے گا، وہ تمہاری ہو جائے گی، ہماری سرحد ویرانے سے، دریائے فرات سے مغربی سمندر تک ہو گی۔'' دونوں ربی کک کے پیروکاروں نے لبنان کو یوں تصور کیا کہ اسے شیطان کے قبضے سے آزاد کرایا جا رہا ہے، جس کے دوران اس کے سارے باسی ہلاک ہو جائیں گے۔ یہ تصور غیر معمولی نہیں ہے، اس جیسے بہت سے قدیم اور جدید تصورات موجود ہیں، مذہبی بھی اور سیکولر بھی۔ شر سے زمین کی ہلاکت انگیز پاکی اور خدا کے برتری پانے کا تصور مشترک اور عام ہے۔ مثال کے طور پر نتالی زیڈ۔ ڈیوس نے اپنی کتاب Society and Culture in Early Modern France کے باب The Rites of Violence میں سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں فرانس کے کیے ہوئے قتلِ عام کے جواز کے طور پر ایسے ہی تصور کو پیش کیا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو، نارمن کوہن نے اپنی عمدہ کتاب The Pursuit of Millennium میں ایسی عیسائی مذہبی تحریکوں پر گفتگو کی ہے جو ہزاری کا آغاز طاقت کے ایسے استعمال سے کرنا چاہتی تھیں، جو بہت سارے لوگوں کی ہلاکت کا باعث بنے۔

تل کے گش ایمونم والے تجزیے پر تین تشریحی اور مربوط تبصرے کیے جانے چاہئیں۔ اول، ربی، جن کا حوالہ تل اور اس کتاب کے مصنفین نے اتھارٹیز کے طور پر دیا ہے، معمولی نہیں بلکہ اہم اسرائیلی شخصیات ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ جب شیمون پیریز وزیر اعظم تھا، تب اس نے ایک ربی اعتل کو اعتدال پسند تصور کرتے ہوئے بے محکمہ وزیر مقرر کیا تھا۔ دوم، تل ''سیاسی مسیحانہ رجحان'' کے جوہر کو سمجھنے کا اہل تھا۔ جرمن نازی ازم، خصوصاً نازی آئیڈیالوجی اور اس کے مآخذ کے حوالے سے اس کے علم نے یقیناً اسے گش ایمونم کا تجزیہ کرنے میں مدد دی ہے۔

(ملاحظہ ہو تل کی عبرانی کتاب Political, Theology and the Third Reich, (Tel-Aviv University Press, 1989) یہودی سیاسی مسیحانہ رجحان اور جرمن نازی ازم میں حیران کن

مماثلتیں موجود ہیں۔ مسیحا پرستوں کے نزدیک جینٹائل ایسے ہی ہیں جیسے نازیوں کے نزدیک یہودی ہوتے تھے۔
دونوں تحریکیں میں مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عقلی اور جمہوری عناصر والے مغربی کلچر سے نفرت کرتی ہیں۔ سوم، مسیحا پرستوں کا انتہا پسندانہ شاونزم تمام غیر یہودیوں کے لیے ہے۔ مثال کے طور پر 1973ء کی یوم کپور جنگ اعتمل کے خیال میں مصریوں، شامیوں اور ایا تمام عربوں کے خلاف نہیں بلکہ تمام غیر یہودیوں کے خلاف تھی۔ اس طرح یہ جنگ امریکہ کے شہریوں کی اکثریت کے خلاف بھی تھی، حالانکہ امریکہ نے اس جنگ میں اسرائیل کی مدد کی تھی۔ غیر یہودیوں سے یہ نفرت نئی نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اس نے ایک قدیم کبالائی روایت سے جنم لیا ہے۔ جن یہودی سکالروں نے اس حقیقت کو غیر یہودیوں اور حتیٰ کہ بہت سے یہودیوں سے بھی چھپانے کی کوشش کی ہے انہوں نے جرمن نازی ازم کے اس یہودی مماثل کو پروان چڑھنے میں مدد دی ہے۔

دونوں ربی کک کی آئیڈیالوجی Eschatological بھی ہے اور مسیحانہ بھی۔ اس حوالے سے یہ پرانے یہودی نیز عیسائی اور اسلامی فلسفوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس آئیڈیالوجی میں فرض کیا گیا ہے کہ مسیح کی آمد متوقع ہے اور یہودی خدا کی مدد سے غیر یہودیوں پر غلبہ پا جائیں گے اور ہمیشہ ان پر حکومت کریں گے۔ (کہا جاتا ہے کہ یہ غیر یہودیوں کے لیے بہتر ہوگا) یا تمام موجودہ سیاسی پیشرفتیں اس کی جلد تکمیل میں مدد دیں گی یا اسے التوا میں ڈال دیں گی۔ یہودیوں کے گناہ، بالخصوص عقیدے کا فقدان، مسیح کی آمد کو التوا میں ڈال سکتے ہیں۔ تاہم یہ التوا بہت طویل نہیں ہوگا کیونکہ یہودیوں کے بدترین گناہ بھی نجات کا رخ تبدیل نہیں کر سکتے۔ تاہم گناہ نجات سے پہلے یہودیوں کی ابتلا میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ دو عالمی جنگیں، ہولوکاسٹ اور جدید تاریخ کے دوسرے المناک واقعات اس سزا کی مثالیں ہیں۔ ربی کک ایلڈر نے پہلی عالمی جنگ میں جانوں کے زیاں پر اپنی مسرت کو چھپایا نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جانوں کا زیاں ''شیطان کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے'' ضروری تھا۔ ربی کک ایلڈر کے پیروکاروں نے ایسے بیانات کی عمیق تشریحات کی ہیں مثال کے طور پر گش ایمونم کی ربیوں والی کونسل کے ایک رکن اور کریت اربا (Kiryat Arba) کے ربی ڈوولیور نے 1982ء میں اسرائیل کے لبنان پر حملے کی ناکامی کی وجہ عقیدے کے فقدان کو قرار دیا، جس کا اظہار مصر کے ساتھ امن معاہدے کرنے اور ''ہمارے آباؤ اجداد کی وراثت (سینائی) کو اجنبیوں'' کو واپس کرنے سے ہوا تھا۔ لیور نے 20 دسمبر کے ہداشوت سپلیمنٹ میں اپنے حوالے سے مضمون شائع کروایا۔ اس مضمون میں وہ کہتا ہے کہ مئی 1984ء میں جنوبیہ لبنان میں متعین دو اسرائیلی سفارت کاروں کی شامیوں کے ہاتھوں گرفتاری ''ہماری زیر زمین یہودی تنظیموں کے لڑکوں کے ساتھ قید کے دوران بدسلوکی کی سزا تھی۔'' لیور نے اس مضمون میں مزید لکھا کہ اس جرم کے نتیجے میں ''میں نہیں جانتا کہ تمام یہودیوں پر کتنی مصیبتیں نازل ہوں گی۔''

جو توضیحات نہایت عجیب و غریب دکھائی دیتی ہوں گش ایمونم کے پیروکار انہیں فوراً قبول کر لیتے ہیں، خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب ان کو یقین ہے کہ نجات نزدیک ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ شیطان، جیسا

کہ کبالا میں بیان کیا گیا ہے، منطق خوب جانتا ہے۔ ان کا یہ بھی ایقان ہے کہ شیطان کی قوت اور اس کی ارضی تجسیم یعنی غیر یہودیوں کو صرف غیر منطقی اقدام کے ذریعے ہی توڑا جاسکتا ہے۔ چنانچہ عین انہیں دنوں میں کہ جب امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر اسرائیل آیا، گش ایمونم نے آبادیاں قائم کر کے نہ صرف اپنی قوت کا اظہار کیا بلکہ یہ عمل شیطان کی قوت اور اس کے امریکی روپ کو توڑنے کا ایک باطنی منصوبہ بھی تھا۔

ماضی میں مختلف یہودی تحریکوں نے ایسی ہی منطق سے کام لیا تھا، مثال کے طور پر 1665ء اور 1666ء میں جھوٹے مسیح شبتائی زوی اور ابتدائی ہیسیڈازم نے۔ کچھ خاص عیسائی اور اسلامی تحریکوں نے بھی کچھ خاص زمانوں میں اس سے ملتی جلتی منطق استعمال کی ہے۔

گش ایمونم کے نظریہ سازوں، خصوصاً ربی کک دی ایلڈر نے اپنے نظریات نہ صرف یہودی روایت سے اخذ کیے تھے بلکہ انہیں اختراع بھی کیا تھا۔ انہوں نے جس طرح مسیح کا تصور تشکیل دیا وہ دلچسپ ہے۔ بائبل میں صرف ایک مسیح کی آمد کا بیان ملتا ہے۔ یہودی تصوف دو مسیحوں کی پیش گوئی کرتا ہے۔ کبالا کے مطابق دونوں مسیح کردار کے اعتبار سے مختلف ہوں گے۔ پہلا مسیح، جو ایک عسکری شخصیت ہے اور ''یوسف کا بیٹا'' (Son of Joseph) کہلاتا ہے، نجات کے لیے مادی لوازمات تیار کرے گا۔ دوسرا مسیح ''داؤد کا روحانی بیٹا'' ہو گا، جو معجزوں کے ذریعے دنیا کو نجات عطا کرے گا (گش ایمونم کے پیروکاروں کا ایقان ہے کہ معجزے مختلف وقتوں میں رونما ہوں گے)۔ کبالائی تصور یہ ہے کہ دونوں مسیح منفرد ہوں گے۔ ربی کک دی ایلڈر نے اس تصور میں یہ تبدیلی کی کہ پہلا مسیح ایک اجتماعی ہستی ہو گا۔ کک نے اپنے پیروکاروں کو مجموعی طور پر ''یوسف کا بیٹا'' قرار دیا تھا۔ گش ایمونم کے لیڈر ربی کک دی ایلڈر اور ینگر کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اپنے ربیوں اور شاید تمام پیروکاروں کو کم از کم ایک مسیح اور شاید دونوں مسیحوں کا اجتماعی ظہور تصور کرتے ہیں۔ گش ایمونم کے اراکین کا ایقان ہے کہ اس تصور کو موزوں وقت سے پہلے کسی دوسرے شخص پر افشا نہیں کرنا چاہیے۔ ان کا یہ بھی ایقان ہے کہ ان کا فرقہ اپنی منزہ عن الخطا الوہی رہنمائی کی وجہ سے خطا نہیں کر سکتا۔

ربی کک کی دوسری اختراع کا تعلق جاہل بے عقیدہ یہودیوں، سیکولر اور مذہبی ہر دو، کے ساتھ پہلے مسیح کے رشتے سے ہے۔ ربی کک نے اس تصور کو بائبل کی اس پیش گوئی سے اخذ کیا تھا کہ ''نجات دہندہ'' مسیح ''ایک گدھے پر اور بجلی پر سوار ہو گا'' (Zechariah 9:9)۔ کبالا تصور کرتا ہے کہ یہ جملہ دو مسیحوں کی گواہی دیتا ہے: ایک جو گدھے پر سوار ہو گا اور دوسرا جو آسمانی بجلی پر سوار ہو گا۔ سوال یہاں یہ تھا کہ اجتماعی مسیح ایک گدھے پر کس طرح سوار ہو سکتا ہے؟ کک نے اس سوال کے جواب میں عقل اور درست عقیدے سے محروم یہودیوں کو گدھا قرار دیا۔ کک نے کہا کہ اجتماعی مسیح ان یہودیوں پر سوار ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسیح ان سے مالی فوائد حاصل کرے گا اور انہیں نجات کے قابل بنائے گا۔

ایک روحانی اعتبار سے طاقتور ہستی سے تعلق کے ذریعے نجات کا تصور یہودی تصوف کی تمام شاخوں

میں پایا جاتا ہے۔اس تصور کا اطلاق نہ صرف انسانوں اور ان کے گناہوں پر بلکہ جانوروں اور بے جان اشیا پر بھی کیا جاتا ہے۔اسرائیل میں یہ نظریہ آج بھی مذہبی تعلیم کا حصہ ہے۔مذہبی بچوں کے لیے لکھی گئیں مقبول کہانیوں میں بھی اس نظریے کو پیش کیا گیا ہے۔ایک مشہور کہانی ایک نیک جنگلی بطخ کی ہے،جس کو پکڑ کر ذبح کیا گیا اور ایک مقدس ربی کی خوراک بن کر یہ بطخ نجات پا گئی۔گش ایمونم نے اختراع یہ کی ہے کہ اس نظریئے کا اطلاق نہ صرف اجتماعی مسیح کی پیروی کر کے نجات پانے والے بے عقیدہ یہودیوں پر کیا گیا ہے بلکہ تمام قابلِ تصور بے جان اشیا پر بھی کیا گیا ہے جو ٹینکوں سے لے کر زر (Money) تک محیط ہیں۔اگر یہودی،خصوصاً مسیحا پرست یہودی،کسی شے کو چھو لیں یا اپنی ملکیت بنالیں تو وہ نجات پا جائے گی۔گش ایمونم کے ارکان اس نظریئے کا اطلاق ارضِ مقدس میں جاری تنازعے پر بھی کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ جس چیز کو یہودی آبادکاری کے لیے عربوں کی ملکیتی اراضی کا چھیننا کہا جاتا ہے،وہ سینہ زوری کا نہیں بلکہ پاک کرنے کا عمل ہے۔ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اس زمین کو شیطانی حلقے سے الوہی حلقے میں لا کر نجات دلا دی جاتی ہے۔گش ایمونم کے پیروکاروں کا ایقان ہے کہ یہ تنظیم ''کل'' اور واحد صداقت تک اپنی خصوصی رسائی کی وجہ سے باقی یہودیوں سے زیادہ اہم ہے۔گش ایمونم ربی مسیح کے گدھے کی تشبیہ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ مخلوقات کی درجہ بندی میں اپنے کمتر درجے کی وجہ سے گدھے کو اپنے الوہی سوار کے اعلیٰ مقصد سے لاعلم رہنا چاہیے۔کہا جاتا ہے کہ الوہی سوار گدھے کو اس کی نجات کی طرف لے جاتا ہے۔سوار اپنے اعلیٰ مقصد کے لیے سفر کے دوران گدھے کو لاتیں بھی مارے گا تا کہ وہ درست راستے پر چلتا رہے۔گش ایمونم کے ربیوں کا کہنا ہے کہ اس واحد مسیحانہ فرقے کو گدھوں جیسے یہودیوں کو قابو کرنا اور آگے بڑھانا ہوگا،جنھیں عقلیت پسندانہ اور جمہوری شیطانی مغربی کلچر نے بگاڑ دیا ہوا ہے اور جنھوں نے اپنی حیوانی عادتوں کو ترک کر کے سچا عقیدہ قبول کرنے کو رد کر دیا ہوا ہے۔اس عمل کو آگے بڑھانے کے لیے جہاں ضروری ہو وہاں طاقت استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

ربی کک کی آخری اختراع نے اس کے ابتدائی پیروکاروں اور نتیجتاً گش ایمونم کی مقبولیت اور سیاسی اثر میں نہایت فیصلہ کن کردار ادا کیا۔نجات کے دور میں یہ اختراع دنیاوی معاملات اور یہودیوں اور غیر یہودیوں کے ساتھ منتخب یہودیوں کے تعلق پر اثر انداز ہوتی ہے۔ربی کک نے کہا کہ منتخب یہودیوں کو دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہنا چاہیے،جیسے کہ وہ ماضی میں اکثر رہ چکے ہیں۔اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے کہ دوسرے لوگ گناہگار اور فطرتاً شیطان ہیں،منتخب یہودیوں کو معاشرے میں بھرپور حصہ لے کر اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان خلا کو پاٹنا چاہیے۔منتخب لوگوں کو ایک مثال قائم کرنی چاہیے۔سیاسی اثر و رسوخ بنانا چاہیے اور رفتہ رفتہ دوسرے لوگوں سے زیادہ تعلقات استوار کرنے چاہئیں۔1920ء کی دہائی سے اس فلسفے نے این آر پی سے تعلق رکھنے والے یہودیوں پر زبردست اثرات قائم کیے ہیں۔1974ء میں اپنے قیام کے بعد گش ایمونم نے عوام کی زبردست خفگی کے باوجود اس فلسفے کو قوت کے ساتھ نافذ کیا۔

ربی کک کے پیروکاروں نے سابقہ آرتھوڈوکس یہودیوں کے برعکس سیکولر یہودیوں جیسا لباس پہننا اور اپنے ظاہری امتیازی نشان کے طور پر سر پر ٹوپی رکھنا شروع کر دیا۔ وہ آج بھی 1950ء کی دہائی کے فیشن کا اسرائیلی سیکولر لباس پہنتے ہیں۔ اپنے سکولوں کے نصاب میں انہوں نے سیکولر مضامین کے کچھ اجزا شامل کیے ہیں۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو اسرائیلی سیکولر یونیورسٹیوں میں داخلے لینے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ تاہم انہوں نے مذہب اساس یونیورسٹی بارایلان قائم کی ہوئی ہے۔ اگرچہ گش ایمونم نے بارایلان یونیورسٹی کا سٹاف تو مذہبی یہودیوں میں سے چنا ہے تاہم اس میں تمام عمومی مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہیریڈم ان سب اقدامات کو سیکولرائزیشن تصور کرتے ہوئے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ربی کک باصرار کہتا تھا کہ لڑنا اور لڑائی کی تربیت حاصل کرنا ہر یہودی کا مذہبی فریضہ ہے۔ این آر پی کے اراکین اس کی اس ہدایت پر وفاداری کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ گش ایمونم کے بہت سے اراکین اسرائیلی فوج میں افسر رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ فوج میں ان کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ گش ایمونم کے مذہبی سکولوں کے طلبا اپنی جنگی صلاحیتوں، لڑنے کے زبردست جذبے، لبنان جنگ کے دوران زخمی ہونے کی زیادہ شرح اور انتفاضہ کے دوران فلسطینیوں پر تشدد کرنے کے لیے آمادگی کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

گش ایمونم فوجی ملازمت کے حوالے سے اپنے رجحان کی وجہ سے اسرائیلی یہودی معاشرے میں وسیع عوامی ہمدردی حاصل کر چکی ہے۔ اس کے برعکس ہیریڈم کے فوجی ملازمت سے گریز پر لوگ ان کو ناپسند کرتے ہیں۔ دونوں ربی کک نے تقریباً ہر صیہونی ادارے کو تقدس عطا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے گش ایمونم کے لیے وسیع تر عوامی ہمدردی اور حمایت رونما ہوئی۔ تل ربی کک دی ینگر اور گش ایمونم کی مذہبی صیہونی ظاہری صورت اور سیکولر لیفٹ کی ظاہری صورت میں فرق کرتا ہے۔ تل سیکولر لیفٹ کی صیہونیت کی ظاہری صورت کو "شاعرانہ" قرار دیتا ہے، "جس کے مطابق زمین کی طرف واپسی، فطری زندگی، زرعی کارنامے، سیکولر تخلیقیت صیہونیت کے لازمی اجزا ہیں۔" دونوں ربی کک نے تسلیم کیا کہ سیکولر لیفٹ کے تصورات مسیحانہ نجات میں غیر ارادی طور پر مددگار ثابت ہوں گے، تاہم انہوں نے "مقدس سرزمین پر فوجی فتوحات اور اس زمین پر یہودی خون بکھرنے" کے نظریے پر زور دیا۔ تل کے بقول ربی کک دی ینگر اور دیگر گش ایمونم لیڈر اس سے بھی آگے چلے گئے اور انہوں نے "ریاستِ اسرائیل کو مملکتِ اسرائیل اور مملکتِ اسرائیل کو زمین پر آسمانی بادشاہت قرار دیا۔" ربی کک کے پیروکار آج بھی اسرائیل کو "لارڈ کے تخت کی ارضی مدد" قرار دیتے ہیں۔ گش ایمونم کے ایک انتہائی اہم لیڈر اسرائیل ہیرل نے اپنے ہفتہ وار کالم میں ایک سیاسی موقف کے اظہار کے لیے اس تصور کو استعمال کیا۔ اس کا کالم 12 ستمبر 1996ء کو ہارٹز میں شائع ہوا تھا۔ ہیرل نے ربی کک کے ایک مطبوعہ مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ریاستِ اسرائیل "اس دنیا میں لارڈ کے تخت کی بنیاد ہے" اور یوں یہ "لاک، روسو اور دوسروں کی تصور کردہ" ریاستوں سے مختلف ہے اور اسے ان سے مختلف تصور کرنا چاہیے۔ ہیرل جیسے لوگ اسرائیل کے ہر عمل

کو کاملاً مقدس مانتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں وہ عمل الوہی رہنمائی کے تحت ہوا ہوتا ہے۔ تل لکھتا ہے کہ اس نقطۂ نظر سے "آخرِکار ہر عمل، ہر مظہر، بشمول سیکولرازم تقدس کا، نجات کا حصہ بن جائے گا۔" یہ امر نا قابلِ تصور نہیں ہے کہ اس قسم کی تقدیس شیطان کی قوت کو ختم کرنے اور "اس دنیا میں لارڈ کے تخت کی بنیاد" قائم کرنے کے لیے ایٹم بموں کے پھٹنے کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

گش ایمونم کے اراکین اور این آر پی کے حامیوں کی اکثریت کئی حوالوں سے صیہونی رائدین (Pioneers) سے مشابہہ ہیں۔ اس حقیقت نے ان کے عوامی تاثر کو مضبوط بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں کے رائدین کے جانشینوں کے طور پر پیش کر کے اس تاثر کو مضبوط بنایا ہے۔ وہ رائدین آج بھی یہودی قومی حافظے کا جزو ہیں اور اسرائیلی تعلیم میں ان کی تعریف کی گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، گش ایمونم کے اراکین سوائے اپنی ٹوپیوں کے، رائدین کے لباس اور اطوار کی نقل کرتے ہیں۔ رائدین اور گش ایمونم آبادکاروں کا تقریباً مخصوص اشکینازی پس منظر انہیں اس نقالی میں مدد دیتا ہے۔ تمام گش ایمونم ربی اشکینازی ہیں۔ گش ایمونم ربیوں میں مشرقی یہودیوں کی عدم موجودگی کی وجہ مذہبی تعلیم کے مسلمہ اسرائیلی معیارات ہیں، جن پر ہم تیسرے باب میں بات کر چکے ہیں۔ اگرچہ مشرقی یہودی گش ایمونم میں شامل ہونے پر تو رضامند نہیں، تاہم انہوں نے اس کی مدد کی ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ لیکوڈ حلقۂ انتخاب بھی گش ایمونم کی مستقلاً حمایت کرتا ہے۔ اس کے برعکس لیبر پارٹی کے بیشتر اراکین نے 1970ء کے عشرے کے آخر تک گش ایمونم کی حمایت کی تاہم مصر کے ساتھ امن معاہدے کی مخالفت کرنے اور لبنان کو "ہمارے آباؤاجداد ایشر اور نفتالی قبیلوں کی وراثت کے ایک جزو کے طور پر" اسرائیل کا حصہ بنانے کا مطالبہ کرنے پر انہوں نے گش ایمونم کی حمایت ترک کر دی۔

گش ایمونم نے دوسری انتہا پسندانہ پالیسیوں کی وکالت جاری رکھی اور 1982ء میں لبنانی فلانجسٹوں کے ساتھ شیرون کے اتحاد کی شدید مخالفت کر کے، کہ وہ عیسائی اور لہٰذا کافر تھے، لیبر پارٹی کے بہت سے حامیوں کو خود سے ناراض کر دیا۔ گش ایمونم کا موقف 1982ء میں یہ تھا کہ یہودیوں کو اپنی جنگوں اور فتوحات میں صرف خدا کی مدد پر انحصار کرنا چاہیے۔ غیر یہودیوں کے ساتھ کوئی معاہدہ خدا کو غصہ دلا دے گا اور اس کی مدد رکنے کا باعث بنے گا۔ ایسے تصورات لیبر پارٹی کے انتہا پسندوں کے لیے بھی قابلِ قبول نہیں تھے۔

گش ایمونم اور این آر پی کی سیاست کو آئیڈیالوجی کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ ان گروپوں کے اراکین جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، آئیڈیالوجی اس کی وضاحت کرتی ہے۔ انگریزی میں لکھی گئیں کتابیں بدقسمتی سے اس آئیڈیالوجی کو پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ لسٹک کی کتاب For Land and the Lord اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس کتاب میں گش ایمونم کے خارجی سیاسی رویے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ لسٹک نے گش ایمونم کی سیاسی آئیڈیالوجی کا تجزیہ کرنے کے لیے ہیرالڈ فسک کی تحریروں پر بہت زیادہ انحصار کیا ہے۔ فسک

انگریزی ادب کا پروفیسر ہے اور تالمود اور کبالا کے حوالے سے محدود علم کا حامل ہے۔ وہ زیادہ تر انگریزی بولنے والے قارئین کے لیے لکھتا ہے اور اس نے بنیادی طور پر امریکہ کے عیسائی بنیاد پرستوں پر توجہ دی ہے۔ لسٹک نے کسی حد تک ربی مینا کم کیشر کی تحریروں پر انحصار کیا ہے۔ کیشر ایک انتہائی موقر تالمودی سکالر تھا، جو عبرانی میں لکھتا تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو گش ایمونم میں شامل ہونے پر مائل کیا تھا۔ بہت سے گش ایمونم اور یشیوا طلبا اس کی مسیحانہ تحریروں سے واقف ہیں۔ لسٹک نے کیشر کے صرف دو مختصر سے حوالے دئیے ہیں اور پھر اپنے ہی حوالوں کو مبہم بنا دیا ہے۔ ہماری کتاب میں کیشر کی تحریروں پر انحصار کیا گیا ہے اور ہم نے گش ایمونم والوں کی دوسری تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

گش ایمونم کے کارکن غربی کنارے میں اپنے زیر قبضہ یک نسلی علاقے میں رہتے ہیں۔ اس معاشرے کو ''ناپاک'' کر دینے والے تصورات ونظریات سے محفوظ رکھا جاتا ہے، خصوصاً ان سے جو کہ مغربی کلچر سے ابھرے ہیں اور اسرائیلی یہودی معاشرے کے سیکولر حصے کو کافی متاثر کر چکے ہیں۔ یہ امکان واضح طور پر موجود ہے کہ گش ایمونم کا یک نسلی معاشرہ اور اس کے این آر پی والے حامی اسرائیلی معاشرے کے اندر اپنی سیاسی قوت اور اثر ونفوذ بڑھا سکتے ہیں۔

دونوں ربی کک کی آئیڈیالوجی این آر پی اور گش ایمونم کے سیاسی عمل کو متعین کرنے والی قوت ہے۔ گش ایمونم کا بنیادی سیاسی عقیدہ یہ ہے کہ یہودی منفرد لوگ ہیں۔ تمام آرتھوڈوکس یہودی بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں، تاہم وہ اس کی تعبیر کسی حد تک مختلف کرتے ہیں۔ لسٹک نے اس عقیدے کا تجزیہ ایک کلاسیک سیکولر صیہونی تصور کے گش ایمونم کی طرف سے استرداد پر توجہ مرکوز کر کے کیا ہے۔ لسٹک نے اس تصور کے دو مفروضوں کی درست نشان دہی کی ہے۔ پہلا یہ کہ ''یہودی حیات کو اسرائیل سے باہر ابنارمل قیام نے انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر مسخ کر دیا ہے۔'' دوسرا یہ کہ صرف ''ایک نارملائزیشن کے عمل'' کے ذریعے، فلسطین کی طرف نقل مکانی کر کے اور ایک یہودی ریاست کو تشکیل دے کر ہی یہودی ایک نارمل قوم بن سکتے ہیں۔ لسٹک فسک کے حوالے سے لکھتا ہے کہ گش ایمونم کے لیے یہ کلاسیکی تصور ''سیکولر صیہونیوں کا اصل مغالطہ ہے۔ گش ایمونم کی دلیل یہ ہے کہ سیکولر صیہونی اس ''نارملیٹی'' کا پیمانہ غیر یہودی معیارات کو بناتے ہیں جو کہ شیطانی ہیں۔ سیکولر صیہونیوں نے کچھ خاص اقوام پر توجہ مرکوز کی اور انہیں ''نارمل'' قرار دیا اور کہا کہ ان نارمل قوموں کے غیر یہودی لوگ بیشتر بے وطن یہودیوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ سیکولر صیہونیوں کا کہنا تھا کہ اسی لیے یہودیوں کو ایک ''نارمل'' قومی ریاست میں ''نارمل'' قوم بننے کے لیے ان غیر یہودی لوگوں کی نقل کرنی چاہیے۔ گش ایمونم کا جوابی استدلال یہ ہے کہ ''یہودی نارمل لوگ نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ ان کی ازلی انفرادیت اس معاہدے کا نتیجہ ہے جو کہ خدا نے کوہِ سینائی پر ان کے ساتھ کیا تھا۔'' لسٹک گش ایمونم کے اس موقف کی مزید تشریح کے لیے اس کے ایک لیڈر ربی ایویز کا حوالہ دیتا ہے: ''خدا کو انصاف اور نیکوکاری کے تجریدی ضابطوں پر عمل کرنے کے لیے نارمل قوموں کی

ضرورت ہے، یہودیوں پر ایسے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔" ہیریڈی ربی بھی اکثر اس تصور کو اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں تاہم وہ کہتے ہیں کہ اس کے نتائج آنے والے مسیحانہ دور میں ظاہر ہوں گے۔ ہلاکا انصاف اور نیکوکاری کے قوانین پر بحث کرتے ہوئے ان کی تائید کرتا ہے۔ ہلاکا یہودیوں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ جن علاقوں میں غیر یہودیوں سے زیادہ مضبوط ہوں، وہاں ان کا مال اسباب لوٹ سکتے ہیں۔ ہلاکا یہودیوں کو ان علاقوں میں غیر یہودیوں کو لوٹنے سے منع کرتی ہے جہاں غیر یہودی زیادہ مضبوط ہوں۔ گش ایمونم ایسے روایتی تصورات کو یہ دعویٰ کرتے ہوئے نہیں مانتی کہ یہودی، کم از کم اسرائیل اور مقبوضہ علاقوں کے یہودی، مسیحانہ دور کے آغاز میں جی رہے ہیں۔

لسٹک مسیحانہ دور کی خصوصیات اور یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین فرق اطمینان بخش انداز میں بیان کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ہارکابی نے بہر حال زیادہ بہتر تجزیہ کیا ہے۔ قتل کے حوالے سے ہلاکا کی تعلیمات اور گش ایمونم کے موقف کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ہارکابی واضح کرتا ہے کہ یہودی قانون کے مطابق کسی غیر یہودی کا کسی یہودی کو قتل کر دینا بدترین جرم ہے۔ اس کے بعد اس نے گش ایمونم کے لیڈر ربی اسرائیل ایریئل کا حوالہ دیا ہے۔ ربی ایریئل ہلاکا اور ابنِ میمون کی کتاب کی بنیاد پر لکھتا ہے: "کسی غیر یہودی کو قتل کرنے والا یہودی انسانی جزا سزا سے مستثنیٰ ہے اور اس نے قتل کی مذہبی ممانعت کی خلاف ورزی نہیں کی ہوتی۔" ہارکابی مزید لکھتا ہے کہ جب "یہ بات سنی جائے کہ یہودی ریاست کے تمام غیر یہودی باشندوں کے ساتھ ہلاکا کے ضابطوں کے مطابق سلوک کیا جائے گا" تو ربی ایریئل کی بات کو ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ گش ایمونم کے ربی مسلسل کہتے رہے ہیں کہ عربوں کو قتل کرنے والے یہودیوں کو سزا نہیں دی جانی چاہیے۔ گش ایمونم کے اراکین سیکولر اسرائیلی عدالتوں سے سزا پانے والے ایسے یہودیوں کی نہ صرف مدد کرتے ہیں بلکہ انہیں "قاتل" بھی نہیں کہتے۔ اس سے منطقی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی آبادکار اور ان کے پیروکار "یہودی خون بہنے" پر تو زور دیتے ہیں لیکن "غیر یہودی خون بہنے" پر تھوڑی سی فکرمندی بھی ظاہر نہیں کرتے۔ اسرائیلی پالیسیوں پر گش ایمونم کے اثر کو اس حقیقت سے ماپا جا سکتا ہے کہ اس معاملے پر اسرائیلی حکومت کی پالیسی گش ایمونم کے موقف کی واضح عکاسی کر چکی ہے۔ لیبر اور لیکوڈ کی قیادت میں اسرائیلی حکومت یہودیوں کے قاتل فلسطینیوں کو رہا کرنے سے انکار کر چکی ہے تاہم اس نے غیر یہودیوں کے قاتلوں کو رہا کرنے میں تامل نہیں کیا۔

گش ایمونم کے اثرات کی ایک اور مثال یہ ہے کہ مقبوضہ علاقوں کے تمام معاملات میں اسرائیلی حکومت اس کے موقف کے مطابق عمل کرتی ہے۔ گش ایمونم اسرائیلی حکام کو مسلسل انگیخت کر رہی ہے کہ وہ غربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں رہنے والے فلسطینیوں کے ساتھ سفاکانہ برتاؤ کریں۔ ایک بھی یہودی آبادی کو ختم کرنے کا اعلان نہ کرنے والے وزرائے اعظم رابن، پیریز اور نیتن یاہو پر گش ایمونم کے اثرات واضح ہیں۔ تمام اسرائیلی حکومتوں اور مختلف سیاسی عزائم رکھنے والے سیاسی لیڈروں پر گش ایمونم کا اثر و نفوذ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

گش ایمونم کا فلسطینیوں، جنھیں ہمیشہ "اسرائیل میں رہنے والے عرب" کہا جاتا ہے، کے حوالے سے رجحان بہت اہم ہے۔ لسٹک نے اس موضوع سے زیادہ تر گریز کیا ہے۔ ہارکابی نے ربی زوی یہودا ککگ، ربی شلومو اویزر اور ربی اسرائیل ایریئل کے حوالے سے اس موضوع پر دیانتداری سے لکھا ہے۔ کک، اویزر اور ایریئل اسرائیل میں رہنے والے عربوں کو چور سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے کی بنیاد یہ مفروضہ ہے کہ اسرائیل کی ساری زمین یہودی تھی اور رہی ہے، لہٰذا یہاں کی ساری جائیداد یہودیوں کی ہے۔ ہارکابی کو اپنی کتاب لکھنے کے لیے تحقیق کے دوران جب اس حقیقت کا علم ہوا تو وہ دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے لکھا ہے: "میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسرائیلی تاریخی حق کی تعبیر اس طرح سے کریں گے۔" ہارکابی نے اس فلسفے کی لاتعداد توسیعات اور اطلاقات بیان کیے ہیں۔ اس نے نشاندہی کی ہے کہ گش ایمونم کے لیے سینائی اور موجودہ زمانے کا لبنان یہودی وطن کا حصہ ہیں اور اسرائیل کو انھیں لازماً آزاد کروانا چاہیے۔ ربی ایریئل نے ایک اٹلس شائع کروائی ہے جس میں یہودی علاقوں کی نشاندہی کر کے انھیں آزاد کروانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس میں دریائے فرات کے مغرب اور جنوب کے تمام علاقے شامل ہیں، جن میں کویت بھی آتا ہے۔ ہارکابی نے ربی اویزر کا یہ جملہ نقل کیا ہے: "ہم جنگ کی قیمت پر بھی اس ملک میں رہیں گے۔ مزید برآں اگر امن قائم ہو تو ہمیں لازماً اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے جنگیں چھیڑ دینی چاہئیں۔" یہ مفروضہ قائم کرنا غیر معقولیت نہیں ہوگی کہ اگر گش ایمونم کو اقتدار ملا تو وہ اپنے مقصد کے حصول کی کوشش میں لڑی جانے والی جنگ کے دوران ایٹمی ہتھیار استعمال کرے گی۔

جیسا کہ ہارکابی نے وضاحت سے اور لسٹک نے بالواسطہ انداز میں لکھا ہے کہ گش ایمونم کے نزدیک ریاستِ اسرائیل میں رہنے والے غیر یہودیوں کی کمتری میں جان اور املاک کے علاوہ مزید زمرے بھی شامل ہیں۔ گش ایمونم نے اسرائیل کے اختیار کرنے کے لیے ایک خارجہ پالیسی بنا رکھی ہے۔ اس پالیسی میں کہا گیا ہے کہ عربوں کا یہودیوں کے ساتھ معاندانہ سلوک نوعیت کے اعتبار سے الٰہیاتی اور موروثی ہے۔ نتیجتاً اس سے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ عرب اسرائیل تنازعے کو سیاسی انداز میں حل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نتیجہ لسٹک نے گش ایمونم کے ممتاز رہنما اور کنیسٹ کے سابق رکن ایلیازر والڈمین کا حوالہ دیتے ہوئے اخذ کیا ہے۔ والڈمین نے کہا تھا: "عرب معاندت بھی سامیت دشمنی کی طرح یہودیوں سے محفوظ رہنے کی عالمی بیماری سے پیدا ہوئی ہے۔" (PP.77-9) لسٹک نے گش ایمونم کے دوسرے لیڈروں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ جنھوں نے "موجودہ دور میں پورے اسرائیل پر اس کے مطلق اقتدار کے قیام کی مزاحمت کرنے والے اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ" سیاسی معاہدوں کے اپنے استرداد میں کوئی شک نہیں رہنے دیا۔ لسٹک نے فسک کی تحریر سے اقتباس دیا ہے، جو کہتا ہے کہ عرب مزاحمت کو "ان کی اجتماعی موت کی خواہش پوری کرنے" کی جستجو قرار دیا جا سکتا ہے۔ گش ایمونم کے ربی، سیاستدان اور نظریاتی مشتہرین فلسطینیوں کو عموماً قدیم کنعانیوں سے تشبیہ دیتے ہیں، جن کی قدیم اسرائیلیوں کے ہاتھوں مکمل فنا یا اخراج بائبل کے مطابق پہلے سے طے شدہ تھی۔ بائبل کے نسل پرستانہ تصور نے عیسائی بنیاد

پرستوں میں گش ایمونم کے لیے زبردست ہمدردی پیدا کردی ہے، کیونکہ وہ ایمان رکھتے ہیں کہ دنیا کا خاتمہ قتل و غارت اور تباہی و بربادی کے ساتھ وقوع پذیر ہوگا۔ گش ایمونم نے اپنی شروعات جتنا زیادہ فلسطینیوں کی ہلاکت ممکن ہوا انہیں مارنے کی خواہش سے کی تھی۔ فلسطینی دہشت گردی نے گش ایمونم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ان کے مکمل اخراج کے حقیقی مطالبے کو "سلامتی کی ضروریات" کے لبادے میں ملفوف کر کے پیش کرے۔

ہارکابی نے یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی کے ایک لیکچرار مورڈیکائی نسان کے تصورات کا حوالہ دیا ہے، جو کہ عالمی صیہونی آرگنائزیشن کے سرکاری رسالے "کیوونیم" کے اگست 1984ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے (PP.151-6) نسان نے ابنِ میمون کے حوالے سے لکھا ہے کہ جن غیر یہودیوں کو ارضِ اسرائیل میں رہنے کی اجازت مل گئی ہو انہیں "لازماً ایک ٹیکس ادا اور غلامی کی ذلت برداشت کرنا ہوگی۔" نسان، ہارکابی کے بقول، ابن میمون کی ایک مذہبی کتاب کے مندرجات کی روشنی میں مطالبہ کرتا ہے کہ ایک غیر یہودی کو "ذلیل کر کے رکھا جائے اور اسے اپنا سر یہودیوں کے سامنے اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے۔" ہارکابی نے نسان کی مزید تحریروں کا حوالہ دیا ہے کہ: "غیر یہودیوں کو یہودیوں سے برتر عہدے پر بالکل فائز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ ذلت کی زندگی گزارنے سے انکار کریں تو یہ بغاوت اور ارضِ اسرائیل سے ان کے انخلا کے لیے یہودیوں کے جنگ کرنے کا نشان ہوگا۔" عالمی صیہونی تنظیم کے سرکاری رسالے میں غیر یہودیوں کے حوالے سے شائع ہونے والے یہ تصورات یہودیوں کے حوالے سے شائع ہونے والے نازیوں کے تصورات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ہارکابی کہتا ہے "میں نہیں جانتا کہ کتنے یہودی نسان کے جیسے خیالات رکھتے ہیں، تاہم ایک ممتاز صیہونی رسالے میں اس کے مضمون کی اشاعت بہت گہری تشویش کا باعث ہے۔"

ذیل میں دی گئیں عبرانی زبان کے اخبارات میں شائع ہونے والے تین مضامین کی مثالیں این آر پی اور گش ایمونم کے رجحانات پر مزید روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون گش ایمونم کے اندر موجود سب سے زیادہ انتہا پسند گروپ ایمونم (باعقیدہ) کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ ایمونم کا قیام 1992ء میں رابن حکومت کے قیام کے بعد عمل میں آیا تھا۔ ایمونم کا لیڈر ربی بینی ایلون ہے، جو اسرائیلی سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ نائب صدر میناکم ایلون کا بیٹا ہے۔ ناڈو شرگائی نے 18 ستمبر 1992ء کے ہارتز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں ربی ایلون کی تحریر کا درج ذیل اقتباس دیا ہے:

> 1970ء کی دہائی کے وسط کا طریقہ میرٹز پارٹی کے وضع کردہ اخلاقی خاکے کے مطابق چلنے والی حکومت کے تحت مزید کارآمد نہیں رہے گا۔ اس پارٹی کے اراکین کے ذہنوں اور دلوں میں پوری ارضِ اسرائیل اور یہودیت کے لیے تحقیر بھری ہوئی ہے۔ وہ نہ صرف ارضِ اسرائیل کے وسط میں یہودیوں سے خالی ریاستِ فلسطین قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ اسرائیل کی یہودی ریاست کی جگہ ایک سیکولر جمہوری ریاست قائم کرنے

کے خواہاں ہیں۔ یہ حکومت روحانی اعتبار سے گل سڑ چکی ہے۔

پھر ربی ایلیونی نے 1980ء کے عشرے کے وسط اور اس سے پہلے کے لیبر لیڈروں سے 1992ء کی حکومت کے لیڈروں کا موازنہ کیا اور کہا کہ وہ ''یہودیوں کے جذبات'' کا احترام کرتے تھے اور گش ایمونم کے دباؤ کو قبول کر لیتے تھے۔ ایلیون مزید لکھتا ہے: ''تاہم تم میریٹز سے تعلق رکھنے والے کنیسٹ کے رکن ڈیڈی زوکریا میریٹز کے رکن موشے امیر یو جیسے لوگوں پر ایسے ہی طریقے نہیں آزما سکتے، جو کہ ہمارے دشمنوں جیسے کام کرتے ہیں۔'' ایوی راز نے ''ماریو'' کے 18 ستمبر 1992ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے مضمون کے لیے ایلیون سے سوال کیا اور ایمونم کے ہتھکنڈوں کو دریافت کیا: ''ایمونم چاہتی ہے کہ رابن (اس وقت کا وزیراعظم) کو کنیسٹ میں اکثریت کے لیے عرب پارٹیوں کے اراکین کی حمایت حاصل کرنے پر مجبور کرے تا کہ اس کی حکومت کا قانونی جواز برباد ہو جائے۔'' رابن اور پیریز نے عربوں کو رعائتیں تو دیں لیکن یہودی آبادیوں کی توسیع پر اڑے رہے۔ راز نے اپنے مضمون میں ایلیون کا درج ذیل بیان نقل کیا:

> جب رافائیل ایٹن اسرائیل کی سلامتی کے حوالے سے یہودی آبادیوں کا جواز دیتا ہے تو وہ روحانی نقطۂ نظر سے غلطی پر ہوتا ہے اور اس پر تنقید کی جانی چاہیے۔ آبادکاری کے حق میں سلامتی کے مسائل کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ جہاں تک میرا مشاہدہ ہے، سیاست کا انحصار روحانیت پر ہے۔ سیاست جسم ہے، اسے روح کی ضرورت ہے۔ اسرائیل کی سلامتی یہودی گہرائی کی محض مادی جہات ہیں، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ جب ہم ایسا کہتے ہیں تو ہمیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے کہ یہودی ریاست کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے فلسطینی ریاست کا قیام ضروری ہے۔ جب ہم ایسا سوچتے ہیں تو روحانی معاملات پر بات نہیں کر رہے ہوتے۔''

جیسا کہ راز نے تبصرہ کیا ہے: ''ایلیون اور اس کے ساتھی گہری روحانیت سے سرشار ہو کر پانچ دنوں کے لیے امریکہ گئے تا کہ اپنی سرگرمیوں کے لیے عیسائی بنیاد پرستوں سے مالی امداد دینے کی درخواست کریں۔'' ایلیون اور اس کے ساتھی اپنی مطلوبہ رقوم پانے میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ غیر یہودیوں سے گھن کھانے اور نفرت کرنے والے یہودی بنیاد پرست ہوتے ہوئے انہوں نے ایسے عیسائیوں کے ساتھ اتحاد قائم کیا جن کا ایقان ہے کہ مسیح کی دوبارہ آمد کے لیے یہودی بنیاد پرستی کی مدد کرنا ضروری ہے۔ یہ اتحاد امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ کی سیاست کا ایک اہم عامل بن چکا ہے۔

دوسری مثال کا تعلق 1990ء کی دہائی میں لیبر اور میریٹز حکومت کے تحت خود گش ایمونم کی پالیسیوں سے ہے۔ ڈینی روبنسٹائن نے 5 اکتوبر 1992ء کے ہارتز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں گش ایمونم کے ان لیڈروں کا حوالہ دیا ہے جن کا ایقان ہے کہ رابن کی پالیسیوں کا مقصد ''مقبوضہ علاقوں میں موجود یہودی آبادیوں

اور تمام صیہونی کارناموں کو جڑ بنیاد سے برباد کرنا" تھا۔ روبنسٹائن احتیاط کے ساتھ جولان کی پہاڑیوں کے سیکولر آبادکاروں اور گش ایمونم میں فرق کرتا ہے۔ جولان کی پہاڑیوں کے آبادکاروں کا دعویٰ تھا کہ رابن کی پالیسیاں غلط ہیں، کیونکہ شام کے ساتھ امن اسرائیلی شرائط پر ہوسکتا تھا۔ گش ایمونم کا دعویٰ تھا کہ "پی ایل او کے ساتھ واشنگٹن میں ہونے والے مذاکرات انسانوں کے بھیڑیوں کے ریوڑ کے ساتھ گفتگو سے زیادہ نہیں ہیں، جس کا واحد مقصد ساری ارضِ اسرائیل کو عربوں کا وطن بنانا ہے۔" اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گش ایمونم نے "بھیڑیوں کے ریوڑ" کے ساتھ مذاکرات کرنے والی حکومت سے اپنے مقاصد کے لیے رقوم حاصل کرنے سے انکار کیا ہو!

ناڈو شرگائی نے 14 اکتوبر 1992ء کے ہارتز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں ایک سمپوزیم پر گفتگو کی ہے، جس کا انعقاد وزارتِ مذہب نے وزارتِ تعلیم کے اشتراک سے کیا تھا، جس کی وزیر شلامیت ایلونی تھی۔ اس سمپوزیم کا موضوع تھا "کیا مقدس سرزمین پر مقیم غیروں کے لیے خودمختاری درست ہے؟" سمپوزیم کے مرکزی مقرر ربی شلوموگورن نے کہا: "خودمختاری یہودیت سے انکار ہے۔" گورن کے بقول ہلاکا یہودیت سے انکار کو سنگین ترین یہودی گناہ تصور کرتی ہے اور نیک یہودیوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ یہودیت سے انکار کرنے والے کافروں کو قتل کردیں۔ ربی گورن خودمختاری کی وکالت کرنے والوں کو ایسے ہی کافر قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ پتا چلا کہ رابن کو مذہبی وجوہات سے قتل کیا گیا تھا۔ گورن نے مزید کہا کہ یہودیت ارضِ اسرائیل میں غیرملکیوں کے کسی گروپ کو قومی حقوق دینے سے "منع کرتی ہے۔ گولان نے اس بات کو بھی تسلیم نہیں کیا کہ ایک فلسطینی قوم وجود رکھتی ہے۔ اس نے کہا: "فلسطینی دوسری صدی عیسوی میں غائب ہوگئے تھے اور میں نے ان کے دوبارہ وجود میں آنے کا نہیں سنا۔" گورن نے سامعین کو یقین دہانی کروائی کہ ہمہ گیر کفر کے باوجود "نجات کا عمل، جو کہ ایک سو سال سے جاری ہے، نہیں رکے گا۔" سمپوزیم کے ایک اور مقرر ربی اویز نے گورن سے اتفاقِ رائے کرتے ہوئے کہا کہ یہودیت فلسطینیوں کو معمولی سی خودمختاری دینے سے بھی منع کرتی ہے۔ جوڈیا، ساریا اور غزہ کے ربیوں کی کمیٹی کے چیئرمین ربی زلمان میلامیڈ نے اس موقف کا زیادہ واضح اظہار کیا: "کسی مذہبی اتھارٹی کو اس بات سے اختلاف نہیں ہے کہ اگر ارضِ اسرائیل میں صرف یہودی آباد ہوں تو یہ مثالی ہوگی۔" ربی شلومومنہاہر نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے حوالے سے کہا: "ساری مسلم دنیا زر کی حریص، کمینی اور ہر برائی کرنے پر قادر ہے۔ تمام عیسائی یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان کی ہلاکت کے منتظر و متمنی ہیں۔"

اسرائیلی ٹیکس دہندگان نے، بشمول مسلمانوں اور عیسائیوں کے، اس سمپوزیم کے لیے ادائیگی کی تھی، جس کے دوران یہودی مذہبی پیشواؤں نے ایسے دلائل دئے تھے۔ مذہب اور تعلیم کے وزراء نے ان خیالات کو قبول کیا اور عوامی سطح پر کوئی تنقید نہیں کی۔ رابن کی قبولیت اس امر سے عیاں ہوئی کہ اس نے اپنے دعوؤں کے برعکس اس طرح کے سیاسی پروگراموں کی حوصلہ افزائی کی۔ وزیرِ تعلیم ایلونی کی قبولیت منطقی طور پر اس کی کمزوری لاپروائی اور حماقت کا ایک اور اظہار سمجھی جاسکتی ہے۔ رابن اور ایلونی دونوں نے اس سمپوزیم سے کچھ پہلے جرمنی کا

دورہ کیا تھا اور "غیر ملکیوں سے جرمنوں کی نفرت" کی عوامی سطح پر مذمت کی تھی۔ انہوں نے اسرائیل میں غیر ملکیوں سے برتاؤ کے حوالے سے ربیوں کے نسل پرستانہ بیانات پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ مذمت کرنا تو درکنار انہوں نے ذکر تک نہیں کیا کہ ربی میلا میڈ مستقل کا فلسفہ بیان کرتا ہے جس کا مطلب ارضِ اسرائیل سے غیر یہودیوں کا مکمل اخراج ہے۔ ایسا بیان شاید جرمنوں کی غیر ملکیوں سے نفرت کی مذمت کی داد ہوتا۔

عبرانی پریس سے لی گئی تیسری مثال 1990ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب سے لی جا رہی ہے۔ اس کتاب کا نام Intifada Responses ہے اور اسے گش ایمونم کے ایک اہم ربی شلومو اویز نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں انتفاضہ سے ملتی جلتی صورتِ حال میں فلسطینیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے حوالے سے پوچھے گئے یہودیوں کے سوالوں کے سادہ عبرانی میں ہلاکائی جواب دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو سوال جواب پر مشتمل چھوٹے چھوٹے ابواب میں بانٹا گیا ہے۔ جوابات اسرائیلی قانون سے مطابقت نہیں رکھتے۔ پہلے دو ابواب (PP.19-22) کے سوال جواب کے اقتباسات سے کتاب کا جوہر آشکار ہو سکتا ہے پہلے باب میں سوال پوچھا گیا ہے: "ہمارے امن کو غارت کرنے والے عرب بچے اور عرب بالغ کو سزا دینے میں کوئی فرق ہے؟" جواب کا آغاز ہلاکا سے ناواقف لوگوں کو سرزنش کرنے سے ہوتا ہے کہ یہودیوں اور جینٹائل کے بچوں میں موازنہ نہیں کرنا چاہیے۔ "جیسا کہ مشہور ہے تیرہ سال سے کم عمر کے یہودی لڑکوں اور بارہ سال سے کم عمر کی یہودی لڑکیوں کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی...... ابنِ میمون نے لکھا ہے کہ اس اصول کا اطلاق صرف یہودیوں پر ہوتا ہے...... کسی غیر یہودی پر نہیں۔ چنانچہ ہر غیر یہودی کو، خواہ اس کی عمر کتنی ہی ہو، اپنے جرم کی سزا بھگتنا ہو گی۔" ربی اویز نے ابن میمون کی ایک اور ہدایت کا حوالہ دیا ہے کہ ایسے غیر یہودی بچے کو سزا نہ دی جائے جو "دیوانہ" ہو۔ اویز کہتا ہے کہ غیر یہودی بچے کو، خواہ اس کی عمر تیرہ سال سے کم ہو، بالغ قرار دینے کے لیے یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اطمینان بخش حد تک سمجھدار ہے۔ اویز کے اس جواب سے ہر یہودی اس بات کا اہل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی عرب بچے کے بالغ اور سزا کا مستحق ہونے کا تعین کرے۔ دوسرا سوال ہے: "اگر کسی عرب بچے کا ارادہ کسی یہودی کی جان لینے کا ہو تو ہم کیا کریں؟" ربی اویز کہتا ہے کہ تمام سابقہ جوابوں کا تعلق غیر یہودی بچوں کی جانب سے جرائم کے حقیقی ارتکاب سے تھا۔ اس سوال کے جواب میں وہ وضاحت کرتا ہے کہ اگر کوئی غیر یہودی بچہ قتل کا ارادہ رکھتا ہو مثلاً وہ کسی گزرتی ہوئی کار پر پتھر پھینکے تو اسے "یہودیوں کا قاتل" تصور کرنا اور ہلاک کر دینا چاہیے۔ ابن میمون کا حوالہ دیتے ہوئے اویز کہتا ہے کہ ایسی صورت میں غیر یہودی بچے کا قتل یہودی جان بچانے کے لیے ضروری ہے۔

ربی اویز نے اپنی کتاب کے دوسرے باب میں ایک سوال اٹھایا اور اس کا یہی جواب دیا ہے: "کیا ہلاکا سنگباری کرنے والے عربوں کو سزائے موت دینے کی اجازت دیتی ہے؟" اس کا جواب تھا کہ ایسی سزا کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ فرض ہے۔ مزید برآں یہ سزا صرف سنگباری پر ہی نہیں بلکہ دوسری وجوہات کے تحت بھی

دی جاسکتی ہے۔اویبز کہتا ہے کہ اسرائیل کے بادشاہ یا مذہبی عدالت کو "اختیار ہے کہ اگر انہیں یقین ہو کہ کسی کو سزائے موت دینے سے دنیا بہتر ہو جائے گی تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔" اسرائیل کا بادشاہ یا مذہبی عدالت غیر یہودیوں اور برے یہودیوں کو ظالمانہ انداز سے پٹوا کر، بدترین حالات میں قید کر کے اور ایا انہیں دوسری ایذاؤں کا نشانہ بنوا کر سزائے موت دے سکتے ہیں۔ گش ایمونم کے ترجمانوں کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے بادشاہ یا مذہبی عدالت کا یہ اختیار اسرائیل کی حکومت میں دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ حکومت درست مذہبی احکام کے مطابق عمل کرے۔ اگر حکام کو یقین ہو کہ ایسی سزائیں دوسرے برے لوگوں کو جرائم کے ارتکاب سے باز رکھ سکتی ہیں تو انہیں ایسی سزائیں دینی چاہئیں۔اویبز وضاحت سے کہتا ہے کہ وہ یہودیوں پر سنگباری کا ارادہ رکھنے والے غیر یہودیوں کو سزائے موت دینے یا کوڑے مارنے کو ترجیح دیتا ہے۔

اس باب میں کی گئی بحث سے این آر پی گش ایمونم یہودی بنیاد پرستی اور ہیریڈی یہودی بنیاد پرستی میں فرق واضح ہو جانا چاہیے۔ گش ایمونم اور این آر پی زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ ان کے اراکین اسرائیل کو پاک کرنے کی غرض سے ریاست میں شامل ہو گئے ہیں۔



پانچواں باب

گش ایمونم کی بستیوں کی نوعیت

مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی بستیوں کی میڈیا کوریج میں بنیادی طور پر فلسطینیوں اور تنازعے کے پُرامن حل پر پڑنے والے ان کے اثرات کو فوقیت دی جاتی ہے۔ یہودی بنیاد پرستی کے نقطۂ نظر سے مذہبی آبادیوں کو تین حوالوں سے دیکھا جانا چاہیے: اول، مسیحانہ آئیڈیالوجی کے قلعوں کے طور پر ان کا وجود، دوم، اسرائیلی معاشرے پر ان کے حالیہ اور امکانی اثرات، سوم، اُس نئے معاشرے میں ان کا امکانی مرکزی کردار، جسے مسیحا پرست لیڈر تشکیل دینا چاہتے ہیں۔

اس بحث سے قبل اسرائیلی معاشرے میں ان بستیوں کے حوالے سے تصورات کی عکاسی کرنے والے دو تبصرے ضرور درج کرنے چاہئیں۔ پہلا تبصرہ یہ ہے کہ اسرائیل کے شہریوں کی اکثریت، جن کی نمائندگی کنیسٹ کے اراکین کرتے ہیں، تمام بستیاں قائم رکھنے کی حامی ہے۔ 1990ء کے شروع میں کنیسٹ کے 120 اراکین میں سے، لیبر پارٹی سے تعلق رکھنے والے تمام اراکین سمیت، سو اراکین نے اس موقف کی حمایت کی تھی، تاہم ان کی موجودگی کس صورت میں برقرار رکھی جائے، اس حوالے سے ان میں معمولی سا اختلاف تھا۔ کنیسٹ کے تمام اراکین نے بستیاں برقرار رکھنے کی مخالفت کی تھی، تاہم یہودی اراکینِ پارلیمنٹ کی حمایت کا تناسب زیادہ تھا۔ بایں ہمہ بستیوں کے برقرار رکھے جانے کے حوالے سے اسرائیلی معاشرے میں مختلف نقطہ ہائے نظر وجود رکھتے ہیں۔ بائیں بازو کے کچھ چھوٹے گروپ تمام بستیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بیشتر اسرائیلی یہودی کچھ بستیوں میں یہودی کے رہنے کو نارمل اور کچھ دوسری بستیوں میں رہنے کو ابنارمل تصور کرتے ہیں۔ اسرائیل کے باہر اس فرق کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے، خصوصاً عرب دنیا میں۔

اسرائیلی یہودیوں کی اکثریت "عظیم تر یروشلم" کے علاقے میں موجود بستیوں میں رہنے کو نارمل تصور کرتی ہے۔ "عظیم تر یروشلم" ایک اسرائیلی شہری (Urban) اور سوشل اصطلاح ہے، جس کا مفہوم گرین لائن یا

یروشلم کی میونسپل سرحدوں تک محدود نہیں ہے۔ ''عظیم تر یروشلم'' میں رہنے کا مطلب ہے کہ یہودی ایک ایسے مقام پر رہتے ہوں جہاں سے وہ شاپنگ یا شام کی تفریح کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے یروشلم آئیں اور نصف شب کو واپس چلے جائیں۔ 1999ء کے اوائل میں 250000 سے زیادہ اسرائیلی یہودی، اسرائیل کی کل آبادی کا 5 فیصد، ''عظیم تر یروشلم'' میں رہتے تھے۔ غربی کنارے، غزہ کی پٹی اور جولان کی پہاڑیوں میں واقع بستیوں کی کل آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے۔ یہ ایک لاکھ یہودی کسی بڑے شہر سے جڑے ہوئے چھوٹے سے علاقے میں مجتمع نہیں ہیں، بلکہ بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ''عظیم تر یروشلم'' کے باہر غربی کنارے کی بستی ایریئل میں تقریباً 1500 یہودی رہتے ہیں، کریت اربا میں 6000 سے کچھ کم اور بہت سی بستیوں میں تو 100 سے بھی کم یہودی رہتے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ اسرائیلی یہودیوں کی اکثریت ان بستیوں میں رہنے کو ابنارمل تصور کرتی ہے اور وہاں آباد ہونے سے انکاری ہے۔ اسرائیلی حکومت کی طرف سے ایک طویل عرصے سے مالی اور دیگر قسم کی امداد کے اعلان کے باوجود بہت کم تعداد میں یہودیوں نے ''عظیم تر یروشلم'' کے باہر مقبوضہ علاقوں میں واقع بستیوں میں رہنے کو ترجیح دی۔

''عظیم تر یروشلم'' کے باہر واقع بستیوں میں ایک اور فرق پر لازماً توجہ دی جانی چاہیے۔ جن بستیوں میں اسرائیلی معاشرے کی معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے سیکولر اسرائیلی یہودی اکثریتی آبادی کے لوگ رہتے ہیں، انہیں مذہبی یہودیوں والی بستیوں سے مختلف انداز میں دیکھا جاتا ہے (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مذہبی یہودی اسرائیل کی کل آبادی کا صرف 20 فیصد ہیں)۔ اس کا مشاہدہ اسرائیلی انتخابی نتائج میں کیا جا سکتا ہے۔ ہر علاقے، ہر بستی کے نتائج کی خبریں ہر چار سال بعد ذرائع ابلاغ سے نشر کی جاتی ہیں۔ ''عظیم تر یروشلم'' کی بستی میں ووٹنگ کا انداز گرین لائن کے عقب کی یہودی اوسط سے مختلف نہیں ہے۔ دوسری سیکولر بستیوں میں دائیں بازو کی طرف صرف تھوڑے سے جھکاؤ کے ساتھ پیٹرن تقریباً یکساں ہے۔ لیبر اور میرٹز پارٹیاں کل ووٹوں کا اچھا تناسب باقاعدگی سے حاصل کرتی ہیں۔ دوسری طرف مذہبی بستیوں میں مذہبی ووٹر لیکوڈ اور دائیں بازو کی دوسری سیکولر پارٹیوں کو شاذ ہی ووٹ دیتے ہیں۔ ان کی بجائے وہ مذہبی پارٹیوں کو اور اکثر و بیشتر صرف این آر پی کو ووٹ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1992ء کے انتخابات میں کریت اربا میں چار بڑی سیکولر پارٹیوں ...... لیبر، لیکوڈ، میرٹز اور تسومیت نے مجموعی طور پر 5 فیصد سے بھی کم ووٹ حاصل کیے تھے۔ قومی سطح پر ان پارٹیوں نے قومی ووٹ کا 80 فیصد حاصل کیا تھا۔ 1996ء کے الیکشن میں نیتن یاہو کے وعدوں کی وجہ سے کریت اربا میں لیکوڈ کے ووٹ 24.4 فیصد تک بڑھ گئے۔ اسی سال وزیر اعظم کے لیے ہونے والے الگ ووٹ میں نیتن یاہو نے 96.3 فیصد اور پیریز نے صرف 3.6 فیصد ووٹ حاصل کیے تھے (اسی سال وزیر اعظم کے لیے قومی ووٹ میں نیتن یاہو نے 50.1 فیصد اور پیریز نے 49.3 فیصد ووٹ حاصل کیے تھے)۔ بیت ال بی ایک چھوٹی سی مذہبی بستی ہے، جس میں نیتن یاہو کو 1996ء میں وزیر اعظم کے ووٹ میں سے 96.6 فیصد اور پیریز کو صرف 0.3 فیصد ووٹ ملے۔ اسی سال بیت ال بی میں کنیسٹ کے الیکشن میں این آر پی نے 76.4 فیصد اور انتہائی دائیں بازو کی پارٹی

مولیڈیٹ نے 14.5 فیصد ووٹ حاصل کیے۔ اس طرح 1996ء میں کنیسٹ کی 120 میں سے 11 یا 9.1 فیصد نشستیں جیتنے والی دو پارٹیوں این آر پی اور مولیڈیٹ نے بیت ال بی میں 90 فیصد ووٹ حاصل کیے تھے۔ اس کے برعکس سیکولر بستی الفے میناشے سے نیتن یاہو کو 71.5 فیصد اور پیریز کو 28.4 فیصد ووٹ ملے تھے۔

سب سے زیادہ مشہور مگر الگ تھلگ بستیاں وہ ہیں جن میں مذہبی آبادکار بستے ہیں۔ اگرچہ اسرائیل کے باہر اس کو زیادہ تر نظر انداز کیا گیا ہے، تاہم یہ ایک اہم حقیقت ہے۔ ان بستیوں میں آبادکاری پر صرف مذہبی مسیحا پرست یہودی تیار ہوتے ہیں۔ کافی حد تک اسی وجہ سے ہر اسرائیلی حکومت نے ان مذہبی مسیحا پرست بستیوں کے باسیوں کی ووٹنگ ترجیحات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی مدد کی ہے۔ غزہ کی پٹی کے وسط میں واقع بستی نیتزارم ایسی بستیوں کی ایک عمدہ مثال ہے۔ نیتزارم کے شمال میں غزہ سٹی ہے، جنوب میں چند بڑے پناہ گزین کیمپ ہیں۔ ہر جگہ تقریباً دو دولاکھ لوگ آباد ہیں۔ 1998ء کے وسط میں نیتزارم میں 120 مذہبی مسیحا پرست یہودی آبادکار خاندان تھے۔ (اوسلو معاہدے پر دستخط کے زمانے میں نیتزارم میں تقریباً ساٹھ خاندان تھے)۔ نیتزارم میں رہنے والے کچھ بالغ مرد اپنا سارا وقت تالمود پڑھنے میں گزارتے تھے۔ نیتزارم کے قریب ایک فوجی اڈہ ہے، جو غزہ کی پٹی کے مشرق سے مغرب کو جانے والی فوجی سڑک کی حفاظت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ یہ سڑک، جو اوسلو معاہدے کے تحت اسرائیل کے پکے کنٹرول میں ہے، غزہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ غزہ کو کنٹرول کرنے میں یہ فوجی اڈہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے، اور بیرونی دنیا کے لیے نیتزارم کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔ سیکولر، روایت پسند اور/یا ہیریڈی یہودی نیتزارم میں رہنا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی انہوں نے مستقبل میں وہاں آباد ہونے کا اشارہ دیا ہے۔ چنانچہ سڑک پر کنٹرول برقرار رکھنے کی خواہاں اسرائیلی حکومت کو لازماً مسیحا پرست آبادکاروں پر انحصار کرنا ہوگا، جو کہ نظریاتی طور پر ایسی بستیوں میں آبادکاری پر تیار ہیں۔

مقبوضہ علاقوں کی بستیوں کو صرف مجموعی اسرائیلی سٹریٹجی کے تناظر میں ہی درست طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ فلسطینیوں پر زیادہ سے زیادہ اطمینان بخش انداز میں جبر کیا جائے۔ لیبر اور لیکوڈ نے 1967ء سے، منافقت کے درجے کے فرق کے ساتھ، اس تصور کو اپنایا ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اطمینان میں مخصوص مقصد کے حصول کے لیے کم سے کم یہودی افواج کا استعمال بھی شامل ہے۔ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اچھے تربیت یافتہ زیادہ سے زیادہ یہودی فوجیوں کو ایک یا ایک سے زیادہ عرب ریاستوں کے ساتھ کسی بڑی جنگ کے لیے محفوظ رکھا جانا چاہیے۔ جون 1967ء میں مقبوضہ علاقوں کو حاصل کرنے کے تھوڑے عرصے بعد اسرائیلی حکومت نے ''اردنی آپشن'' پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ اردنی افواج اسرائیل کے لیے ضروری کام انجام دینے کے لیے غربی کنارے آئیں تاہم اردن کی حکومت نے اس منصوبے سے اتفاق نہیں کیا۔ تب اسرائیلی حکومت نے ''ویلج لیگز'' بنائیں، جو مقامی فلسطینیوں پر مشتمل تھیں۔ انہوں نے اسرائیلی فوج کی معمولی سی مدد کے ساتھ کئی سال تک غربی کنارے میں موثر حکومت کی۔ انتفاضہ نے ''ویلج لیگز'' کو توڑ دیا۔ 1990ء کی دہائی کے اوسلو پروسیس کی طرح ''اردنی آپشن'' اور ''ویلج لیگز'' جیسے تصورات ایک ہی مقصد کو پورا

کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ وزیراعظم رابن نے واضح طور پر کہا تھا کہ یہ مقصد اسرائیلیوں کی جانب سے فلسطینیوں کی ان کے اپنے لوگوں پر حکومت ہے۔ اس مقصد کو انسانی حقوق کی تنظیموں کی مداخلت کے بغیر اور اسرائیلی قانونی رکاوٹوں کے بغیر پورا کیا جانا تھا۔ اس سوچ کے مطابق اسرائیلی فوج اپنی عظیم فوجی حکمتِ عملی پر توجہ مرکوز رکھنے میں آزاد ہوتی۔ اوسلو کے بعد غزہ کی پٹی اور غربی کنارے کے حوالے سے اسرائیلی حکمتِ عملی کا انحصار اس بات پر تھا اور اب بھی ہے کہ یہ بستیاں اسرائیلی فوجی طاقت کا مرکز ہیں۔ اس حکمتِ عملی کو غزہ کی پٹی کے حوالے سے بہترین انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے، جہاں کا جغرافیہ غربی کنارے کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے۔ غزہ کی پٹی، جیسا کہ مطبوعہ نقشوں میں صاف دیکھی جاسکتی ہے، فوجی سڑکوں سے بھری ہوئی ہے۔ قاہرہ معاہدے کے مطابق یہ فوجی سڑکیں اسرائیلی کنٹرول میں رہیں اور ان پر فوج یا تو فلسطینی پولیس کے ساتھ یا تنہا گشت کرتی رہتی تھی۔ اسرائیلی فوج یہ حق رکھتی ہے کہ ان سڑکوں کے کسی بھی حصے کو فلسطینی ٹریفک کے لیے بند کردے، خواہ وہ علاقہ فلسطینی اتھارٹی کی حکومت میں ہی کیوں نہ ہو۔ جب کسی بستی کو جانے والا کوئی کانوائے گزرتا ہے یا جب اسرائیلی فوج نے فلسطینی اتھارٹی کو شرمندہ کرنا ہوتا ہے تو وہ اس حق کو استعمال کرتی ہے۔ ان میں سے ایک سڑک، غزہ سٹی بائی پاسنگ روڈ، بڑے شہروں اور پناہ گزین کیمپوں کے باہر سے گزرتی ہوئی پوری پٹی سے گزرتی ہے۔ ایک اور فوجی سڑک غزہ کی پٹی کو مصر سے الگ کرتی ہے۔ باقی سڑکیں اسرائیل کی مشرقی سرحد سے غزہ کی پٹی سے گزرتی ہوئیں سمندر کی طرف یا مغرب میں یہودی بستیوں کے بلاک (قاطف) تک جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک سڑک نتزارم روڈ غزہ سٹی بائی پاسنگ روڈ کو نتزارم سے ملاتی ہے، یوں نتزارم ایک اہم سٹریٹیجک مقام بن جاتا ہے۔ اوسلو معاہدے پر دستخط کے تھوڑے عرصے بعد اسرائیل کے عبرانی اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں کہ سرحدی گارڈز اور فوج کے جوانوں کی بھاری تعداد کو نتزارم کے قریب بھیجا گیا ہے جہاں ان کے لیے ایک نیا اڈہ تعمیر کیا جارہا ہے۔ نتزارم کا سرکاری درجہ اسرائیل کو قانونی طور پر ایسا کرنے کی نیز اسے اسرائیلی یہودی عوام کے اس حصے کی تائید حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے جو فوجی اڈوں سے زیادہ بستیوں کا حامی ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور مبصر ناہوم بارنی نے کہا تھا: "اگر نتزارم موجود نہ ہوتی تو اسے ایجاد کرلیا جاتا۔"

ان سب سڑکوں کا مجموعی اثر یہ ہوا ہے کہ غزہ کی پٹی ایسے علاقوں میں بٹ گئی ہے، جو بائی پاسنگ روڈز کے نرغے میں ہیں۔ غزہ کی پٹی میں واقع یہودی بستی سڑکوں کے جال کا محور ہے۔ یہ کام اسرائیل کے زیادہ موثر دائمی کنٹرول کو یقینی بنانے کے لیے کیا گیا ہے۔ کنٹرول کی یہ نئی شکل، جسے رابن اور لیبر پارٹی کے دوسرے سیاستدانوں نے "باہر سے کنٹرول" کا نام دیا تھا، فوج کو جوانوں کی تھوڑی تعداد کے ذریعے غزہ کی پٹی پر غلبہ پانے کے قابل بناتی ہے۔ یہ شکل سابقہ شکل سے بہت زیادہ قابلِ ترجیح ہے، جس میں غزہ کی پٹی میں واقع شہروں اور پناہ گزین کیمپوں میں براہِ راست گشت کے لیے بہت زیادہ فوج کی ضرورت ہوتی تھی۔ عبرانی اخبارات کنٹرول کی سابقہ شکل کو "اندر سے کنٹرول" کا نام دیتے ہیں اور انہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ یہ کم موثر تھا اور اس میں "باہر سے کنٹرول" کی نسبت زیادہ فوج کی ضرورت ہوتی تھی۔ کنٹرول کی اس تبدیلی کا انحصار سڑکوں کے

جال پر ہے، جس کا انحصار نیتز ارم جیسی بستیوں پر ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، تاہم جس کا دہرایا جانا وقعت رکھتا ہے، کہ صرف مسیحانہ آئیڈیالوجی میں ایقان رکھنے والے مذہبی یہودی ہی ایسی بستیاں قائم کرنے اور ان میں رہنے پر تیار ہیں۔

عظیم تر یروشلم کے باہر غربی کنارے میں صورتِ حال جغرافیائی اعتبار سے غزہ کی پٹی سے زیادہ پیچیدہ ہے تاہم بنیادی طور پر اسے بھی "باہر سے کنٹرول" والے اصولوں کے مطابق قابو میں رکھا جارہا ہے۔ اس کنٹرول کا دارومدار سڑکوں کے ایک جال پر ہے، جس کا محور بستیاں ہیں۔ چند ایک بستیوں کو جذباتی وجوہات کے تحت بسایا گیا تھا۔ ایریئل شیرون نے 1991ء اور 1992ء میں امریکی وزیرِ خارجہ جیمز بیکر کے اسرائیل کے دوروں کے دوران اسے اشتعال دلانے کے لیے ان چند بستیوں کے قیام میں مدد دی تھی۔ گش ایمونم سے بھی زیادہ انتہا پسند بنیاد پرست یہودیوں کے چھوٹے گروہوں نے بھی ان چھوٹی بستیوں کے قیام میں مدد دی تھی۔ اگرچہ ان بستیوں کو بہت زیادہ میڈیا کوریج دی گئی تھی، تاہم یہ نسبتاً تمام بستیوں کے صرف ایک معمولی سے تناسب کی نمائندگی کرتے ہوئے غیر اہم ہی رہیں۔ کریت اربا اور ہیبرون کی علیحدہ بستی جیسی بستیوں کو تمام اسرائیلی حکومتوں نے سٹریٹیجک وجوہات کے تحت مدد دی تھی۔ وزیرِ اعظم رابن نے اگرچہ بعض اوقات آبادکاروں کے حوالے سے توہین آمیز تبصرے کر کے سموک سکرین بنائی تھی، تاہم اوسلو معاہدے کے وقت سے لے کر اپنی موت تک اس نے بیشتر آبادیوں کو مضبوط بنایا، خصوصاً غربی کنارے کی بستیوں کی۔ اوسلو معاہدے کے ایک چیف آرکیٹکٹ یوسی بائیلن نے اسرائیلی عوام کو بتکرار یقین دہانی کروائی کہ لیبر حکومت آبادکاروں کو اپنائے رکھے گی۔ 27 ستمبر 1995ء کے ماریو کی رپورٹ کے مطابق بائیلن نے کنیسٹ میں لیکوڈ اراکین کے الزامات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

> ان کا سب سے زیادہ مضحکہ خیز الزام یہ ہے کہ ہم آبادکاروں سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ اوسلو معاہدہ اس وجہ سے مہینوں التوا میں پڑا رہا کہ تمام آبادکار آباد رہیں گے اور انہیں زیادہ سے زیادہ تحفظ حاصل ہوگا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان بستیوں میں بھاری سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ بستیوں کی صورتِ حال اوسلو معاہدے کے بعد کی صورتِ حال سے زیادہ بہتر کبھی نہیں رہی۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لیبر حکومت کو گولڈ سٹائن قتلِ عام کے بعد صدمے کے دور میں ہیبرون کے آبادکاروں کو ہٹانے کا موقع ملا تھا، یا کم از کم ان کے ایک حصے کو، تاہم لیبر حکومت ایسا کرنے سے باز رہی۔ ڈینیئل بین سیمون نے 18 اگست 1995ء کے داور میں شائع ہونے والے مضمون میں وزیرِ اعظم رابن کے دفتر میں اس مسئلے پر ہونے والی بحث کے بارے میں انکشاف کیا ہے: "اسرائیل کی تمام سکیورٹی سروسز کے سربراہوں نے ہیبرون کے آبادکاروں کے انخلا کی مخالفت کی۔" ایسی مخالفت سے بستیوں کی سٹریٹیجک اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ نیز اسرائیلی حکومت اور فوج کا مسیحا پرست آبادکاروں پر انحصار بھی نمایاں ہوتا ہے۔

گزشتہ باب میں بیان کردہ مسیحانہ آئیڈیالوجی اور مسیحا پرست ربیوں اور عام لیڈروں کے متعدد بیانات سے عیاں ہوتا ہے کہ گش ایمونم کا مقصد، اسرائیلی حکومت کے مقصد کے برخلاف، مقبوضہ علاقوں پر کنٹرول کے لیے بستیوں کے استعمال کی سٹریٹیجک اہمیت تک محدود نہیں ہے۔ گش ایمونم لیڈروں کا زیادہ اہم مقصد اپنی یک نسلی بستیوں میں ایک نئے معاشرے کے ماڈل تخلیق کرنا ہے۔ انہیں امید ہے کہ یہ نیا معاشرہ پھیلے گا، یہاں تک کہ ریاستِ اسرائیل کی سیکولر، روایت پرست اور ہیریڈی آبادی ان کے وضع کردہ اجتماعی یہودی تشخص کو اپنا لے گی۔ ان کا ایقان ہے کہ یہ مذہبی، نسل پرستانہ، لبرل دشمن اور آفاقیت دشمن معاشرہ خدا کے حکم کے تحت ہوگا۔ گش ایمونم کے لیڈر اپنے منصوبے کی تکمیل کے دوران صرف اس وقت تک جمہوریت کو برداشت کر سکتے ہیں جب تک وہ الوہی یہودی مملکت کے قیام میں مددگار رہتی ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ ہلاکا اور کبالا میں بیان کردہ یہودی اقدار سے ٹکرانے والی تمام اقدار کو رد کر دینا چاہیے۔ انسانی اور شہری حقوق اور ریاستیت کا تصور الوہی فیضان یافتہ ربیوں کے ایک گروپ کے ذریعے عمل میں آنے چاہئیں۔ یہ تصورات 1973ء کی جنگ کے بعد سے اسرائیلی معاشرے میں زیادہ قابلِ قبول ہوتے جا رہے ہیں، خصوصاً این آر پی کے اراکین میں۔ اس جنگ میں سیکولر اسرائیلی ملٹری ازم کو شکست ہوئی تھی۔ جنرلوں کی ناکامی ایک باطنی اشرافیہ کے وجود میں آنے کا باعث بنی جس نے اپنا علم محض تزویراتی تصورات کی بجائے ایک اعلیٰ تر سرچشمے سے حاصل کیا تھا۔ اس جنگ کے بعض جنرلوں کو اپنے فرائض سے روگردانی کرنے والے لذت پرست تصور کیا گیا۔ گش ایمونم کے ربی اور عام لیڈر اکثر اسرائیلی یہودیوں کو اخلاقی برتری، مالی معاملات میں دیانتداری، مشن کے احساس سے مالامال اور مخلص دکھائی دیئے۔ یہ کریکٹرائزیشن، جو کہ فلسطینی معاشرے کے حماس کے لیڈروں سے ملتی جلتی تھی بعدازاں جاری رہی۔ گش ایمونم کے لیڈر اپنے اصولوں کے ساتھ مخلص اور مالی اعتبار سے دیانت دار رہے ہیں۔ ہر طرح کی کرپشن سے بھرے ہوئے معاشرے میں یہ بہت ہی اہم بات ہے۔ مزید برآں گش ایمونم کے پاس اس کا اپنا علاقائی گڑھ ہے جو ہتھیار چلانے اور فوجی کارروائیاں کرنے میں مہارت رکھنے والے مخلص پیروکاروں سے بھرا ہوا ہے۔

گش ایمونم کی طاقت میں 1974ء سے 1992ء کے درمیانی عرصے میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ اس کے اپنے اراکین کے علاوہ اسے مختلف درجے کی وابستگی رکھنے والے حامی میسر آئے ہیں۔ شاید اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ 1974ء کے بعد یعنی ایک ایسے زمانے میں کہ جب اسرائیلی معاشرے میں نسل پرستی زوروں پر تھی، وہ اسرائیلی کلچر اور اجتماعی تشخص پر اثرانداز ہوئی ہے۔ دائیں بازو کے سیاستدان اور لیبر پارٹی کے حامی اس وقت تک گش ایمونم کے ہمدرد رہے جب تک مقبوضہ علاقوں کے فلسطینی نسبتاً قابو میں رہے۔ یہ صورتِ حال دسمبر 1987ء میں انتفاضہ کے آغاز تک رہی۔ انتفاضہ سے پہلے اکثر اسرائیلی یہودی محسوس کرتے تھے کہ فلسطینیوں پر اندر سے کنٹرول زیادہ مہنگا نہیں اور قابلِ برداشت ہے۔ لہٰذا بہت سے سیکولر اسرائیلی یہودیوں نے محسوس کیا کہ وہ موشے دایان کی بجائے گش ایمونم کے فتح کے تصور کی تائید کریں۔ موشے دایان والا تصور 1974ء تک حاوی رہا تھا اور اس کی اساس قدامت پسند فلسطینی معززین کے ساتھ تعاون پر تھی۔ روایت پسند فلسطینی معززین کے ساتھ

تعاون نے فلسطینی اکثریتی آبادی والے علاقوں کے اندر بھاری اسرائیلی افواج رکھنا غیر ضروری بنا دیا تھا۔ چونکہ آبادکاری اوران علاقوں میں زمینوں کی ضبطی سے معززین کارآمد نہیں رہے تو روایتی افواج کی بجائے "ولیج لیگز" کا متبادل ایجاد کیا گیا۔ انتفاضہ نے اس اقدام کی عارضی اہمیت کو عیاں کر دیا۔ غزہ کی پٹی اور باقی ماندہ غربی کنارے میں آبادکاری 1975ء میں اس وقت شروع ہوئی تھی جب رابن وزیر اعظم تھا اور پیریز وزیر دفاع کی حیثیت سے ان علاقوں کا انچارج تھا۔ 1990ء کی دہائی کے یہ دونوں امن کے نام نہاد معمار امن کی راہ روکنے والے بڑے عامل کے وجود میں آنے کے بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔

انتفاضہ نے اسرائیلی یہودی معاشرے میں جذبات کو بدل دیا۔ اسرائیلی حکومت نے مقبوضہ علاقوں میں زیادہ فوج متعین کر دیے۔ اس کی وجہ سے سیکولر اسرائیلی یہودی ان علاقوں پر قبضے کی قیمت کے بارے میں دوبارہ سوچنے لگے۔ ان میں سے بہت سے یہودی اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ اس کے بعد اسرائیلی معاشرے میں ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوئی، جو برقرار چلی آ رہی ہے۔ مسیحا پرستوں اور ان کے تمام حامیوں نے، جو تمام کے تمام نسل پرست ہیں، مل کر ایک کیمپ بنالیا۔ دوسرا کیمپ سیاسی اور سماجی حوالے سے کثیر نسلی گروپ ہے، جس میں شامل لوگ گش ایمونم اور اس کے بستیوں کی مسلسل حمایت کے ناگزیر نتیجے کے طور پر جنم لینے والی یہودی تھیوکریسی کے خلاف متحد ہوئے ہیں۔ ان دو اسرائیلی یہودی کیمپوں کی جدوجہد میں مقبوضہ علاقوں پر مستقل اسرائیلی تسلط ایک بنیادی مسئلہ بن گیا ہے۔

گش ایمونم کے آبادکاروں کی تیزی کے ساتھ تنظیم نے 1974ء کے بعد مذہبی بستیوں کی توسیع اور قوت میں اضافہ کیا۔ 1991ء میں گش ایمونم آبادکاروں کے لیڈر ربن جانے والے ربیوں نے مل کر جوڈیا اور سماریا کے ربیوں کی ایسوسی ایشن بنالی۔ یہ گروپ امریکہ کے صدر بش کی طرف سے شمیر حکومت پر میڈرڈ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ڈالے گئے دباؤ کے بعد وجود میں آیا تھا۔ عام لیڈر میڈرڈ کانفرنس سے خوفزدہ تھے۔ جیسا کہ ڈوو الیام نے 7 جنوری 1994ء کے "یروشلم" میں لکھا: "الوہی وعدے پر بھروسہ کرتے ہوئے ربیوں نے قیادت کے خلا کو پُر کر کے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھالیا۔" اوسلو معاہدے کے بعد ربیوں کی ایسوسی ایشن کی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ الیام مسیحا پرستوں کی بستی کیڈونم کے ربی ڈینئیل شیلو کا حوالہ نقل کرتا ہے:

> جب جوڈیا اور سماریا کے مذہبی آبادکار یہودی نجات کے وسیلے کے طور پر جوڈیا اور سماریا کی حیثیت پر ایمان کھونے لگے ہیں تو انہیں درپیش سنگین ترین مسائل کو جوڈیا اور سماریا کے ربی حل کر رہے ہیں۔ عقیدے سے محروم یہودیوں نے تو یہاں تک غور کرنا شروع کر دیا ہے کہ مقبوضہ علاقوں میں آبادکاری کا تصور ہی غلط تو نہیں یا نجات کا عمل شروع ہی نہیں ہوا یا خدا ہمیں آبادکاری سے روکنے کا اشارہ دے رہا۔ ایسے زمانے میں ربیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جواب فراہم کریں۔ اسی وجہ سے ہم ربیوں کے پاس ہر عام گش ایمونم اتھارٹی سے زیادہ اختیارات اور قوت موجود ہے۔

ربیوں نے اس قوت کو یہ دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کیا کہ ان کے پیروکاروں پر فرض ہے کہ وہ ان پر عقیدہ رکھیں۔ الہام مزید کہتا ہے:۔

جوڈیا اور سماریا کے ربی صرف روحانی اختیار ہی سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ذاتی انٹیلی جنس نیٹ ورک تیار کرنے شروع کر دیئے ہیں، جو اسرائیلی فوج کی ہائی کمان میں موجود اپنے ہمدرد مذہبی یا سیکولر افسروں سے حاصل ہونے والی معلومات کو استعمال کر کے تیزی سے وسیع ہو گئے۔ جوڈیا اور سماریا کے ربیوں نے جنرل سٹاف کے ایک رکن جنرل موشے کے بارے میں کہا کہ وہ ان کا ایک بڑا معلومات دہندہ تھا۔ جنرل حال ہی میں فوت ہوا ہے۔ مبینہ طور پر بارکو چبانے مقبوضہ علاقوں میں فوجی آپریشنوں کے بارے میں باقاعدگی کے ساتھ پیشگی اطلاعات فراہم کیں۔ اس کے اقدامات کے بارے میں دوسرے افسروں کو پتا چلا تو وہ بھی اس کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ پھر ایسا ہوا کہ فوجی کمان نے مذہبی آبادکاروں کی حقیقی قیادت تک رسائی پانے کی غرض سے ان تعلقات کو باقاعدہ بنانے اور اپنے آپریشنوں کے بارے میں ربیوں کو آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مثال کے طور پر کوئی بٹالین کمانڈر کسی مقامی بستی کے ربی کو فوجی یونیفارم پہنا کر کسی پوسٹ کا دورہ کروانے اور مقامی عرب بستیوں میں بھیس بدل کر فرائض سرانجام دینے والے فوجیوں کی شناخت کروانے میں تامل نہیں کرتا تھا۔ کمانڈر کو ایسا کر کے امید ہوتی تھی کہ جوڈیا اور سماریا کے ربی بڑی سڑکوں کو روکنے اور یوں فوجی یونٹوں کی نقل و حرکت میں رکاوٹ ڈالنے سے باز آ جائیں گے۔ یہ کوئی ایک الگ تھلگ واقعہ نہیں تھا۔ عام مذہبی لوگوں کی جوڈیا اور سماریا کونسل کو اب مملکتِ جوڈیا کے ربیوں کی کونسل کا سامنا ہے، جو ان کی آنکھوں کے سامنے ابھری ہے۔ عام لوگوں کی کونسل حکومتی ایجنسیوں سے ملنے والی ٹھوس معلومات کی مدد سے فیصلے کرتی ہے۔ رابن، جو مذہبی آبادکاروں کے ساتھ مذاکرات کرنے کو زبردست ترجیح دیتا ہے، جوڈیا اور سماریا کونسل کے اراکین کو خفیہ بات چیت کرنے کے لیے بلاتا رہتا ہے۔ وہ مملکتِ جوڈیا کے ربیوں کے ساتھ ایسا ہی تعلق قائم نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس جیسے گناہ گار کے ساتھ بات کرنے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عام لوگوں کی کونسل کے اراکین ان کی آشیرباد حاصل کیے بغیر کوئی بڑا فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔

اوسلو پراسیس نے گش ایمونم کے ربیوں اور عام آبادکاروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ پراسیس بستیوں کے لیے زبردست مادی امداد کے باوجود وقوع پذیر ہوا تھا............ گش ایمونم نے 1990ء کی دہائی میں وزرائے اعظم رابن، پیریز اور نیتن یاہو سے یہ مادی امداد حاصل کی تھی۔ چند ایک مسیحا پرست ربیوں نے اوسلو پراسس کے وقوع

پذیر ہونے کی توضیح پیش کی اور اس کے حوالے سے اپنے پیروکاروں کو دلاسے دینے کی کوشش کی، تاہم وہ تقریباً ناکامی سے دو چار ہوئے۔ مذہبی علامتیت (Symbolism) بالخصوص الہامی صورت میں ظاہر ہونے والی علامتیت نے قبولیت کی راہ روک رکھی ہے۔ اپنے پرچم لہراتے فلسطینیوں کا نظارہ، مسلح فلسطینی پولیس کا ظہور اور فلسطینی اتھارٹی کی بڑھتی ہوئی علامتیں فوری نجات کے مسیحا پرستانہ وژن کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ اس کی وجہ سے ''یہودی غداروں'' سے نفرت میں اضافہ ہو گیا، جن کی غداری نے خدائی منصوبے کو غارت کر دیا اور یہودیوں کی اکثریت ان کی پیروی کرنے اور الوہی احکامات سے لاپروائی برتنے لگی۔ یہ نفرت، جس کا رخ زیادہ تر رابن اور اس کے وزیروں کی طرف تھا، کبالا سے مطابقت رکھتی تھی، جو کہتا ہے کہ نجات کا عمل کئی مرتبہ معطل ہو گا اور اس کی وجہ یہ ہو گی کہ قوم کسی کافر یا غدار کی پیروی کرنے لگے گی۔ یہودی تاریخ میں جو لوگ نجات کی آمد پر مضبوط ایقان رکھتے تھے، وہ غداری کے بھی نہایت مضبوط احساسات کے حامل تھے۔ اوسلو کے بعد ایسے لوگ زیادہ مذہبی بستیوں میں مرتکز ہو گئے۔

عربوں اور سیکولر یہودیوں سے نفرت صرف مذہبی بستیوں ہی کے رہنے والوں تک محدود نہیں ہے۔ نیری ہورووٹز نے 11 مئی 1994ء کے ''شیشی'' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں انتہا پسندوں کے ایک اور گروپ کو موضوع بنایا ہے، جو ''ہارڈیلم'' کہلاتا ہے۔[1] ہورووٹز نے ہارڈیلم کی ''عربوں اور سیکولر یہودیوں سے دو جہتی نفرت'' کا تجزیہ کیا ہے اور ثبوت کے طور پر ان کے کبالائی حوالوں سے معمور وافر اور مشکل ادب سے سوالوں کی صورت ثبوت دیئے ہیں۔ اگرچہ ہارڈیلم کا ادب باطنی ہے تاہم اس نے مذہبی یہودیوں کی اکثریت کو متاثر کیا ہے (مذہبی یہودیوں کی ایک قلیل تعداد نے ہارڈیلم کے استدلال کی مخالفت کی ہے)۔

ناڈو شرگائی نے 18 فروری 1994ء کے ہارٹز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں اس ''دو جہتی نفرت'' کو زیادہ پاپولر انداز میں پیش کیا ہے۔ شرگائی نے نشاندہی کی ہے کہ کچھ مذہبی آبادکاروں اور دوسرے مذہبی یہودیوں نے ریاستِ اسرائیل کی روایتی عبادت کرنے سے انکار کیا ہے، جسے ہیریڈم نے تو کبھی قبول نہیں کیا تاہم این آر پی کے پیروکار 1948ء سے ہر سبت اور مذہبی تہوار کے موقع پر کرتے آئے ہیں۔ شرگائی نے لکھا ہے کہ ایسے مذہبی یہودیوں نے، جو پہلے ریاستِ اسرائیل کو مقدس تسلیم کرتے تھے، اس عبادت اور ریاست کی تقدیس کا انکار کر دیا۔ وہ اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ حکومت اور ریاست نے اوسلو کو تسلیم کر کے ''اپنے مقدس مشن سے غداری'' کی ہے۔ مسیحا پرست یہودی رابن اور اس کے وزیروں کو غدار قرار دینے کے بعد عبادت کے ان الفاظ کو بالخصوص اشتعال انگیز تصور کرتے ہیں: ''اے خدا! اسرائیل کے رہنماؤں، وزیروں اور مشیروں کو اپنی روشنی اور صداقت سے بہرہ ور فرما۔'' شرگائی نے درست لکھا ہے کہ اس کے تجزیئے کا موضوع نسبتاً اعتدال پسند غصہ ور یہودی ہیں۔ یہ اعتدال پسند یہودی نظریاتی بحث میں تو شریک ہیں تاہم وہ قتل یا دوسری متشددانہ کارروائیوں کے منصوبے نہیں بناتے۔ شرگائی لکھتا ہے:

> اسرائیل کی مذہبی یہودی کمیونٹی جس شخصی، نظریاتی اور مذہبی بحران کا شکار ہے، اس نے

مذہبی صیہونیت کی عین بنیادوں کے حوالے سے شکوک پیدا کر دیئے ہیں یعنی سیکولر صیہونیت سے اس کے تاریخی اتحاد اور ریاستِ اسرائیل کی بصمیم قلبقبولیت کو۔ ماضی میں یہ اتحاد اس تصور کے گرد گھومتا تھا کہ اسرائیل کی سیکولر ریاست نجات کے عمل کا پہلا مرحلہ ہے۔ موجودہ زمانے میں اعتدال پسند بھی اس مفروضے پر سوال کرنے لگے ہیں۔ ان کا کوئی زیادہ تعلق یہودی زیر زمین تنظیم کے یہودا اتیز یون جیسے شدت پسندوں سے نہیں ہے جو ایسی یہودی ریاست کی مخالفت کرتے ہیں جس پر داؤدی خانوادے یا جیوئش نیشن ایگزسٹس فاراٹرنٹی موومنٹ کے بانی موردیکائی کارپل کی بادشاہت نہ ہو۔ یہ تحریک اسرائیل میں تھیوکریٹک بادشاہت قائم کرنا چاہتی ہے۔

شرگائی نے لکھا ہے کہ قاتل گولڈسٹائن کی تعریف کرنے والے ایز رائیل اریئل سمیت بہت سے بااثر ربی ''اعتدال پسندوں'' کی رہنمائی کرتے ہیں۔ شرگائی نے ربی اریئل کا یہ اقتباس درج کیا ہے:۔

مذہبی بستیاں نہ صرف زمین پر حقیقتیں تخلیق کرنے کیلیے قائم کی گئی تھیں بلکہ یہودیوں کے ذہنوں اور دلوں کو متاثر کرنے کے لیے بھی قائم کی گئی تھیں۔ ہمارا ایقان ہے کہ وطن کے حصوں کو زندہ تصور کرتے ہوئے یہودی عوام کے دل وطن کے دل سے جڑ جائیں گے۔ ہم نے یہ عمل قومی یہودی شعور کو اس کی روحانی جڑوں سے دوبارہ جوڑنے کے لیے شروع کیا تھا۔

ربی اریئل مزید کہتا ہے:

یہ بستیاں یہودیوں کی اکثریت میں یہ مقدس تعلق قائم کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ یہودیوں کی اکثریت نے اپنی اخلاقی اقدار کی بجائے مغربی کلچر کی نام نہاد ''اخلاقیات'' کو اپنانے کا گناہ کرکے اپنے آپ کو ناپاک کرکے اپنی روحوں میں موجود یہودی جڑوں سے انکار کیا ہے۔ اس سنگین گناہ کی وجہ سے ان کے دل ارضِ اسرائیل سے دور رہے ہیں..... اب ہمیں اپنے اندر ایک تقدس مآب اور باعمل کیمونٹی کو تشکیل دینا ہوگا۔ آؤ ہم باہر دیکھنا ترک کردیں۔ آؤ گناہ گار یہودی بھائیوں کے دلوں کو جانے والے راستے تلاش کرنا چھوڑ دیں۔ جن لوگوں نے یہودیت سے انکار کر دیا ہے، ایک روز وہ اپنے خوابوں کو بکھرتا ہوا پائیں گے۔ انہیں خالی پن کا احساس گھیر لے گا۔ ہر راستے پر ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ ہمیں تلاش کریں گے۔ اس وقت تک ہمارا کردار یہ ہوگا کہ ہم سچے منتخب اور پاک لوگوں کی ایک نسل کو تیار کریں، ایک ایسی نسل جو نادم یہودی گناہگاروں کو کھلے بازوؤں کے ساتھ قبول کرنے کی اہل ہو۔

ربی اریئل نے فلسطینیوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ اگرچہ ربی اریئل اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو ادراک

ہے کہ ان کی تقدس مآب اور باعمل کمیونٹیز ہر طرف سے فلسطینیوں سے گھری ہوئی ہیں، تاہم وہ فلسطینیوں کی موجودگی کو غیر متعلق تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے صرف سیکولر یہودی صیہونیت پرستوں سے سروکار رکھا ہے۔ شرگائی اریئل کا اقتباس دیتا ہے کہ ''تاریخی صیہونیت پرستی دیوالیہ ہو کر اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے............ حقیقی صیہونیت پرستی' گہری جڑوں والی مقدس صیہونیت پرستی صرف وہیں وجود رکھتی ہے جہاں مذہبی یہودی رہتے ہیں یعنی جوڈیا کے پہاڑوں اور سماریا کی وادیوں میں۔''

شرگائی نے اپنے مضمون میں ربی یائر ڈریفس کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ربی ڈریفس کہتا ہے کہ پی ایل او کے ساتھ معاہدہ کر کے اسرائیل نے روحانی کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ اس معاہدے کا عمل میں آنا ''اسرائیل کی مقدس تاریخ کے صیہونی یہودی دور کے ختم ہونے کی'' نشانی ہے۔ ڈریفس کہتا ہے:

> مؤرخین لکھیں گے کہ صیہونی یہودی دور 1948ء سے 1993ء تک جاری رہا۔ یہ اس وقت ختم ہوا جب بیشتر یہودی کنعانی بن گئے۔ لہٰذا 1993ء نئے کنعانی دور کے آغاز کا نشان ہے...... اس گناہ کے دور میں یہودی سیاسی فکر اور یہودی ثقافتی تعلیمی فکر سرعت سے ہونے والی شہریت پذیری سے آلودہ ہو جائے گی۔ بائیں بازو کے یہودی غداری کرتے ہوئے کلیدی عہدوں سے یہودیوں کو ہٹا کر عربوں کو فائز کرتے جائیں گے۔ حکومتی عہدیداروں، نشریات کی اتھارٹی، لینڈ اتھارٹی، اخبارات کے مدیروں اور یونیورسٹیوں کے بورڈز ڈائریکٹروں کو ہٹا کر ان کی جگہ عربوں کو متعین کر دیا جائے گا۔ ہر اہم عہدے پر عرب متعین کر دیئے جائیں گے۔

اگرچہ 1993ء کے بعد ربی ڈریفس کی پیشگوئیاں پوری نہیں ہوئیں، تاہم وہ نئے کنعانی دور کے حوالے سے اپنے عقیدے پر قائم رہا ہے۔ اس کے بقول یہودیوں کے جینٹائل سے تعلقات کی وجہ سے آلودگی پیدا ہوتی ہے۔ ربی ڈریفس نے سیکولر یہودیوں پر الزام لگایا کہ وہ ''ایک نئی اسرائیلی کنعانی ہستی کو تخلیق کرنا اور یوں مصدقہ یہودیت کو اجنبی عناصر کے ساتھ ملا کر اسے برباد کر دینا چاہتے ہیں۔'' اس نے اس خوف کا اظہار کیا کہ یہ ہستی صیہونی یہودی جذبے کو ختم کر دے گی۔ اس نے میرٹز پارٹی پر الزام لگایا کہ اس نے صیہونیت میں کمیونزم کو ملا کر اسے تباہ کر دیا ہے۔ ڈریفس نے لکھا ہے کہ اس امتزاج نے ''مشرقِ وسطیٰ کی ایک نئی نسل کنعانی فلسطینی جعلی یہودیوں کی نشو و نما کے بیج بو دیئے ہیں۔''

وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے:

> یہودیوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے خواہشمند سچے یہودیوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ اپنے آپ کو گیٹوز (Ghettos) میں الگ تھلگ کر لیں۔ گناہگار کنعانی فلسطینیوں کی ریاست اصل صیہونی یہودی ریاست کے ملبے پر جلد ہی قائم ہو جائے گی۔ یہ زمین پر خدا کے تخت کی بنیاد نہیں ہوگی، جیسا کہ اسرائیل سے توقع

تھی کہ وہ بنے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے اس نجاست زدہ تخت کے خلاف جنگ کرے۔ جن یہودیوں نے ہمیں اس گناہ میں مبتلا کیا ہے وہ الوہی تحفظ کے مزید حقدار نہیں رہے۔ ہمیں ان سے ضرور لڑائی کرنی چاہیے جنہوں نے ہمیں سچے اسرائیل سے دور کر دیا ہے۔ انہوں نے ہمارے یعنی خدا کے کلام کے پاسداروں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ ہماری قیادت کو سمجھ جانا چاہیے کہ ہمیں ریاستِ اسرائیل کے تحفظ کا حکم دیا گیا ہے۔ ہم اس کے اداروں سے تعاون صرف ایک نئے معاہدے کی بنیاد پر کر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم گناہ کی حکومت سے تعاون نہیں کریں گے۔ ایسا کرنے کی بجائے ہم کنعانی فلسطینیوں کے خلاف ایک بے رحمانہ جدوجہد کریں گے۔

ربی ڈرملنس نے اپنی آراء کا کھلم کھلا اور شدت کے ساتھ اظہار کر کے رابن کے قتل سے پہلے بیشتر مذہبی آباد کاروں کی سوچ کی ترجمانی کی اور اس پر اثر ڈالا۔ تاریخی یہودیت اور مذہبی صیہونیت پرستی اور عیسائیت میں موجود معاندت کے باوجود ان تصورات اور خاص عیسائی الہیاتی فلسفوں میں غیر معمولی مشابہت ہے۔

سیکولر اسرائیلی یہودیوں کے لیے این آر پی اور مذہبی آباد کاروں والا انتہائی اہم مسئلہ این آر پی کے نوجوان پیروکاروں کی لڑائی نیز فوج کے ایلیٹ یونٹوں اور آفیسر کوروں (CORPS) میں شمولیت ہے۔ جون 1967ء کی جنگ کے بعد سے تقریباً پچیس برسوں سے اس شمولیت نے اسرائیلی معاشرے میں این آر پی کی اہمیت کو بڑھایا اور اس کے امیج کو تقویت دی ہے۔ گویا این آر پی اور سیکولر اکثریت میں ایک قسم کی شراکت ابھری ہے۔ تاہم اوسلو پراسیس کی شروعات نے اکثر سیکولر یہودیوں کو دوبارہ سوچنے پر اکسایا اور کچھ مشکل مسائل کو ابھارا۔ رابن کے قتل سے فوج میں این آر پی کی شمولیت کے حوالے سے خوف پیدا ہو گیا۔ یہ سب کچھ اسرائیلی معاشرے کے بھرپور فوجی کردار کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس کردار کی تشکیل پانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہر اسرائیلی مرد کو فوج میں تین سال خدمات انجام دینا پڑتی ہیں[2] بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈیوٹی کا دورانیہ پورا ہو جانے کے بعد 54 برس کی عمر تک سال میں ایک ماہ ریزرو فوجی کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس کردار کی تشکیل میں اس حقیقت نے بھی اضافی حصہ ڈالا ہے کہ تمام اسرائیلی یہودی عورتوں میں سے تقریباً نصف کم از کم دو سال فوج میں خدمات انجام دیتی ہیں۔ لڑائی میں حصہ لینے والوں اور یا ایلیٹ یونٹوں میں یا پائلٹوں کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والوں کو فوجی ملازمت کے بعد زبردست سماجی قدر و منزلت حاصل ہو جاتی ہے اور اکثر وہ سیاسی اثر و رسوخ کے بھی حامل ہو جاتے ہیں۔ 1967ء سے پہلے مذہبی پارٹیوں، بالخصوص این آر پی کی سیاسی کمزوری کا سبب فوج کے لڑاکا اور ایلیٹ یونٹوں میں مذہبی جوانوں کی عدم موجودگی تھی۔ یہ صورت حال 1967ء کے بعد آہستہ آہستہ تبدیل ہو گئی۔ جب 1975ء میں گش ایمونیم نمودار ہوئی تو اس کے عام لیڈروں اور بالخصوص ربیوں نے این آر پی کے نوجوان پیروکاروں کو فوج میں ایک مذہبی فریضے کے طور پر ملازمت کرنے، لڑاکا اور ایلیٹ یونٹوں میں بھرتی ہونے نیز افسر بننے کی تلقین کرنا شروع کی۔ این آر پی کے نوجوان پیروکار جاں نثار، منظم

اور ماہر فوجی بن گئے۔ وہ ضرورت پڑنے پر وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ فوج کی ہائی کمان اور اسرائیلی یہودی عوام نے مثبت جوش کے ساتھ اس عمل کا خیر مقدم کیا۔ یوں این آر پی کو اس کے نوجوان اراکین کی فوجی کارکردگی پر دادو تحسین حاصل ہوئی، جیسا کہ پہلے کبوتز تحریک کو حاصل ہوئی تھی۔

اوسلو عمل نے این آر پی اور گش ایمونم کی ستائش میں کمی کی۔ خوف ابھرا کہ این آر پی کے فوج میں موجود پیروکار مقبوضہ علاقوں سے انخلا اور / یا ایک یا ایک سے زیادہ یہودی بستیوں کو ختم کرنے کے حکومتی احکامات پر عمل کرنے سے انکار کر دیں گے۔ رابن کے قتل کے بعد اس خوف میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے قتل سے پہلے ہی باروک کمرلنگ نے 6 اپریل 1994ء کے ہارٹز میں شائع ہونے والے مضمون میں ابتدائی خوف اور دہشت کا تھوڑا بہت اظہار کیا تھا۔ اس نے اسرائیلی فوج میں مذہبی جوشیلے جوانوں کی بڑھتی ہوئی شمولیت اور مقبوضہ علاقوں میں متعین یونٹوں پر مذہبی آباد کاروں کے زبردست اثر پر بحث کی تھی۔ کمرلنگ نے لکھا تھا: ''اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ فوجی کمان ہر فوجی یونٹ کی نگرانی خود کروائے۔ مذہبی آباد کاروں سے طویل عرصے سے جاری میل جول اور ان کی حفاظت پر مامور افسروں اور حتیٰ کہ پوری یونٹوں کو فوج سے نکال دینا چاہیے۔'' کمرلنگ اس تجویز کو عارضی حل تصور کرتا تھا۔ فوجی ہائی کمان نے اس تجویز کو تسلیم نہیں کیا اور اس وقت مضمون پڑھنے والوں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ کمرلنگ نے تسلیم کیا کہ اس مسئلے کو معاشرے میں گہری تبدیلی لائے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے لکھا: ''ایک طرف تو یہ دیکھنا مشکل ہے کہ مذہبی آباد کاروں کی آئیڈیالوجی کو ماننے والے افسروں سے بھری ہوئی فوج کسی یہودی بستی کو کس طرح خالی کروا سکتی ہے۔ دوسری طرف مجھے یہ تصور کرنا بھی مشکل لگتا ہے کہ اسرائیلی فوج کو نظریاتی اعتبار سے صاف کیا جا سکتا ہے۔''

یہاں ضروری ہے کہ ان دو منفرد سکیموں کا ذکر کیا جائے جنہیں فوج میں منظم انداز میں ملازمت اختیار کرنے اور لڑاکا اور ایلیٹ یونٹوں میں شامل ہو جانے والے این آر پی کے نوجوان پیروکاروں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ پہلی سکیم کو دو آزاد فریقوں نے تیار کیا تھا یعنی اسرائیل کی وزارت دفاع اور این آر پی کے ہسدر یشیووت مذہبی سکولوں کے مذہبی سربراہوں نے۔ اس سکیم کے مطابق ہسدر یشیووت کے طلبا کی بھرتی کا خاص پروگرام بنایا گیا۔ انہیں نارمل طریقے سے فوج میں شامل نہیں کیا جاتا تھا اور یوں وہ فوجی یونٹوں میں مسلسل تین سال خدمات انجام نہیں دیتے تھے۔ فوج کے ریگولر یونٹوں میں تقریباً ہمیشہ مختلف مذہبی اور سیکولر تصورات کے حامل جوانوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ ہسدر یشیووت کے طلباء کو ایک گروپ کے طور پر فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے اور وہ اپنی ہی کمپنیوں میں اپنے ربیوں کے ساتھ خدمات انجام دیتے ہیں، جو کہ طلباء کی ''مذہبی پاکیزگی'' پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ تین سال کی بجائے اٹھارہ ماہ کے لیے فوجی ملازمت کرتے ہیں۔ یہ اٹھارہ ماہ کا عرصہ بھی مسلسل نہیں ہوتا بلکہ چھ چھ ماہ کے تین حصوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے۔ ہر چھ ماہ بعد ہسدر یشیووت کے طلباء فوج چھوڑ کر یشیوا میں تالمود پڑھتے ہیں، جہاں سیکولر یہودی فوجیوں سے ملنے سے ان پر پڑنے والے منفی اثرات کو صاف کیا جاتا ہے۔ ہسدر یشیووت کے طلباء فوجی ریزرو یونٹوں میں معمول کی صورتِ حال میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس خصوصی

انتظام کا سبب 1970ء کی دہائی میں فوجی جرنیلوں کا گش ایمونم کے سیاسی دباؤ اور اس کے اراکین کے لیے بڑھتی ہوئی ہمدردی کو محسوس کرنا تھا۔ تاہم ہیسڈر ریشیووت کے طلباء کی خدمات سے استفادہ جاری رکھنے کی بڑی وجہ ان کی اعلیٰ فوجی صلاحیتیں اور ریکارڈ ہے۔ اسرائیلی فوج میں ان کی کارکردگی اوسط سے بہت اونچی ہے اور وہ نہایت جان نثار و سرفروش فوجی ہوتے ہیں۔ نہ صرف جرنیل بلکہ دوسرے فوجی بھی ان کے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہیں۔ مثال کے طور پر لبنان کی تین سالہ جنگ (85-1982ء) اور ''سکیورٹی زون'' میں لڑائی کے دوران اسرائیلی فوجیوں میں سے یشیووت کے طلباء فوجی سب سے زیادہ زخمی اور ہلاک ہوئے تھے۔ انتفاضہ کے دوران بھی ہیسڈر یشیووت یونٹوں کے فوجیوں نے اپنے آپ کو ممتاز ثابت کیا ہے۔ وہ فلسطینیوں پر ظلم وستم کرنے کے حوالے سے بہت مشہور ہیں۔ ان کی سفاکی اسرائیلی فوج کی اوسط سفاکی سے زیادہ ہے۔ خصوصی انتظام کے تسلسل کی ایک اور وجہ ہیسڈر ریشیووت کے طلباء کا ایک ہی کمپنی میں مجتمع ہونا ہے۔ جب فوجی کمانڈر فلسطینیوں یا دوسروں کو خصوصی سفاکانہ سزائیں دینا چاہتے ہوں تو وہ اکثر مذہبی فوجیوں پر بھروسہ اور ان کو استعمال کرتے ہیں۔*3 مختلف سیاسی تصورات کے حامل جوانوں پر مشتمل زیادہ عمومی کمپنیوں کے بعض جوانوں کے غیر قانونی ظلم وستم پر اعتراض کرنے نیز میڈیا والوں کو اس کی اطلاع دینے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ہیسڈر ریشیووت یونٹوں کے مذہبی فوجی، جو کہ سیکولر یہودیوں سے زیادہ ظالم ہوتے ہیں، ایسے احکامات پر اعتراض نہیں کرتے۔ 1996ء سے، جب یہ اشارے ملنے شروع ہوئے کہ ہیسڈر ریشیووت کے داخلوں میں اضافہ رک گیا ہے اور ان میں کمی کا امکان پیدا ہوا تو مذہبی پری ملٹری اکیڈمی سکیم اسرائیلی فوج میں این آر پی کے حامیوں کی منظم شمولیت کا بڑا وسیلہ بن گئی۔ اس انتظام کے تحت نوجوان، عموماً اٹھارہ سال عمر کے لڑکوں کو مذہبی پری ملٹری اکیڈمیوں میں ایک یا ڈیڑھ سال کے لیے بھرتی کیا جانے لگا۔ اس کے بعد وہ لڑاکا یا ایلیٹ یونٹوں میں تین سال خدمات انجام دیتے ہیں۔ یہ عمل ہیسڈر یشیووت کے طلباء کے یونٹوں یا کمپنیوں میں مجتمع ہو کر خدمات انجام دینے سے مختلف ہے۔ ان اکیڈمیوں کے ٹیچر بیشتر اوقات ربی نہیں ہوتے بلکہ تالمود کا تھوڑا بہت علم رکھنے والے سابق فوجی افسر ہوتے ہیں۔ فوجی تربیت بہت تھوڑی دی جاتی ہے اور تالمود کے ارضِ اسرائیل سے خلوص اور وفاداری اور گش ایمونم کی پسندیدہ اقدار کا درس دینے والے اجزا کی تعلیم زیادہ دی جاتی ہے۔ سیکولر اسرائیلی نوجوانوں کے لذت پسندانہ طرزِ حیات سے نالاں نوجوانوں کو پری ملٹری اکیڈمی کی راہبانہ زندگی بہت پسند آتی ہے۔ یہ ملٹری اکیڈمیاں ابتدا ہی سے مقبوضہ علاقوں کی بستی میں واقع ہیں۔ فوج شروع ہی سے کسی حد تک ان اکیڈمیوں کی مدد کرتی آئی ہے۔ تاہم بیشتر مالی امداد نجی عطیہ دینے والوں کی طرف سے آتی ہے۔ ان پری اکیڈمیوں کے گریجویٹ خوب تربیت یافتہ ہوتے اور آفیسر کوروں تک ترقی پاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اسرائیلی فوج مقدس ہے، اس لیے وہ پورے تین سال خدمات انجام دیتے ہیں۔ بعض لوگ زیادہ لمبے عرصے تک ملازمت کرتے اور افسر بن جاتے ہیں۔

رابن کے قتل کے بعد اکثر اسرائیلیوں نے فوج میں این آر پی کے پیروکاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو حکومت اور اسرائیل کے لیے خطرہ سمجھنا شروع کر دیا۔ رین ایڈیلسٹ نے عبرانی کے اخبار ''یروشلم'' کے

13 ستمبر 1996ء کے شمارے میں "پہلے ہم سپریم کورٹ کو اور پھر جنرل سٹاف کو فتح کریں گے" کے عنوان سے شائع ہونے والے اپنے مضمون میں ان خدشات کو بیان کیا۔ اس مضمون کا عنوان ریاستِ اسرائیل کے انتہائی اہم اداروں میں داخل ہونے اور انہیں فتح کرنے کی خواہش کو بیان کرتا ہے۔ مسیحا پرستانہ نظریات کے حامل دائیں بازو والے مذہبی آبادکاروں [4] کے عمومی مقاصد پر بحث کرتے ہوئے ایڈیلسٹ لکھتا ہے:

> ان کے ادارے طویل دوڑ کے کھلاڑی جیسا سٹیمنا رکھتے ہیں کیونکہ وہ یہودی قوم کی ابدی بقا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں انہوں نے ارضِ اسرائیل کی جنگ کے لیے چار فلسفے تراشے ہیں: بستیاں، مالی امداد، تعلیم اور مستقبل میں جنرل سٹاف پر غلبہ پانے کے لیے فوج میں اپنے آدمیوں کو بڑھانا۔ یہ کوئی سازش نہیں ہے۔ یہ تو اسرائیلی معاشرے کے مستقبل کے امیج کے لیے ان کی جدوجہد میں ایک قومی صورت حال ہے۔ یہ اچھے یا برے کا سوال نہیں بلکہ ریاستِ اسرائیل کے کیریکٹر کے حوالے سے ایک جدوجہد ہے۔ دائیں بازو کے مذہبی لوگ اس جائز سوچ کے حامل ہیں کہ اختیارات والے عہدوں پر پہنچا جائے جن میں جنرل سٹاف مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔
> یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسرائیل کے قیام کے وقت سے اسرائیلی سیاستدانوں کا خفیہ نعرہ تھا "پہلے ہم سکیورٹی اپریٹس کو اور پھر کنیسٹ اور حکومت کو فتح کریں گے۔" جب بن گوریان نے شیریٹ اور لیوون کو دھکیلا تو اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ گولڈا مائر کا نعرہ تھا "پارٹی ہی سب کچھ ہے" اور اس کے دور سے لیبر پارٹی جنرل سٹاف پر حکمران تھی۔ یہ حکمرانی اتنی مطلق تھی کہ بیگن اور شمیر، اپنی اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دوران، اسے ہلانے اور اپنی آئیڈیالوجی سے متاثر جنرل سٹاف تشکیل دینے میں ناکام رہے۔

مذہبی آبادکاروں نے اسرائیلی سیاست کو سمجھتے ہوئے فوج، اس کی آفیسر کوروں اور بالآخر جنرل سٹاف میں داخل ہونے کا منصوبہ بنایا۔ جیسا کہ ایڈیلسٹ نے لکھا ہے:

> مذہبی آبادکار جانتے تھے کہ صرف پارٹی پالیٹکس اور اپنی آئیڈیالوجی کی مدد سے وہ زیادہ دور نہیں جاسکیں گے اور خدا کے وعدے کے مطابق وسیع ریاستِ اسرائیل حاصل نہیں کر پائیں گے۔ تب انہوں نے ہر ایسے منصب تک رسائی پانے کا تہیہ کیا کہ جہاں تمام اہم فیصلے ہوتے ہیں، خصوصاً جنرل سٹاف میں۔ پہلے مقصد اور پھر اسے پورا کرنے کے ذرائع کا تعین کیا گیا۔
> ہیسڈر ریشیووت اور مذہبی پری ملٹری اکیڈمیاں ایسے ہی ذرائع بن گئیں۔

اسرائیل کے دوسرے سیاسی مبصروں نے ایڈیلسٹ کے تجزیئے کو تسلیم کیا۔ مثال کے طور پر یدان طر نے 24 جنوری 1997ء کے ہارٹز میں "خدا کی فوج" کے عنوان سے شائع ہونے والے اپنے مضمون میں ڈاکٹر

ریووین گال کے خیالات بیان کیے، جو 1976ء سے 1982ء کے درمیانی عرصے میں اسرائیلی فوج کا چیف سائیکالوجسٹ رہا اور پھر اسے انتہائی موقر ادارے کارمل انسٹی ٹیوٹ فار ملٹری اینڈ سوشل ریسرچ کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ ملر کے بقول ڈاکٹر گال نے 1994ء سے 1996ء تک لڑاکا یونٹوں میں رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دینے والوں کی تعداد کا موازنہ 1989ء کی تعداد سے کیا۔ ڈاکٹر گال نے بتایا کہ 1989ء میں سیکولر نوجوانوں کی ساٹھ فی صد تعداد لڑاکا یونٹوں میں خدمات انجام دینا چاہتی تھی۔ 1993ء سے 1996ء کے دوران یہ اوسط گھٹ کر 48 فیصد ہو گئی۔ 1995ء اور 1996ء کے دوران زیادہ کمی آئی۔ یہ کمی سیکولر کبوتزم یعنی بائیں بازو کی اکثریت والے علاقوں میں زیادہ آئی۔ یہ تعداد 1989ء کے 83 فیصد سے کم ہو کر 1993ء تا 1996ء میں 98 فیصد تک گھٹ گئی۔ اس کے مقابلے میں اسی عرصہ کے دوران لڑاکا یونٹوں میں رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دینے کے خواہش مند مذہبی نوجوانوں کا تناسب 80 فیصد ہی رہا۔ مذہبی کبوتزم میں یہ تناسب نوے فیصد تک پہنچ گیا۔ اوسلو معاہدے سے پہلے فوج میں داخل ہونے والے مذہبی نوجوانوں کی اکثریت اپنے کمانڈر کے احکامات کو کسی ربی کی ہدایات سے بھی برتر تصور کرتی تھی تاہم یہ صورتحال 1996ء تک تبدیل ہو چکی تھی۔ ملر ڈاکٹر گال کا حوالہ دینے کے بعد لکھتا ہے:

"مذہبی نوجوانوں کی اچھی خاصی تعداد کے لیے کسی ربی کی ہدایات، کسی فوجی کمانڈر کے حکم کے مساوی اور بعض اوقات اس سے زیادہ وقعت رکھتی ہیں۔"

اس قسم کے مضامین شائع ہونے سے اکثر سیکولر یہودی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اپنے نوجوانوں کے لیے فوج میں مذہبی نوجوانوں جیسی ملازمتیں حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے سیکولر پری ملٹری اکیڈمیاں قائم کرنے کی بھی وکالت کی۔ تاہم نیتن یاہو حکومت کے پہلے دو برسوں کے دوران، جب اوسلو پراسیس رک گیا تھا، لڑاکا یونٹوں میں رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دینے والے سیکولر نوجوانوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو گیا جتنا کہ 1970ء کے عشرے سے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس صورت حال کی وجہ سے دائیں بازو کے کے مسیحا پرست مذہبی نوجوانوں کے فوج میں داخلے کی کوششوں پر منفی اثر پڑا۔ اسرائیلی یہودی آبادی میں چھ سے سات فیصد تک موجود مسیحا پرست مذہبی یہودی لڑاکا یونٹوں میں اس لیے ملازمت اختیار کرتے تھے کہ دوسرے یہودی اس طرف مائل نہیں تھے۔ 1996ء میں نیتن یاہو کے الیکشن کے بعد دو عوامل نے اسرائیلی یہودی نوجوانوں کو لڑاکا یونٹوں میں رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دینے پر ابھارا۔ اسرائیل اور اس کی منتخب حکومت سے عربوں کی بڑھتی ہوئی نفرت پہلا عامل تھی۔

کچھ عرب لیڈروں نے جنگ کی دھمکیاں دیں۔ بیشتر اسرائیلی نوجوانوں نے ان سب اقدامات کو غیر معقول تصور کیا اور روایتی اسرائیلی انداز میں زبردست عسکریت پسندی کی وکالت کرتے ہوئے اس کا جواب دیا۔ دوسرا عامل یہ تھا کہ نیتن یاہو کی حکومت یہودی اقلیتوں کا ایک نیا اتحاد تھی، جن کو اسرائیلی ریاست کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اہم سماجی مواقع حاصل ہوئے۔ اسرائیلی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ وزیر دفاع اور چیف آف سٹاف مشرقی یہودی تھے۔ لیبر پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے فوج کے پرانے ایلیٹ عہدہ داروں نے ان کے تقرر کی

مخالفت کی۔ اس کے نتیجے میں ایسے اسرائیلی یہودی نوجوانوں کو آرمی افسر بننے کا شوق پیدا ہوا جو اشکینازی لیبر حامی خاندانوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بیشتر ایسے نوجوان پہلے سوچتے تھے کہ انہیں فوج میں افسر بننے نہیں دیا جائے گا۔ کم آمدنی والے اسرائیلی یہودیوں میں ایک آرمی افسر کا عہدہ زیادہ تنخواہ کی وجہ سے معاشی طور پر پُرکشش اور باعزت ہے۔ کمپیوٹر ایکسپرٹ، ڈاکٹر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ سپیشلسٹ بننے کے علاوہ ایک اچھے کیریئر کا راستہ لڑاکا یونٹ میں خدمات انجام دینا ہے۔

اوسلو پراسیس کی ناکامی سے اسرائیلی فوج میں داخل ہونے اور اس طرح اسرائیلی پالیسیوں پر غالب اثر حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے مذہبی آبادکاروں پر الٹا اثر پڑا۔ جس زمانے میں رابن اور پیریز حکومتوں کے تحت اوسلو پراسیس جاری تھا، اس کے بیشتر عرصہ میں فوج میں مذہبی آبادکاروں کی شمولیت کے مواقع میں اضافہ ہوا۔ نیتن یاہو اور لیکوڈ کے 1996ء میں اقتدار میں آنے کے بعد مذہبی آبادکاروں کے مخصوص اسرائیلی پالیسیوں کو متعین کرنے کے مواقع کم ہو گئے۔ شاید یہ پیش رفت ہمیں مذہبی جنونیت کے انجام کی ایک مثال مہیا کرتی ہے۔ جب کوئی مذہبی جنونی گروپ اپنے معاشرے کے دوسرے حصوں کی طرف سے اپنے آپ کو خطروں کی زد میں محسوس کرے تو وہ جدوجہد کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی معاشرہ کسی بیرونی دھمکی کے خلاف متحد ہو جاتا ہے تو مذہبی جنونی گروپ کی یہ استعداد گھٹ جاتی ہے کہ وہ فوج جیسے اہم اداروں میں داخل ہو کر دوررس پالیسی پر اثرانداز ہو۔



چھٹا باب

باروک گولڈ سٹائن کی حقیقی اہمیت

25 نومبر 1994ء کو ہیبرون میں باروک گولڈ سٹائن نے خون کی ہولی کھیلی جس کی کہانی بڑی مشہور ہے۔ گولڈ سٹائن نے ایک مسجد میں داخل ہو کر نمازیوں پر پیچھے سے فائرنگ کی۔ جس کی وجہ سے بچوں سمیت 29 افراد ہلاک اور بے شمار لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ اس باب میں ہم اس قتلِ عام کی کہانی بیان نہیں کریں گے بلکہ ہم قتلِ عام سے پہلے گولڈ سٹائن کے کیریئر اور قتلِ عام کے فوری بعد اسرائیلی حکومت اور بنیاد پرست یہودیوں کے ردِ عمل پر توجہ مرکوز کریں گے۔ اس سے یہودی بنیاد پرستی کا ایک واضح تصور نمایاں ہوگا۔ ہم اپنی بحث کو 1998ء کے موسمِ گرما تک کی کچھ تفصیلات تک وسیع کریں گے۔

گولڈ سٹائن کے حوالے سے ایک اور اہم حقیقت اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کے اثر کو واضح کرتی ہے۔ قتلِ عام سے طویل عرصہ پہلے گولڈ سٹائن فوج میں ڈاکٹر تھا۔ اس دوران اس نے فوج میں ملازمت کرنے والے عربوں تک کا علاج کرنے سے مسلسل انکار کر کے فوج کا ڈسپلن توڑا۔ اسے فعال یا ریزروسروس کے دوران احکام کی خلاف ورزی کرنے پر اس کے حق میں ہونے والی مداخلت کی وجہ سے سزا نہیں دی گئی۔ عبرانی اخبارات میں اس واقعے پر بحث کرنے والے سیاسی مبصروں اور ایک بھی سیاستدان نے اس حقیقت کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ ہم یہودی بنیاد پرستی کے اپنے تجزیئے میں اس واقعے کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

''داور'' کے باقاعدہ نامہ نگار آریک کیزل نے یکم مارچ 1994ء کو یدیوت اہرونوٹ میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا کہ گولڈ سٹائن نے اسرائیل آنے کے تھوڑے عرصے بعد ایک آرٹلری بٹالین کے ڈاکٹر کی حیثیت سے لبنان میں خدمات انجام دیتے ہوئے جیتائل کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیزل کے مطابق گولڈ سٹائن نے ایک زخمی عرب کا علاج کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا: ''میں کسی غیر یہودی کا علاج کرنے پر راضی نہیں ہوں۔ میں صرف دو مذہبی عالموں کو مستند سمجھتا ہوں: ابن میمون اور کاہان۔'' کیزل نے

مزید لکھا:

گولڈ سٹائن کی بٹالین کے تین دروز فوجیوں نے اپنے کمانڈر سے کہا کہ ان کی بٹالین میں کسی دوسرے ڈاکٹر کا تقرر کیا جائے کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ زخمی ہونے کی صورت میں گولڈ سٹائن ان کا علاج کرنے سے انکار کر دے گا۔ ان کی اس درخواست کے نتیجے میں گولڈ سٹائن کو دوسری بٹالین میں بھیج دیا گیا۔ اس نے باقاعدہ اور ریزرو فوج میں ڈاکٹر کی حیثیت سے کام جاری رکھا۔ چند برسوں بعد اسے مرکزی کمان کے علاقائی ہبرون بریگیڈ میں متعین کر دیا گیا، جہاں اس نے ریزرو ڈیوٹی دی۔ اس تقرر کے فوری بعد اس نے اپنے کمانڈروں کو بتایا کہ اس کا مذہبی عقیدہ اسے زخمی یا بیمار عربوں کا علاج کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے کسی اور جگہ متعین کر دیا جائے۔ اس کی درخواست قبول کر لی گئی اور اسے جنوبی لبنان میں خدمات ادا کرنے والے ریزرو یونٹ میں بھیج دیا گیا۔

امیر اورن نے، جو کہ بعد ازاں ہارٹز کا فوجی نامہ نگار بن گیا تھا، 4 مارچ 1994ء کے "داور" میں شائع ہونے والے مضمون میں اسرائیلی فوج اور پوری اسرائیلی سیاسی اسٹیبلشمنٹ سے گولڈ سٹائن کے تعلقات کی مکمل کہانی بیان کی ہے۔ اورن کے بقول 1984ء کے انتخابات اور ان کے نتیجے میں نیشنل یونٹی حکومت کے قیام کے بعد اس وقت کے وزیر دفاع اسحاق رابن اور چیف آف سٹاف جنرل موشے لیوی کو علم ہوا کہ گولڈ سٹائن نے لبنان میں غیر یہودیوں کا علاج کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اورن لکھتا ہے:

جب غیر یہودیوں کے علاج کرنے سے گولڈ سٹائن کے انکار کی اطلاع اس کی آرٹلری کور اور میڈیکل کور کے کمانڈروں کو ہوئی تو فطری سی بات ہے کہ ان کی خواہش اس کا کورٹ مارشل کرنے اور اس سے نجات پانے کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کام باسانی ہو سکتا ہے کیونکہ گولڈ سٹائن نے صرف میڈیکل افسروں کا آرمی کورس کیا ہوا تھا۔ (گولڈ سٹائن نے لڑاکا افسر کی تربیت حاصل نہیں کی ہوئی تھی، جو کہ عموماً میڈیکل افسروں کے کورس میں داخلے کی شرط ہوتی ہے)۔ دونوں کور کمانڈروں کو یہ بھی علم تھا کہ میڈیکل افسر کے فوجی کورس کے دوران وہ ایک عرب مخالف انتہا پسند کے طور پر بدنام تھا۔

دیگر عبرانی اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق شرکائے کورس نے گولڈ سٹائن کو نکال دینے کا مطالبہ کیا تھا، لیکن ان کے مطالبے کو مسترد کر دیا گیا۔ اس حوالے سے اورن لکھتا ہے: "گولڈ سٹائن کو اس وقت اعلیٰ وزارتوں میں بلند مناصب پر فائز لوگوں نے تحفظ فراہم کیا تھا۔ انہیں سرپرستوں نے درخواست کی تھی کہ گولڈ سٹائن کو کسی لڑاکا بٹالین کی بجائے کریت اربا میں خدمات انجام دینے کی اجازت دی جائے" تب صورت حال بگڑ کر "آرمی میڈیکل کور کے کمانڈر اور اس کے چیف ربی کے مابین تنازعے کا باعث بن گئی۔" اورن لکھتا ہے:

ہلاکا کے احکامات کو جواز بنا کر احکامات ماننے سے کھلم کھلا انکار کرنے والے ایک افسر سے نمٹنے کا مسئلہ کبھی حل نہیں ہوا۔ خواہ اس افسر نے اسرائیلی فوجیوں اور جنگی قیدیوں (POWs) کو طبی امداد دینے سے انکار کیا ہو۔ کیا ہم گولڈ سٹائن کا کورٹ مارشل کرنے میں فوج کی ناکامی پر ششدر ہونے سے بچ سکتے ہیں؟ پوری فوجی کمان نے اس کے کورٹ مارشل کے احکامات کیوں جاری نہیں کیے؟ ان میں شامل تھے: شمالی کمان کے کمانڈر ریزرو جنرل اوری اور (جو بعد ازاں 1994ء میں لیبر پارٹی کی طرف سے کنیسٹ کا رکن اور کنیسٹ کمیٹی برائے خارجہ ودفاعی معاملات کا چیئرمین بنا) اور جنرل ایموس یارون، جواب مین پاور ڈیپارٹمنٹ کا کمانڈر ہے۔ انہوں نے چیف ربی سے مشورہ کیے بغیر فیصلہ کرنے سے کیوں انکار کیا تھا؟ میڈیکل کوروں کے پہلے ہی سے ندامت زدہ کمانڈر اب (قتلِ عام کے بعد) تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ اس معاملے کا چرچا ہوا تو مذہبی پارٹیاں اور مذہبی آبادکاروں کی لابیاں ہمیشہ سے زیادہ مسائل کھڑے کریں گی۔ پبلسٹی کا خوف ہر زمانے میں فوجی کمانڈروں کو ہر قسم کے گولڈسٹائنوں کا کورٹ مارشل کرنے سے روکتا رہا ہے۔

بہت سی دیگر مثالوں سے بھی اورن کے بیان کی توثیق ہوئی ہے کہ گولڈ سٹائن صورت حال کوئی منفرد معاملہ نہیں تھی۔ اورن کے بیان سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ اسرائیلی فوج میں مذہبی پارٹیوں کا اثر و نفوذ کس قدر زیادہ ہے۔ غیر یہودیوں کے خلاف یہودی آرتھوڈوکسی کی نفرت، جس کا اظہار گولڈ سٹائن کا دیوتا جیسا لیڈر ربی مائر کاہان کرتا تھا، بڑی مذہبی پارٹیوں کا بنیادی رویہ تھی اور آج بھی ہے۔ اسرائیلی فوج بھی غیر یہودیوں سے نفرت کرتی ہے۔ مزید برآں اگر اورن کے بیان کردہ دوسرے فوجی کمانڈر اور ربن کاہان اور گولڈ سٹائن کے خیالات سے متفق نہ ہوتے تو انہوں نے فوجی نظم وضبط کو مذہبی پارٹیوں کی خوشی کے لیے قربان نہ کیا ہوتا۔ فلسطینیوں، مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے عربوں (جنہیں صیہونیت پرست غیر یہودی کہتے ہیں) اور دوسری اقوام کے لوگوں کے حوالے سے بنائی گئی اسرائیلی پالیسیاں صرف اسی مفروضے کے تحت واضح کی جا سکتی ہیں کہ ان کی بنیاد جینٹائل مخالف جذبہ ہے۔ انتہائی مذہبی یہودیوں میں جینٹائل مخالف جذبہ بہت مضبوط ہے تاہم یہ سیکولر یہودیوں میں بھی اسی طرح موجود ہے۔ 1984ء اور 1985ء میں گولڈ سٹائن کی حمایت اور قتلِ عام کے بعد بہت سے اسرائیلی لیڈروں کی طرف سے اس کے جواز فراہم کرنے میں ایک ربط ہے۔ ان جوازوں کو منافقانہ صدمے کا باریک نقاب پہنا دیا گیا تھا۔

کریت اربا میں ٹرانسفر کے بعد بھی گولڈ سٹائن نے غیر یہودیوں کا علاج کرنے سے انکار جاری رکھا۔ ناہوم بارنی نے 27 فروری 1994ء کے یدیوت اہرونوٹ میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا:

مجھے ہیبرون کے دو سینئر اسرائیلی فوجی افسروں نے باروک گولڈ سٹائن سے اپنے

دوٹا کروں کا احوال سنایا۔ دوسرے ٹاکرے میں وہ کریت اربا کا دورہ کرنے والے
صدر ایذر وائز مین کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسے گالیاں دے رہا تھا۔ ان کا
گولڈسٹائن سے پہلا ٹاکرا تب ہوا تھا جب ایک اسرائیلی فوجی نے ایک عرب کی ٹانگ
میں گولی مار کر اسے زخمی کر دیا تھا۔ اس عرب کو علاج کے لیے فوجی کلینک لے جایا گیا،
لیکن گولڈسٹائن نے اس کا علاج کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد گولڈسٹائن کی جگہ
ایک اور فوجی ڈاکٹر کو متعین کر دیا گیا تھا۔ اس افسر نے یہ واضح نہیں کیا کہ گولڈسٹائن کی
تنزلی کرنے کی بجائے اسے ریزروز میں اپنے فرائض ادا کرنے کی اجازت کیوں دی
گئی؟ گولڈسٹائن نے اپنے ڈاکٹری کے حلف کو بھی پامال کیا تھا، تاہم اس کے لیے
اسرائیلی فوج کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔

بارنی نے واضح کیا کہ گولڈسٹائن کو اس کے غلط اعمال پر صرف فوج نے ہی رعایت نہیں دی تھی بلکہ اس کی ذمہ دار پوری اسرائیلی اسٹیبلشمنٹ ہے۔ یہ روش قتلِ عام تک برقرار رہی۔ صرف قتلِ عام کے بعد سرکاری موقف بدلا، صدمے کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ کام صرف اور صرف گولڈسٹائن کا ہے۔ قتلِ عام کے بعد پہلے تین گھنٹوں کے دوران رابن اور اس کے رفقاء نے باصرار کہا کہ گولڈسٹائن نفسیاتی مریض ہے یا یہ کہ وہ ایک مخلص ڈاکٹر ہے، جو عارضی طور پر ایسی خونی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ بارنی لکھتا: ''چند گھنٹوں کے اندر اندر جوازوں کا محل تعمیر کر لیا گیا، جن کے مطابق گولڈسٹائن برداشت نہ کیے جا سکنے والے ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے عربوں سمیت لاتعداد زخمی لوگوں اور مرے ہوؤں کو دیکھنا پڑتا ہے۔'' جن لوگوں نے یہ جھوٹ بولا، وہ جانتے تھے کہ گولڈسٹائن نے عربوں کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بارنی مزید لکھتا ہے ''یوں عربوں کو اس کے مجبوری کے تحت کیے گئے عمل پر احساسِ خطا کا شکار کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ اس نے یہ عمل عربوں کے فائدے کے لیے کیا تھا کہ اس نے بالآخر انہیں آگاہ کرا دیا کہ یہودی خون کو یوں سفاکی کے ساتھ بہایا نہیں جا سکتا۔'' یہ سفید جھوٹ جتنا زیادہ عرصے تک ممکن تھا، بولا جاتا رہا اور جب اسے عام کرنا ترک کیا گیا تو اس پر معافی بھی نہیں مانگی گئی۔ اس طرح کے جھوٹ کو عام کرنے سے انکشاف ہوا کہ اسرائیلی اسٹیبلشمنٹ کے سیکولر حصوں پر یہودی بنیاد پرستی کا اثر کس قدر گہرا ہے۔

گولڈسٹائن انتہا درجے کی یہودی بنیاد پرستی کا مظہر ہے۔ قتل عام کے زمانے میں گش ایمونم کے کچھ لیڈر صرف اس سے تھوڑا ہی کم انتہا پسند تھے۔ بارنی گولڈسٹائن کے غیر یہودیوں کے لیے رویے کا موازنہ گش ایمونم کے لیڈر ربی لیونجر سے کیا ہے، جس کا انٹرویو اس نے قتل عام والے دن لیا تھا:

> لیونجر کریت اربا میونسپلٹی میں تین گھنٹے پر محیط بحث جیتنے اور قتل عام پر مذہبی آبادکاروں کے ردعمل کی نوعیت کے حوالے سے گفتگو کرنے کے بعد خوش گوار موڈ میں تھا۔ جوڈیا، سماریا اور غزہ کی کونسل کے سیکرٹری یوری اریئل نے (جو 1998ء میں وزیر اعظم کے دفتر

کا ڈائریکٹر مقرر ہوا تھا) تجویز دی کہ قتل عام کی مذمت کی جائے جبکہ لیونجر نے اس تجویز کی بھرپور تائید کی تھی کہ اسرائیلی حکومت کو گولڈسٹائن کی مذمت کرنے کی بجائے یہ کہنا چاہیے کہ اس نے ذہنی دباؤ سے مجبور ہو کر یہ عمل کیا تھا۔

بحث میں "قتل عام" یا "مارنے" جیسی اصطلاحوں سے گریز کیا گیا تھا اور ان کی بجائے "ہلاکتیں" اور "وقوعہ" جیسی اصطلاحوں کو استعمال کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہلاکا کے مطابق کسی بھی حال میں کسی یہودی کے ہاتھوں کسی غیر یہودی کی ہلاکت کو قتل تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ دوسری وجوہات کے تحت، خصوصاً اس صورت میں کہ جب ایسا کرنا یہودیوں کے لیے نقصان کا باعث ہو، غیر یہودیوں کا قتل ممنوع ہے۔ بیشتر صورتوں میں غیر یہودیوں کو قتل کرنے والے یہودی کو اسرائیل میں قانون پر عمل کرنے والا تصور کیا جاتا ہے۔ لیونجر نے بارنی کو بتایا کہ عربوں کی ہلاکت پر دکھ کے اظہار کے لیے قرارداد "منظور کی جا رہی ہے" اور اس میں "حکومت کی ذمہ داری پر زور دیا گیا ہے" جب بارنی نے پوچھا کہ کیا اسے افسوس ہوا ہے تو لیونجر نے جواب دیا "مجھے نہ صرف عربوں کے مرنے پر دکھ ہے بلکہ مکھیوں کے مرنے پر بھی۔" گولڈسٹائن نے قتل عام سے کئی سال پہلے اصولی بنیادوں پر غیر یہودیوں کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کریت اربا میں میونسپل ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کیا اور عربوں کا علاج صرف اسی وقت کیا جب اس سے گریز ممکن نہیں تھا۔ بارنی نے کریت اربا کے کلینک میں گولڈسٹائن کے ساتھ کام کرنے والے ایک ڈاکٹر کا حوالہ دیا ہے، جس کا کہنا تھا کہ "جب کبھی گولڈسٹائن کو کسی ٹریفک حادثے کے مقام پر جانا پڑتا تو وہ عرب زخمیوں کو پہچان کر صرف اس وقت تک ان کی دیکھ بھال کرتا تھا، جب تک کوئی دوسرا ڈاکٹر ان کے علاج کے لیے نہ پہنچ جائے۔ اس کی آمد پر وہ علاج سے دستکش ہو جاتا تھا۔" اس کے ساتھی نے کہا کہ "یہ اس کے ڈاکٹری کے حلف اور نظریئے کا سمجھوتہ تھا۔"

ہلاکا میں حکم دیا گیا ہے کہ "کوئی نیک یہودی ڈاکٹر جینٹائل کا علاج اسی صورت میں کر سکتا ہے جب اس کے انکار کی اطلاع حکام کو ہونے کا امکان ہو اور اس کے اور دوسرے یہودیوں کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔" نیک یہودی ڈاکٹروں کے گولڈسٹائن جیسے رویے کی ایک وجہ ہے۔ آریک کمنزل نے اپنے یدیوت اہرونوت والے مضمون میں لکھا ہے کہ اسرائیلی فوج کو پتا چلا کہ گولڈسٹائن کے رویے پر کسی قسم کی انضباطی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے۔ "ماریو" کے ایک نامہ نگار نے 8 مارچ 1994ء کی ایک رپورٹ میں لکھا کہ گولڈسٹائن کا ملٹری سروس ریکارڈ اس کی کیپٹن کے عہدے سے میجر کے عہدے تک ترقی کے لیے کافی تھا۔ اسرائیل کے صدر نے سرکاری طور پر اسے 14 اپریل 1994ء کو ترقی دی۔ صرف گولڈسٹائن کی موت نے، جو کہ قتل عام کے وقت وقوع پذیر ہوئی تھی، ایک انکشاف انگیز ترقی نہ ہونے دی۔

اسرائیلی اسٹیبلشمنٹ کے سیکولر حصے پر یہودی بنیاد پرستی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ قتلِ عام کی ارادی نوعیت کے باوجود گولڈسٹائن کا جنازہ بڑے تزک واحتشام کے ساتھ اٹھانے کے لیے حکومت نے انتظامات کیے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ نے یہ اقدام ایک ایسی وجہ کے تحت کیا تھا جس کی خبریں عبرانی پریس میں تو

نمایاں طور پر شائع ہوئی تھیں تاہم بہت کم غیر ملکی اخبارات نے اسے شائع کیا تھا۔ وہ وجہ یہ تھی کہ قتل عام کے بعد دو ہی دن کے اندر یروشلم اور دیگر مذہبی علاقوں کی دیواریں ایسے پوسٹروں سے بھر گئی تھیں جن میں گولڈ سٹائن کے کارنامے کو سراہا گیا تھا اور اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ زیادہ عربوں کو قتل نہیں کر سکا۔ قتل عام کے مہینوں بعد تک یروشلم میں مظاہرے کرنے والے مذہبی آباد کاروں کے بچے ایسے پوسٹر لہراتے تھے جن پر لکھا ہوتا تھا "ڈاکٹر گولڈ سٹائن نے اسرائیل کے تمام امراض کا علاج کر دیا ہے۔" اسرائیلی مذہبی موسیقی کی اکثر محفلیں اور دیگر محفلیں گولڈ سٹائن کو سراہنے کی تقریبات میں بدل جاتی تھیں۔ عبرانی پریس نے عوامی ستائش کی ان تقریبات کی تفصیلی خبریں شائع کیں۔ کسی بڑے سیاستدان نے ان پر احتجاج نہیں کیا تھا۔

صدر وائز مین نے قتل عام پر سب سے زیادہ دکھ کا اظہار کیا۔ یوزی بینزی مین نے 4 مارچ 1994ء کے ہارٹز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ اسی دوران صدر وائز مین گولڈ سٹائن کے عزیز و اقارب اور کاچ کے اراکین سے طویل ملاقاتیں کر کے عظیم الشان جنازے کی تفصیلات طے کر رہا تھا۔ کریت اربا کے آباد کاروں نے ریڈیو اور ٹیلیویژن پر خود کو قتل عام کا حامی اور گولڈ سٹائن کو شہید (Martyr) اور مقدس آدمی قرار دیا۔ انہوں نے ہیبرون کے علاقے کے کمانڈر جنرل یاتوم سے مطالبہ کیا کہ گولڈ سٹائن کے جنازے کو ہیبرون شہر سے گزرنے دیا جائے تاکہ عرب اس کو دیکھ سکیں۔ حالانکہ ہیبرون شہر میں کرفیو لگا ہوتا تھا۔ یاتوم نے اس مطالبے کو غلط قرار نہیں دیا تاہم یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ اس سے نظم و ضبط کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کریت اربا کے میئر اور ایک انتہا پسند مذہبی آباد کار زوی کیتزر وور نے صدر وائز مین کو فون کر کے دھمکی دی کہ اگر آباد کاروں کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو وہ عربوں کے خون سے ہولی کھیلیں گے۔ وائز مین نے چیف آف سٹاف کو فون کر کے اس سے پوچھا کہ فوج نے آباد کاروں کے مطالبے کی مخالفت کیوں کی تھی۔ بینزی مین کے بقول چیف آف سٹاف بارک نے جواب دیا تھا: "فوج کو خدشہ تھا کہ عرب گولڈ سٹائن کی قبر کی توہین کریں گے اور اس کی لاش قبر کھود کر باہر پھینک دیں گے۔" کریت اربا کے آباد کاروں اور بارک، یاتوم، رابن اور کاچ لیڈروں کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں بینزی مین کے بقول صدر وائز مین کا مستقل موقف یہ تھا کہ "فوج کو آباد کاروں کی خواہشات اور گولڈ سٹائن کے خاندان کے احساسات کا احترام کرنا چاہیے۔ آخر کار مذاکرات میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ یروشلم میں شاندار جنازہ نکالا جائے گا اور گولڈ سٹائن کے احترام میں شہر کی کچھ معروف ترین سڑکوں کو بند کر دیا جائے گا۔" بعد ازاں قاتل کو کریت اربا میں کاہان ایونیو کے ساتھ دفنایا جائے گا۔ بینزی مین کے بقول کاچ لیڈروں نے پہلے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جنرل یاتوم نے خود جا کر کاچ لیڈروں سے ملاقات کی اور فیصلے کو ماننے کی التجا کی۔ اس کی درخواست کو قبول کر لیا گیا۔ یاتوم کو کریت کے بدنام ربی ڈوو لیور کی رضامندی بھی حاصل کرنا پڑی۔ لیور نے 4 مارچ 1994ء کے "یروشلم" میں لکھا: "چونکہ گولڈ سٹائن نے جو کچھ کیا، وہ خدا کے نام پر کیا، اسے لیے اسے ایک نیک انسان تصور کرنا چاہیے۔" بینزی مین نے صدر وائز مین اور اس کے رفقاء کے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا "صدارتی محل کے حکام اپنی مصروفیات کو آباد کاروں کا موڈ درست کرنے

کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔" جنازے کے بعد اسرائیلی فوج نے گولڈ سٹائن کی قبر پر گارڈ آف آنر پیش کیا۔ قبر زیارت گاہ بن گئی، نہ صرف مذہبی آبادکاروں کے لیے بلکہ تمام اسرائیلی شہروں کے نیک یہودیوں کے گروپ وہاں آنے لگے۔

صدر وائز مین نے گولڈ سٹائن کے جنازے کے جو انتظامات کروائے ان کی تفصیل بہت اہم ہے۔ یہ تفصیلات ہم نے یدیوت اہرونوت کے 28 مارچ 1994ء کے شمارے میں شائع ہونے والی ایلان بام اور زوی سنگر کی ایک رپورٹ سے لی ہیں۔ یروشلم میں نکلنے والے جنازے میں ہزاروں لوگ شامل تھے، جن میں آبادکار بہت کم تھے۔ بام اور سنگر نے لکھا ہے کہ "یروشلم میں گولڈ سٹائن کے جنازے میں شریک لوگ اس سے کبھی ملے نہیں تھے تاہم وہ اس کے کارنامے کو سراہ رہے تھے۔ یشیوا طلبا کافی زیادہ تعداد میں جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ کبد ہیسڈک مومنٹ کا ایک بڑا گروپ آیا ہوا تھا، دوسرا گروپ (صیہونیت مخالف) ستمار ہسیڈیوں کا تھا۔" دیگر ہیسڈی تحریکوں کے بھی بہت سے لوگ جنازے میں شریک تھے۔ (انگریزی اخبارات میں یہ خبر شائع نہیں ہوئی کہ کاہان کا پیروکار گولڈ سٹائن لوبوچ ربی کا بھی پیروکار تھا)۔ بام اور سنگر لکھتے ہیں:

> جنازے کے انتظار میں کھڑے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا جا سکتا تھا کہ "گولڈ سٹائن ہیرو ہے! وہ ایک نیک انسان تھا! اس نے ہم سب کی طرف سے یہ اقدام کیا تھا!" مذہبی یہودیوں کے ہر اجتماع کے مانند یہ اجتماع بھی اسرائیلی میڈیا، اسرائیلی حکومت کے شر اور سب سے بڑھ کر قتل کی مخالفت میں بولنے والے ہر شخص کے خلاف نفرت سے سلگ رہا تھا۔

جنازے کے روانہ ہونے سے پہلے مشہور ربیوں نے گولڈ سٹائن کو سراہا۔ مثال کے طور پر ربی اسرائیل اریئل نے کہا: "مقدس شہید گولڈ سٹائن جنت میں ہمارا استقبال کرے گا۔ گولڈ سٹائن نے کسی فرد کی حیثیت سے یہ قدم نہیں اٹھایا، اس نے تو ارضِ اسرائیل کی دردانگیز صداؤں کا جواب دیا ہے، جسے مسلمان ہر روز ہم سے چھینے جا رہے ہیں۔ اس نے وطن کو اس درد میں راحت دینے کے لیے یہ اقدام کیا ہے۔" ربی اریئل نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا: "یہودی امن معاہدے سے نہیں بلکہ صرف خوں ریزی سے وطن کو حاصل کر سکتے ہیں۔" یہودی خفیہ تنظیم کے ایک رکن بین شوشن یشو آ نے بھی تقریر کی۔ ماضی میں اس کو قاتل قرار دے کر سزا سنائی گئی تھی مگر اسے چند برس نہایت آسان قید میں رکھ کر معاف کر دیا گیا تھا۔ اس نے گولڈ سٹائن کی تعریف کی اور کہا کہ دوسرے یہودیوں کو اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

جنازے کی حفاظت پر سرحدی گارڈز، پولیس اور خفیہ پولیس متعین تھی۔ بام اور سنگر لکھتے ہیں:

> جنازے کے آگے آگے سرحدی گارڈز کا پورا یونٹ چل رہا تھا۔ ان کے پیچھے یروشلم میں رہنے والے کاہان کے نوجوان پیروکاروں کا ایک گروپ تھا، جو نعرے لگا رہا تھا: "عرب مردہ باد۔" ایسا لگتا تھا کہ اگر کوئی عرب سامنے آ گیا تو وہ اسے قتل کر ڈالیں گے۔

اچانک ایک سرحدی گارڈ نے ایک عرب کو جنازے کے عقب میں آتے دیکھا۔ وہ ایک کم اونچی باڑھ کے پیچھے موجود تھا۔ سرحدی گارڈ باڑھ پھلانگ کر دوسری طرف گیا اور عرب کو روک لیا اور کسی کو پتا چلنے سے پہلے اسے زبردستی دور لے گیا۔ اس طرح سرحدی گارڈ نے یقینی طور پر اس کی جان بچالی تھی۔

نوجوان کاہان گروپ کے پیچھے ایک تابوت تھا، جس کے گرد کاہان گروپوں کے لیڈر موجود تھے، جن میں کچھ پولیس کو مطلوب تھے۔ (پولیس اور خفیہ پولیس نے بعد میں کہا کہ انہوں نے مطلوب لیڈروں کو پہچانا نہیں تھا۔ اخباری نامہ نگاروں نے تو انہیں بآسانی پہچان لیا تھا۔) بام لکھتا ہے:

> پولیس کو مطلوب ایک کاہان گروپ لیڈر تیران پولاک نے تابوت کے قریب مجھے انٹرویو دیا۔ اس نے کہا: ”گولڈ شائن نہ صرف نیک اور مقدس ہے بلکہ وہ ایک شہید ہے۔ چونکہ وہ شہید ہے لہٰذا اس کو غسل دیے بغیر اور کفن کی بجائے اس کے کپڑوں ہی میں دفنایا جارہا ہے۔ قابلِ احترام ڈاکٹر گولڈ شائن نے عربوں کا علاج کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ گیلیلی کی جنگ کے دوران تو اس نے اپنی فوج میں خدمات انجام دینے والے عربوں تک کا علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت کے اسرائیلی فوج کے چیف ربی جنرل گیڈ ناون نے مائر کاہان سے رابطہ کر کے کہا تھا کہ وہ گولڈ شائن کے رویے میں تبدیلی کی دعا کرے۔ تاہم کاہان نے اس وجہ سے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ یہ بات یہودیت کے خلاف ہوگی۔“ ہجوم اچانک نعرے لگانے لگا: ”صحافی مردہ باد۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو پتا چلا کہ میں سوگواروں کے ہجوم میں واحد صحافی تھا۔ میں تیران پولاک سے چمٹ گیا اور التجا کرنے لگا ”پلیز مجھے بچالو۔“ میں ڈر رہا تھا کہ ہجوم مجھے پہچان کر ہلاک ہی نہ کر ڈالے۔

گولڈ شائن کا جنازہ فلسطینیوں کی بستیوں سے ملٹری گارڈ لے کر گزر رہے تھے۔ یسڈر یشیوا نیر ملٹری انسٹی ٹیوشن کے ہال میں دوبارہ تقریریں کی گئیں۔ بے شمار مذہبی آبادکاروں کے علاوہ ربی ڈو ولیور نے بھی تقریر کی۔ اس نے کہا: ”گولڈ شائن انسانوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے خود کو دوسروں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔“ ہلاکا میں ”انسانوں“ اور ”دوسروں“ کی اصطلاح کا مطلب صرف یہودی ہوتا ہے۔ لیور نے کہا: ”گولڈ شائن ہم پر ان دنوں مسلط کی جارہی تحقیر اور ذلت کو برداشت نہیں کر پایا۔ اس نے صرف خدا کے مقدس نام کی عظمت کے لیے یہ عمل کیا تھا۔“

4 مارچ 1994ء کے ”یروشلم“ میں توبے ہاکاہ نے جنازے کے چند دن بعد گولڈ شائن کی ستائش میں کی گئی لیور کی ایک اور تقریر کا حوالہ دیا۔ اس نے لکھا کہ کئی سال پہلے اخبارات نے لیور کو اس کی ایک تجویز پر خوب لتاڑا تھا۔ اس نے تجویز دی تھی کہ زندہ عرب دہشت گردوں کے جسموں کو طبی تجربات کے لیے استعمال کیا جانا

چاہیے۔اس تجویز کی مخالفت میں ہونے والے شور شرابے کی وجہ سے اٹارنی جنرل نے لیور کو سپریم ربینیکل کونسل آف اسرائیل کے لیے منتخب نہیں کیا، بصورت دیگر اس کا انتخاب پکا تھا۔تاہم اٹارنی جنرل نے لیور کے جاری مذہبی کاموں میں کوئی مداخلت نہیں کی۔اخبارات نے رپورٹ دی کہ قتل عام کے ایک دن بعد ہی نہ صرف مذہبی بستیوں میں بلکہ بہت سے اسرائیلی شہروں میں بھی گولڈسٹائن کو سراہا گیا۔عبرانی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق گولڈسٹائن کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ عربوں کے مزید قتل عام کے بھی مطالبے کیے گئے۔

گولڈسٹائن کی ستائش کا سلسلہ مذہبی یہودی کمیونٹی کے علاوہ دوسرے حلقوں میں بھی پھیل گیا۔سیکولر اسرائیلی یہودیوں، بالخصوص نوجوانوں نے گولڈسٹائن اور اس کے اقدام کو سراہا۔ بالغوں کی نسبت اسرائیلی نوجوانوں کی اس اقدام پر خوشی کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ہم بالغ آبادی کے حوالے سے غور کریں گے کیونکہ یہ آبادی کئی حوالوں سے اہمیت رکھتی ہے۔ یورائیل کاتز نے 4 مارچ 1994ء کے ''یروشلم'' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ ''چند نفسیاتی مریضوں کے علاوہ باقی ساری قوم اور سیاستدانوں نے ڈاکٹر گولڈسٹائن کی مذمت کی ہے۔'' کاتز لکھتا ہے:

> ایک سروے کے مطابق کریت اربا کے تقریباً 50 فیصد باسیوں نے قتل عام کو درست قرار دیا۔ایک اور سروے میں ظاہر ہوا کہ اسرائیل کے 50 فیصد یہودی آبادکاروں سے قتل عام سے پہلے کی نسبت زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں۔

کاتز لکھتا ہے کہ سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس قتل عام کو اتفاقی واقعہ قرار دے کر اس پر رائے دینے سے انکار کر دیا۔اس نے لکھا:

> امیروں کے علاقوں کے علاوہ ہر جگہ کے لوگ اس قتل عام کے حوالے سے مسکرا مسکرا کر گفتگو کرتے پائے گئے۔ایک عوامی تبصرہ تھا: ''بے شک، گولڈسٹائن کو ملزم ٹھہرایا جانا چاہیے۔ وہ بآسانی فرار ہو کر چار دیگر مسجدوں میں ایسا ہی کر سکتا تھا۔تاہم اس نے نہیں کیا۔''

لوگوں کو دو زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے: ایسے لوگ جو اس قتل عام پر خوش تھے، اور ایسے لوگ جو خاموش رہے۔کاتز لکھتا ہے:

> لہٰذا یہ وقت موزوں ہے کہ ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ ہم یہودی جینٹائل سے زیادہ حساس اور رحمدل نہیں ہیں۔بیشتر یہودی بھی دنیا کی اکثر قوموں کی طرح نسل پرست ہیں۔ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ ترقی پسندانہ عقائد اور جمہوریت کے دعوؤں کے باوجود قدیم یہودی قبائلیت آج بھی موجود ہے۔جو لوگ یہودیوں کو دوسری اقوام کے لوگوں سے مختلف قرار دیتے ہیں، اب انہیں بہتر جان لینا چاہیے۔گولڈسٹائن کی بندوق سے نکلی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ ان کے لیے سبق سیکھنے کا ایک موقع ہے۔

اسرائیل میں بہت کم لوگوں نے کاتز کی آراء کو قبول کیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اسرائیلی یہودیوں نے کاتز کے الفاظ پر توجہ دی ہوتی تو یتزاک رابن کے قتل سے بچا جا سکتا تھا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ رابن کے قتل پر صدمے اور گولڈ سٹائن کے قتل عام پر صدمے کے نہ ہونے کا باعث یہ حقیقت ہے کہ گولڈ سٹائن کے شکار غیر یہودی تھے۔

کاتز کے علاوہ بہت سے دوسرے مبصروں نے اسرائیلی عبرانی اخبارات میں اسرائیلی یہودی آبادی کے اس حصے کو موضوع بنایا جنہیں اس قتل عام پر لوگوں کے خوشی منانے سے صدمہ پہنچا تھا اور جو اسرائیلی سیاستدانوں اور عوامی شخصیات کے رویے سے ڈسٹرب ہوئے تھے۔ انہوں نے گولڈ سٹائن کے پشت پناہوں کو ''نازی'' کہا۔ یہی لوگ، جنہیں صیہونی فاختاؤں کی بجائے اعتدال پسند شکرے کہا جا سکتا ہے، ایسی اصطلاحوں کے استعمال پر منفی ردعمل کا اظہار کرتے تھے۔ یہی ''اعتدال پسند شکرے'' ابوندال گروپ اور پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین کو نازی کہا کرتے تھے۔ انہوں نے ان افراد اور تنظیموں کے حوالے سے اپنے خیالات میں ترمیم نہیں کی بلکہ وہ صرف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عربوں کے ساتھ ساتھ کچھ یہودی افراد اور تنظیمیں بھی اس خطاب کی حقدار ہیں۔ مشہور صحافی ٹیڈی پروس نے 4 مارچ 1994ء کے ''داور'' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں ان خیالات کی عکاسی کی ہے:

> گولڈ سٹائن ہٹلر سے زیادہ بڑا قاتل یقیناً نہیں تھا۔ تاہم اس کے اور اس کے ساتھیوں کے بیانات ثابت کرتے ہیں کہ وہ موزوں موقع دستیاب ہونے پر کم از کم بیس لاکھ فلسطینیوں کو قتل کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان کے بے شمار بیانات سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ عربوں کو بیماریاں پھیلانے والے چوہوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ سوچ جرمنوں کی اس سوچ سے سو فیصد ملتی جلتی ہے جس کے مطابق وہ آریا نسل کو سب سے برتر تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ گندے یہودیوں کے ساتھ ربط ضبط سے یہ نسل ناپاک ہو سکتی ہے۔ کاہان، جس کو نیورمبرگ قوانین کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے، عربوں کے حوالے سے ایسے ہی خیالات رکھتا ہے۔

کاہان حقیقتاً غیر یہودیوں کے حوالے سے ایسے ہی خیالات رکھتا ہے۔ پروس کے علاوہ دیگر اسرائیلی مبصروں نے ایسے ہی نتائج اخذ کیے ہیں۔

محولہ بالا تنقید کے علاوہ اس قتل عام سے اسرائیلی یہودیوں کو پہنچنے والے نقصانات پر بہت زیادہ تبصرے کیے گئے۔ مثال کے طور پر 28 فروری 1994ء کے ''ہارتزا کنامک سپلیمنٹ'' کی شہ سرخی تھی: ''گولڈ سٹائن کے قتل عام سے تل ابیب سٹاک مارکیٹ میں زبردست مندا۔'' دوسرے اخباروں نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ کنیسٹ کی کمیٹی برائے خارجہ ودفاعی معاملات کے ایک اجلاس میں شمعون پیریز اور دوسرے سینئر فاختہ سیاستدانوں نے قتل عام پر تنقید کرتے ہوئے مخصوص سیاسی معذرت خواہانہ لب ولہجہ اپنایا۔ ذیل میں اس اجلاس کی

روداد درج کی جارہی ہے جس سے بیشتر اسرائیلی یہودیوں کی حقیقی آراء اور غیر یہودیوں کے قتل عام سے ان کی عمومی عدم دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔ 8 مارچ 1994ء کے ہارتز میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں اس اجلاس کا احوال درج کیا گیا ہے۔ پیریز نے فلسطینیوں کے قتل پر صدمے کا اظہار کرنے میں وقت بالکل ضائع نہیں کیا اور صرف یہ کہا کہ ''دنیا ان لاشوں کی تصویریں دیکھ کر اسرائیل کے بارے میں کیا کہے گی۔'' پیریز نے خوشیاں منانے اور فائرنگ کرنے والے مسلح مذہبی آبادکاروں کی مذمت نہیں کی، بلکہ اس نے ان کی تصویروں کی وجہ سے اسرائیل اور انہیں پہنچنے والے نقصان کی مذمت کی۔ پیریز نے کہا ''ہیبرون کے واقعے سے صدر مبارک اور شاہ حسین اور ان سے بھی بڑھ کر پی ایل او اور اس کی قیادت کے مفادات پر منفی اثر پڑے گا۔'' اس نے مزید کہا ''80 سال تک عربوں کی آبادی والے علاقوں میں یہودی کیوتزم رہے ہیں اور مجھے یاد نہیں ہے کہ اس طرح کا قتل عام کا کوئی ایک بھی واقعہ ہوا ہو۔'' اب بحث میں سینئر لیکوڈ سیاستدانوں نے مداخلت کی ''ہارتز'' میں شائع ہوا ہے:

> پیریز کی تقریر میں سب سے پہلے شیرون نے مداخلت کی۔ ''کیوتزم مجھے تم سے کم عزیز نہیں ہیں، تاہم ایسی کئی مثالیں ہیں کہ جب کسی نے کیوتز سے باہر جا کر عربوں کو قتل کیا۔'' پیریز نے جواب دیا: ''دو مثالیں کافی نہیں ہیں کیونکہ زیر بحث معاملے میں قاتل کو پیروکاروں کے ایک پورے گروپ کی حمایت حاصل تھی۔'' بنی بیجن بولا: ''تم ہمیشہ عمومی انداز میں بات کیوں کرتے ہو؟'' پیریز: ''میں تو نہیں کرتا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ امن کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے ہمیں پی ایل او کی ضرورت ہے۔'' شیرون: ''تمہارا مطلب ہے کہ ہم قاتل (عرفات) کی مدد کریں۔'' پیریز نے غصے سے میز تھپتھپاتے ہوئے کہا: ''اور مصریوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ جن سے خود لیکوڈ نے امن معاہدہ کیا تھا۔ کیا مصریوں نے یہودیوں کو قتل نہیں کیا تھا؟ جنگ اور دہشت گردی میں کیا فرق ہے؟ کیا ہمارے 16000 فوجیوں کی ہلاکت کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟ دنیا میں ہر کہیں قومیں دہشت گردوں کے ساتھ ڈیل کر رہی ہیں۔'' نیتن یاہو: ''اپنی تباہی کے درپے تنظیم سے ڈیل کرنے والی کوئی ریاست باقی نہیں رہتی۔ تم فلسطینی ریاست بنوانا چاہتے ہو۔'' پیریز: ''یہ تم اور تمہارے منصوبے ہیں جو فلسطینی ریاست کے قیام کا پیش خیمہ بنیں گے، کیونکہ تمہی نے، لیکوڈ نے میڈرڈ میں پی ایل او منائی تھی۔ تمہی نے خود مختاری کی بات سب سے پہلے کی تھی۔'' نیتن یاہو: ''خود مختاری اور ریاست مختلف چیزیں ہیں۔'' پیریز: ''شیرون نے کہا تھا کہ خود مختاری فلسطینی ریاست کے قیام کا لازمی سبب ہوگی.......... میں تم سے کم پختہ نہیں ہوں، اسی لیے میں نے اوسلو میں خود مختاری کی انتہائی محدود تعبیر پیش کی تھی۔ اسی لیے ہم بین الاقوامی مبصروں کے خلاف ہیں، ہم صرف پیسہ دینے والے ملکوں کے نمائندوں کی عارضی

موجودگی کے حامی ہیں۔"

محولہ بالا اقتباس سے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ اسرائیلی سیاست اور یہودی معاملات کو اصل ماخذوں کے ذریعے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

قتلِ عام کے فوری بعد ہی کچھ اسرائیلی گروپوں نے گولڈ سٹائن کو سینٹ (Saint) کا درجہ دے دیا تھا اور اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ شموئیل روزنر سے 28 فروری 1994ء کے ہارٹز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں فوج کے سابقہ چیف ربی اور اسرائیل کے چیف ربی گورن کے ایک خطاب کا حوالہ دیا ہے جو اس نے قتل عام کے بعد والے سبت کے دن کیا تھا۔ روزنر نے لکھا ہے: "گورن کا کہنا تھا کہ اگلی مرتبہ قتل عام کی منظوری لینا ضروری ہوگی۔ یہ منظوری موجودہ غیر قانونی حکومت نہیں بلکہ کیمونٹی کو دینا ہوگی۔" روزنر کہتا ہے کہ سامعین نے گورن کے خطاب کو پسند کیا تاہم وہ گولڈ سٹائن کی بجائے فوج کے ذریعے قتل عام کو ترجیح دیتے تھے۔

قتلِ عام کے بعد کے دنوں اور ہفتوں میں گولڈ سٹائن اور اس کے کارنامے کی ستائش کا دائرہ اسرائیل کی مذہبی کیمونٹی سے لے کر اس کے امریکی حامیوں تک وسیع ہو گیا۔ ابتدائی ستائش اس حوالے سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ مسیحا پرست کیمونٹی کے علاوہ کتنے یہودی ایسے ہیں جو یہودیوں کے ہاتھوں غیر یہودیوں کے قتل کو جائز قرار دینے والی آئیڈیالوجی سے متاثر ہیں۔ ایوی راما گولان 28 فروری 1994ء کے ہارٹز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں بتاتی ہے کہ قتل عام والے دن گولڈ سٹائن کی خبریں کس طرح ہیریڈی اکثریتی آبادی والے شہر بنی براک میں پھیل گئیں اور کس طرح ایک عوامی تفریحی تقریب میں مذہبی یہودیوں نے گولڈ سٹائن کی ستائش کی۔ قتل عام پیورم (Purim) کے موقع پر ہوا تھا۔ پیورم ایک تہوار ہے، جس کے دوران مذہبی یہودی خوشیاں مناتے اور خوب شراب پیتے ہیں۔ اس روز بنی براک کی گلیاں مست یہودیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ شہر کے میئر نے نظم وضبط اور شائستگی کو قائم رکھنے کے لیے اسرائیلی فوج کے ایلیٹ یونٹس پر مشتمل ایک خصوصی سکیورٹی فورس متعین کی ہوئی تھی۔ گولان گلیوں میں قتل عام کی خبریں پھیلنے کا اثر یوں بیان کرتی ہے:

> ایک سکیورٹی گارڈ نے، جس کی بیلٹ میں بھاری پستول لٹکا ہوا تھا، سر پر سیاہ ٹوپی تھی اور سینے پر "بنی براک سکیورٹی ٹیم" کا خصوصی بلا لگا ہوا تھا، چندہ جمع کرنے والے سٹال کو دیکھا۔ اسے سڑک کے پار اپنا ایک ساتھی نظر آیا۔ وہ بلند ترین آواز میں بولا "پیورم کا معجزہ! اس مقدس شخص نے کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایک حملے میں 52 عرب اڑا دیئے ہیں۔" تاہم چندہ اکٹھا کرنے والے دبلے پتلے یشیوا طالب علم کو یقین نہیں آیا۔ وہ بولا "یہ ناممکن ہے۔ یہ افواہ ہوگی۔" تاہم اردگرد موجود لوگوں نے خبر کی تصدیق کی۔ انہوں نے کہا: "ریڈیو پر خبر نشر ہوئی ہے۔" "کہاں؟" "ہبرون میں۔" یشیوا طالب علم کا رنگ زرد ہو گیا وہ بولا "مجھے عربوں کی پروا نہیں۔ قیمت تو ہمیں ادا کرنی ہوگی۔" سکیورٹی گارڈ چیخا: "کیا بات کرتے ہو۔ یہ پیورم کا معجزہ ہے۔ خدا نے مدد کی ہے۔"

سٹال کے اردگرد موجود لوگوں کے دو گروپ بن گئے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ خدا نے عربوں کو درست سزا دی تھی۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بالکل چپ تھے۔ چندہ مانگنے والا رسیدیں کاٹتا اور سر ہلاتا رہا۔ وہ بولا: "یہ سب جھوٹ ہے۔" ایک عورت نے کہا کہ اس کے گھر آنے والے لوگ صدمے کا شکار تھے۔ کسی نے پوچھا: "قتل پر؟" "سچ پوچھو تو قتل پر نہیں، بلکہ اس بات پر صدمے کا شکار تھے کہ اب یہودیوں کے ساتھ کیا بیتے گی۔"

گولان اگلی شام کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہے: "توقع تھی کہ اسرائیل کے سب سے بڑے سٹیڈیم یاد ایلیا ہوسٹیڈیم میں بے شمار مذہبی یہودی مشہور مذہبی جاز سنگر موڈیکائی بین ڈیوڈ کو سننے آئیں گے۔ قتل عام سے مہینوں پہلے رابن، پیریز اور دوسرے یہودی کافروں سے ارضِ اسرائیل کو بچانے کی نیت سے ایک مظاہرے کے طور پر اس شام کا پروگرام بنایا گیا تھا۔" ہجوم میں مذہبی کمیونٹی کے ہر حصے کے لوگ موجود تھے۔ گولان نے تفصیل اس شام کی یوں بیان کی ہے:

> شام کا پہلا حصہ چپ چاپ گزر گیا۔ درمیانی وقفے کے بعد، اس شام کے سٹار کے رونما ہونے سے چند منٹ پہلے، ہجوم ہیجان میں مبتلا ہو گیا۔ تقریب کے منتظم نے کریت اربا کے ایک باسی کو ہجوم سے خطاب کے لیے بلایا۔ اس نے کہا "نیک اور پاک ڈاکٹر گولڈ سٹائن ہمارے لیے ایک کارنامہ انجام دے کر شہید ہو گئے ہیں۔" مقرر نے لوگوں کو اس کا سوگ کرنے کا کہا۔ اکثر لوگ خاموش رہے۔ چند نے تالیاں بجائیں۔ سر پر ٹوپی رکھے ڈاڑھی والا ایک فرد کھڑا ہو گیا۔ اس نے چیخ کر کہا: "میں متفق نہیں ہوں۔ وہ ایک سفاک قاتل تھا!" لوگ اس پر فوراً ٹوٹ پڑے۔ بہت سے لوگوں نے چیخ کر کہا "اس کافر کو ٹھوکریں مار کر یہاں سے نکال دو۔" لوگوں کا غصہ صرف اس وقت ٹھنڈا ہوا جب بین ڈیوڈ سٹیج پر نمودار ہوا اور اس نے گانا شروع کیا۔ تقریب کے بعد باہر نکل کر کچھ لوگوں نے یاد کیا کہ اصل پیورم کے موقع پر سوسا کے یہودیوں نے 75000 جینٹائل کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ پاک وطن (Holy Land) میں اتنی تعداد میں جینٹائل کے قتل کا یہ موزوں وقت تھا۔

این آر پی فاختاؤں کے تقریباً کالعدم دھڑے کے ایک رکن ڈوو ہالورٹل نے گولان سے کہا: "پیورم کی یہ خوشی مذہبی صیہونیت کے اخلاقی زوال کی عکاس ہے...... اگر مذہبی صیہونیت نے اس وقت اصلاح نہ کی تو دوسرا موقعہ کبھی نہیں ملے گا۔"

بعد کے واقعات سے عیاں ہوا کہ نہ تو مذہبی صیہونیت پرستوں اور نہ یہودی مذہبی کمیونٹی کے دوسرے دھڑوں نے اصلاح کی۔ اس کے برعکس گولڈ سٹائن کی ستائش کی گئی اور یہ احساس بڑھا کہ ارضِ اسرائیل میں رہنے

والے جینائل کو قتل کرنا یہودیوں کا حق اور فریضہ ہے۔ ٹاڈ وشر گائی نے 23 مارچ 1994ء کے ہارتز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں این آر پی سے منسلک نوجوانوں کی بڑی تحریک بنی اکیوا کی تمام اسرائیلی شاخوں کے ایک وفد کے عرب علاقوں میں کرفیو کے دوران ہبرون اور کریت اربا کے دورے پر بحث کی۔ اس دورے کا مقصد ''یہودی آباد کاروں کا حوصلہ بڑھانا تھا۔'' شرگائی کے مطابق آباد کاروں کے ایک لیڈر ربی لائبووٹز نے ''چہرے سے صاف جھلکتے ہوئے اطمینان کے ساتھ وفد سے پوچھا: ''کیا تم نے مقدس ربی ڈاکٹر گولڈ سٹائن کے مزار کی زیارت کر لی ہے؟'' وفد کے اراکین نے انکار کر دیا تاہم نئے سینٹ کے پرستار کی مذمت نہیں کی۔ تب بنی اکیوا کی مقامی شاخ سے تعلق رکھنے والے ان کے ساتھی ان سے الجھ پڑے اور بولے کہ گولڈ سٹائن کو خراج عقیدت پیش نہ کر کے انہوں نے لیفٹ کی مدد کی ہے۔ مقامی یسوڈر یشیوا کے سینئر استاد اور یوں ایک سرکاری ملازم ربی شمعون بن زائیون نے گولڈ سٹائن کی ستائش میں تقریر کی اور اس کے اقدام کو سراہا۔ اس نے کہا: ''اگر حکومت عربوں کے سامنے جھکی رہے تو ہم سب قاتل ہیں۔ اگر یہودی ارضِ اسرائیل پر مضبوط حکومت قائم نہیں کرتے تو یہاں مزید گولڈ سٹائن رونما ہوں گے۔'' دورہ کرنے والوں میں سے بیشتر نے جوابی دلائل دیئے۔ تاہم وہ اپنے میزبانوں کو قائل نہیں کر سکے۔ ان کا ایقان تھا کہ ہبرون کے آباد کاروں کی مدد کرنا گولڈ سٹائن کے سینٹ ہونے کے چھوٹے سے معاملے سے زیادہ اہم تھا۔

16 مارچ 1994ء کے ''یدیوت اہرونوٹ'' میں گیبی بیرون نے لکھا:

> کل یروشلم میں بنیانے ہاؤ ماہ ہال میں استادوں کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نائب وزیر تعلیم میخا گولڈ مین پر حملہ کیا گیا۔ اس نے خود کو زخمی ہونے سے بچا لیا۔ اس کی تقریر نے مذہبی استادوں کو مشتعل کر دیا تھا کیونکہ اس نے کریت اربا کے دورے کے دوران قتل عام کے حوالے سے مذہبی سکول کے بچوں کے جوش پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔ ہال میں تو فساد مچ گیا۔ درجنوں مذہبی استاد سٹیج پر چڑھ دوڑے۔ ایک خاتون ٹیچر تو مقرر والی میز پر رکھا گلدان اٹھا کر اسے مارنے لگی تھی، تاہم عین آخری لمحے میں اسے ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ تمام مذہبی اساتذہ سٹیج کے سامنے اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے نائب وزیر تعلیم کے خلاف ''فاشسٹ، فاشسٹ'' کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ گولڈ اپنی تقریر جاری رکھنے پر مصر تھا۔ جب اس نے تقریر ختم کی تو اسے زبردست حفاظت میں عمارت سے لے جایا گیا، جس کی وجہ سے تعاقب کرنے والے مشتعل اساتذہ اسے کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔

نہ تو وزیر تعلیم ایمنن روبنسٹائن اور نہ ہی وزیر اعظم رابن نے اس واقعے پر مذمت کا ایک لفظ بھی ادا کیا۔

5 اپریل 1994ء کو اسرائیلی ریڈیو نے خبر نشر کی کہ ربی شمعون بن زائیون نے کریت اربا اور ہبرون

کے آبادکاروں میں ایک اشتہار تقسیم کیا جس میں ''سینٹ باروک گولڈ سٹائن'' کے بارے میں ایک کتاب شائع کرنے والے کے لیے مالی امداد مانگی گئی تھی۔ 6 اپریل کو یدیوت اہرونوث نے اس اشتہار کا متن شائع کیا۔ اس میں گولڈسٹائن کو ایک اعلیٰ مذہبی شخصیت قرار دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا ''خدا اس کے خون کا انتقام لے گا۔'' بین زائیون کی پشت پناہی کریت اربا میونسپل کونسل کر رہی تھی۔ ایمنن بارزیلے نے 5 اپریل 1994ء کے ہارٹز میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا کہ دو دن پہلے میئر بنی کیٹزوور سمیت دو گش ایمونم لیڈروں نے وزیراعظم رابن سے ملاقات کی۔ رابن نے ان کے خلاف اپنی سابقہ سخت باتوں کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ کبھی انہیں نہیں دہرائے گا۔ (اس نے سخت باتیں صرف اسرائیلی ''فاختاؤں'' عرفات اور مغربی میڈیا کو سنانے کے لیے کی تھیں) انہوں نے مستقبل میں باہمی تعاون کا عہد کیا۔ لہٰذا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ رابن نے ربی بین زائیون کے خیال کی مذمت کیوں نہیں کی۔ ایک سال بعد کریت اربا میونسپلٹی کو مقبوضہ علاقوں کی سول ایڈمنسٹریشن کی طرف سے اجازت مل گئی کہ وہ گولڈسٹائن کی قبر کے گرد عالیشان عمارت تعمیر کرے۔ گولڈسٹائن کی قبر پہلے ہی زیارت گاہ بن چکی تھی۔ اسرائیل کے تمام شہروں سے، حتیٰ کہ امریکہ اور فرانس سے بھی یہودی آ کر اس کی قبر پر شمعیں جلاتے اور اب خدا کے نزدیک جنت کے ایک خصوصی حصے میں مقیم ''مقدس ولی اور شہید'' کے لیے عبادت کرتے۔ وہ وہاں بیماریوں سے نجات اور بیٹے کے حصول کے لیے دعائیں بھی مانگتے۔ یہ زائرین گولڈسٹائن کے ساتھیوں کے لیے چندہ بھی دیتے۔ کسی آرتھوڈوکس ربی نے اس امر پر تنقید نہیں کی۔

سیکولر یہودی نئے سینٹ کی پرستش کی روز بروز زیادہ سے زیادہ مخالفت کرنے لگے۔ (ہیبرون میں رہنے والے فلسطینیوں کی گولڈسٹائن کی پرستش اور اس بڑے قاتل کی یادگار تعمیر کرنے کی مخالفت اس کتاب کے دائرے سے باہر ہے۔ تاہم واضح ہونی چاہیے) آخر کار پریس میں طویل مہم کے بعد مئی 1998ء میں کنیسٹ کے اراکین نے ایک قانون منظور کیا، جس کے تحت قاتلوں کی یادگاریں تعمیر کرنے پر ممانعت عائد کر دی گئی تھی اور موجود یادگاروں کو ڈھانے کا کہا گیا تھا۔ اسرائیلی فوج کو چاہیے تھا کہ کنیسٹ میں قانون کی منظوری کے فوری بعد یادگار کو توڑ دیا جاتا، لیکن اس کی بجائے فوج کے ترجمان نے کہا کہ گولڈسٹائن کی یادگار کے حوالے سے گولڈسٹائن کے خاندان اور مقامی ربیوں کے ساتھ مذاکرات جاری ہیں۔

Blessed the Male کے عنوان سے گولڈسٹائن کی ستائش میں لکھی گئی کتاب 1995ء میں شائع اور اس کے متعدد ایڈیشن فروخت ہوئے۔ اس کتاب کے بیشتر قاری مذہبی لوگ تھے۔ اس کتاب میں گولڈسٹائن کی تعریفیں کی گئی تھیں اور غیر یہودیوں کو قتل کرنے کے ہر یہودی کے حق میں ہلاکائی جواز پیش کیے گئے تھے۔ اس وقت ''کیور یوسف'' (مزارِ یوسفؑ) کے نگران ربی یتزاک گنسبرگ نے اس کتاب کا ایک باب لکھا تھا۔ ربی گنسبرگ کے خیالات کا نچوڑ باب نمبر 4 میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ربی گنسبرگ کی آئیڈیالوجی اور اس جیسی دوسری آئیڈیالوجیاں (Ideologies)، خواہ ان کو کتنے ہی محتاط انداز میں پیش کیا گیا ہو، گولڈسٹائن والے قتلِ عام، گولڈ سٹائن اور بعدازاں اس کے پیروکاروں کو مذہبی یہودیوں سے حاصل ہونے والی قابلِ لحاظ حمایت و تائید اور اس،

جرم کے حوالے سے اسرائیلی حکومت کے ابہام آمیز رویے کی وضاحت کرتی ہیں۔ ہٹلر کے اقتدار میں آنے سے پہلے جو جرمن خاموش رہے اور انہوں نے نازی آئیڈیالوجی کی مذمت نہیں کی تھی، وہ بھی بعد میں رونما ہونے والے ہولناک نتائج کے ذمہ دار تھے، کم از کم اخلاقی مفہوم میں۔ بالکل اسی طرح جو لوگ، بالخصوص یہودی، خاموش ہیں اور گولڈ ہٹائن اور کنسبرگ جیسے لوگوں کے نظریات سے عیاں ہونے والے یہودی نازی ازم کی مذمت نہیں کر رہے وہ اپنی خاموشی کے نتیجے میں رونما ہو سکنے والے ہولناک نتائج کے ذمہ دار ہوں گے۔



ساتواں باب

رابن کے قتل کا مذہبی پس منظر

وزیر اعظم ہتزاک رابن کو مذہبی وجوہات کے تحت قتل کیا گیا تھا۔ قاتل اور اس کے ہمدردوں کو یقین تھا اور اب بھی ہے کہ رابن کا قتل یہودیت کے احکامات کی رو سے درست تھا اور خدا کی ہدایت پر کیا گیا تھا۔ عبرانی اخبارات میں مذہبی علاقوں اور خاص طور پر مذہبی بستیوں کے لوگوں کے حوالے سے سروے رپورٹیں شائع ہوئی ہیں، جو کہ قاتل سے زبردست ہمدردی رکھتے تھے۔ یہودی ریاست کے وزیر اعظم کے قتل کے حوالے سے اس کی حمایت اور مخالفت کرنے والے دھڑے قتل کے وقت ہی ابھر آئے تھے۔ بہت سے اسرائیلی یہودی، اسرائیل سے باہر آباد اکثر یہودی اور بیشتر غیر یہودی لوگ یہودی تاریخ اور مذہب کے بارے میں ناکافی علم کی وجہ سے اس قسم کے قتل کو درست تناظر میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس باب میں ہم کوشش کریں گے کہ رابن کے قتل کو سمجھنے کے لیے ضروری تاریخی مذہبی پس منظر کو واضح کریں۔

یہودی تاریخ مذہبی خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سے بھری پڑی ہے۔ ان میں ایسی خانہ جنگیاں بھی شامل ہیں، جن کے دوران ہولناک قتل و غارت ہوئی۔ رومنوں کے خلاف یہودیوں کی عظیم بغاوت (66ء—73ء) اس کی ایک مثال ہے، جس کی انتہا پر سیکنڈ ٹیمپل کو تباہ کر دیا گیا تھا اور یہودیوں نے مسادا میں اجتماعی خودکشی کی تھی۔ آج کل مسادا کی زیارت کو جانے والے یہودیوں کو علم نہیں ہے کہ مسادا کے محافظ سکارکین (Sikarikin) کہلاتے تھے۔ یہ نام ایک خنجر کے نام سے اخذ کیا گیا ہے، جسے اس گروپ کے لوگ اپنے لبادوں میں چھپا کر رکھتے تھے اور ہجوم میں اپنے مخالف یہودیوں کو قتل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ تالمود میں یہ لفظ دہشت گردوں یا لٹیروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اس کا اطلاق صرف یہودیوں پر ہوتا ہے۔ تالمود یا یہودیوں کی محفوظ کردہ کسی بھی روایتی تحریر میں مسادا یا اس گروپ کا ذکر موجود نہیں ہے۔ درحقیقت سکارکین دور حاضر کے

دہشت گردوں کا قدیم یہودی مترادف تھے۔ ان کی خود کش کارروائی خود کش بمباروں کے دہشت گردانہ رویے سے مماثل ہے، جس کو ریاستِ اسرائیل میں کراہت سے دیکھا جاتا ہے۔ مسادا جانے والے سکارکین رومنوں سے بچ کر نہیں بھاگے تھے بلکہ اپنے یہودی بھائیوں کی وجہ سے فرار ہوئے تھے۔ رومنوں کے خلاف بغاوت چھڑنے کے بعد یروشلم کی طرف بڑھنے والی رومن فوج کی پیش قدمی ابتداً رک گئی اور وہ پسپا ہو گئی۔ سکارکین نے اپنے لیڈر مینا ہیم کو زبردستی بادشاہ بنانے کی کوشش کی۔ یروشلم کے یہودیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ٹیمپل کے اندر مینا ہیم سمیت بیشتر سکارکین کو قتل کر دیا۔ باقی بچنے والے سکارکین مسادا کو فرار ہو گئے، جہاں وہ بغاوت کے دوران مقیم رہے۔ انہوں نے رومنوں سے لڑائی نہیں کی بلکہ اس کی بجائے قریبی یہودی بستیوں کو لوٹ لیا۔ سکارکین کی شکست کے تین سال بعد ٹائٹس کی قیادت میں رومن فوج آخری حملے کے لیے یروشلم پہنچ گئی۔ (ٹائٹس کا چیف آف سٹاف ٹائبیریئس جولیئس الیگزینڈر ایک یہودی اور عظیم فلسفی فیلو Philo کا بھانجا تھا)۔ یروشلم تین حصوں میں منقسم تھا۔ ہر حصے کا لیڈر الگ تھا۔ وہ تینوں دو سال سے آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ اس دور کی رومن سلطنت کو خانہ جنگی کی فکر لاحق تھی۔ ایک لیڈر ایلیازر دی پریسٹ ٹیمپل پر قابض تھا اور اسے اپنے جنگی مرکز کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ 70ء کو پاس اوور کی شام ایک اور باغی لیڈر گش ہالاو کے یوحانان نے ایلیازر پر غلبہ پانے کے لیے زبردست حکمت عملی سے کام لیا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو نیک زائرین کا سا لباس پہنا دیا، جو بظاہر ایسے لگتے تھے جیسے پاس اوور کی قربانی کے لیے ٹیمپل آ رہے ہوں۔ انہیں تلاشی لیے بغیر ٹیمپل میں آنے دیا گیا۔ جب انہوں نے بھانپ لیا کہ ایلیازر اور اس کے آدمی اس مقدس جگہ پر ہتھیاروں کے بغیر موجود ہیں تو انہوں نے اپنی تلواریں نکالیں اور اپنے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مسادا کے مشہور دہشت گرد یہودی اور اسرائیلی قومی ہیرو بن گئے، جیسا کہ سکارکین کو قتل کرنے والے یروشلم کے یہودی ہیرو بن گئے تھے۔ گش ہالاو کا یوحانان بھی قومی ہیرو بن گیا، تاہم ایلیازر دی پریسٹ کو مکمل طور پر فراموش کر دیا گیا، شاید اس وجہ سے کہ اسے یہودیوں نے قتل کیا تھا۔ یہودی تاریخ کی ان اور ان جیسی دوسری قتل و غارت گریوں کو خدا کی عظیم ترین شان کے لیے کیا گیا تھا۔ یگال امیر...... رابن کے قاتل...... نے یہی تو کہا تھا۔

یہودیوں کا آپسی خون خرابہ یہودی آزادی کے سلب ہونے اور یہودی بغاوتوں کے رک جانے پر بھی ختم نہیں ہوا (آخری یہودی بغاوت 614ء میں ہوئی تھی)۔ ازمنۂ وسطیٰ سے لے کر جدید ریاست کے ظہور تک یہودی زیادہ تر خود مختار ہی رہے۔ ان کی کمیونٹیوں کے سربراہ ربی ہوتے تھے، جو اکثر اوقات یہودیوں کو بے رحمی کے ساتھ سزائیں دیا کرتے تھے۔ وہ گناہ گار یہودیوں کو سزائیں دیتے تھے۔ وہ ایسے یہودیوں کو زیادہ سخت سزائیں دیتے تھے جو غیر یہودیوں کے لیے دوسرے یہودیوں کی مخبری کرتے تھے یا کسی دوسرے طریقے سے یہودی مفادات کو نقصان پہنچاتے تھے۔ ربی عموماً یہودیوں کے یہودیوں پر تشدد کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے،

خصوصاً عورتوں پر ہونے والے تشدد کو، تاوقتیکہ یہودی مذہب اور ان کے اپنے مفادات کو گزند نہ پہنچے۔ یہودی تاریخ کے اس پہلو کا رابن کے قتل سے تعلق صاف ظاہر ہے۔ رابن کا قاتل یگال امیر تالمود کا سکالر ہے۔ اس نے ایک یشیوا میں تعلیم پائی تھی، جہاں طلباء میں یہ یقین راسخ کیا جاتا ہے کہ طویل عرصے سے جاری ربیوں کا تشدد خدا کے احکام کی تعمیل ہے۔ رابن کے قتل سے بہت مدتیں پہلے عبرانی زبان میں لکھے گئے یہودی تاریخ کے عالمانہ تجزیوں میں مذکورہ بالا تشدد کو بھی ریکارڈ پر لایا جا چکا ہے۔ رابن کے قتل نے عوام میں اس موضوع سے اتنی زیادہ دلچسپی پیدا کر دی کہ عبرانی اخبارات نے لاتعداد مضامین شائع کیے نیز ممتاز اسرائیلی سکالرز کے انٹرویو بھی شائع کیے گئے۔ رامی روزن کا 15 نومبر 1996ء کے "ہارٹز میگزین" میں شائع ہونے والا مضمون، جس کا عنوان "تردید کی تاریخ" تھا، ایک عمدہ مثال ہے۔ اگرچہ روزن نے متعدد ممتاز مورخوں سے بھی معلومات حاصل کی تھیں تاہم اس نے بنیادی طور پر پروفیسر یسرائیل برٹل کے تصورات سے استفادہ کیا تھا، جو کہ یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی میں شعبۂ یہودی تاریخ کا سربراہ ہے۔ برٹل کہتا ہے:

> صیہونیت نے وطن سے دور رہنے والے یہودیوں کو کمزور اور تشدد سے نفرت کرنے والے لوگ بیان کیا تھا۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ آرتھوڈوکس یہودی بھی ایسا ہی کہتے ہیں۔ وہ ماضی کے یہودی معاشرے کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اس میں ہلاکا اور مذہبی احکامات کی تعمیل کے علاوہ کسی شے میں دلچسپی نہیں لی جاتی تھی۔ تاہم مشرقی یورپ میں تخلیق ہونے والا سارا یہودی ادب ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انیسویں صدی میں بھی یہودیوں کی تاریخ خونریز جنگوں سے بھری پڑی ہے، جو کہ اکثر سینا گوگوں میں چھڑتی تھیں۔ یہودی گلیوں میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے، ایک دوسرے پر تھوکتے اور داڑھیاں نوچتے تھے۔ اس عرصے میں بے شمار قتل ہوئے۔

روزن مختلف سکالروں کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اکثر قتل مذہبی وجوہات کے تحت ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے آخری ربع تک ایسا ہوتا تھا کہ ہسیڈی یہودی معمولی سی بھی مذہبی اصلاح کرنے والے یہودیوں پر حملے کرتے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ مختلف ہسیڈی ربیوں میں اثر و رسوخ، دولت اور عزت کے لیے کھینچا تانی رہتی تھی، جس کے نتیجے میں عام ہسیڈی یہودی بھی آپس میں لڑائی جھگڑوں میں معروف رہتے تھے۔ مؤقر اسرائیلی سکالروں کی آراء سے آگاہ ہونے کے بعد روزن نے دریافت کیا:

> کیا یگال امیر، باروک گولڈ شائن، یوناہ اور وشمی (جس نے امن خواہوں کے ایک جلوس پر دستی بم پھینک کر ایک فرد کو ہلاک اور بہت سوں کو زخمی کر دیا تھا) اور ایمی پوپر (جس

نے سات معصوم فلسطینی محنت کشوں کو قتل کر دیا تھا اور جسے انتہا پسندوں نے ہیرو کا درجہ دے دیا تھا) یہودی روایت کے حصے ہیں؟ کیا ایسا صرف اتفاقاً ہوا تھا کہ باروک گولڈ سٹائن نے پیورم کے موقعہ پر قتل عام کیا؟

روزن اپنے سوال کا جواب خود دیتے ہوئے لکھتا ہے:

گزشتہ 1500 سال کی یہودی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ تصویر اس سے مختلف ہے، جو پہلے ہمیں دکھائی گئی ہے۔ یہودیوں نے پیورم کے موقعہ پر حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کی نقل اتارتے ہوئے بے شمار عیسائیوں کو قتل کیا ہے۔ یہودی گھرانوں میں سفاکانہ قتل کی وارداتیں ہو چکی ہیں، مخبروں پر خفیہ مذہبی عدالتوں میں مذہبی وجوہات کے تحت مقدمے چلائے گئے ہیں، ان خفیہ عدالتوں کی سزاؤں پر عمل درآمد خفیہ جلاد کیا کرتے تھے۔ زنا کار عورتوں کو ربیوں کے حکم پر سینا گوگ میں قتل کر دیا جاتا تھا اور یا ان کی ناکیں کاٹ دی جاتی تھیں۔

روزن نے عیسائیوں کے قتلِ عام اور پیورم کے دن حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کی نقالی کی متعدد مثالیں درج کی ہیں۔ ان واقعات میں سے بیشتر یا تو قدیم زمانے میں ہوئے یا ازمنۂ وسطیٰ میں۔ (سولھویں صدی میں پولینڈ میں اکادکا واقعات رونما ہوئے)۔

گیارہویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک اشکینازی یہودی مشرقی یہودیوں سے زیادہ تشدد پسند اور جنونی تھے۔ مسلم اور عیسائی دونوں ادوارِ حکومت میں سپین کے یہودیوں کی جنونیت پسندی غیر معمولی رہی۔ یہودی مورخین آج تک اس فرق کی وجوہات کا تعین نہیں کر سکے۔ شاید ایک وجہ یہودیوں پر عیسائی جنونیت پسندی کا اثر ہو۔ سپین میں رہنے والے یہودی شاید اس حقیقت سے متاثر رہے ہوں کہ مسلم سپین باقی مسلم دنیا سے زیادہ جنونیت پسند تھا۔

صدیوں تک عورتوں پر ہونے والے تشدد اور داخلی تشدد کے دوسرے پہلوؤں نے روایتی یہودی معاشرے کے ارتقاپذیر کردار پر اثر ڈالا۔ اس کردار نے رابن کے قتل کے لیے فریم ورک متعین کیا تھا۔ اس کردار کی تفہیم کے لیے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ ربی سمہا آصف (Rabbi Simha Asaf) کی کتاب The Punishments After the Talmud was Finalized: Materials for the History of Hebrew Law (Jerusalem, 1992) سرچشمۂ معلومات ہے۔ ربی آصف عبرانی یونیورسٹی میں پروفیسر رہا اور 1948ء میں اسرائیلی سپریم کورٹ کے ججوں میں سے ایک بنا۔ وہ ایک ممتاز سکالر اور مذہبی یہودی ہے۔ اس نے اس یقین کے ساتھ کہ یہودی ریاست قائم ہو گی اپنی کتاب میں لکھا کہ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں

کہ یہودی مذہبی عدالتوں نے لوگوں کو سزائیں دی۔

عورتوں پر تشدد بیشتر یہودی کمیونٹیوں میں صدیوں جاری رہا گو کہ اس کے حوالے سے ہلاکائی تعبیروں میں اور عملی طور پر کافی اختلافات موجود تھے۔ کچھ ربیوں نے شوہروں کو اجازت دی کہ وہ نافرمان بیویوں کو مار پیٹ سکتے ہیں۔ کچھ ربیوں نے اس "حق" کو یوں محدود کیا کہ شوہر بیوی کو پیٹنے سے پہلے مذہبی عدالت کے سامنے شکایت پیش کرے گا اور عدالت اس پر غور کرنے کے بعد تشدد کا حکم دے گی۔ شاید یہ شوہر کے اسی حق کی توسیع تھی کہ سپین کی یہودی عدالتوں نے زانی یہودی عورتوں اور طوائفوں کو سخت ترین سزائیں دی تھیں جبکہ زناکار مردوں کو ہلکی سزائیں دی جاتی تھیں۔ چودھویں صدی کے اوائل میں ایک مقامی معزز یہودی نے مشہور ہسپانی ربی راہنیو آشر[1] سے پوچھا کہ کیا ایک مسلمان کی حاملہ کردہ یہودی بیوہ کی ناک کاٹنا درست ہے؟ اس معزز یہودی نے یہ بھی کہا کہ شواہد ناکافی ہیں، تاہم حمل کے بارے میں سارے شہر کو پتا ہے۔ راہنیو آشر نے جواب دیا؟ "تم نے درست فیصلہ کیا ہے کہ اس کی ناک کاٹ دی گئی تو وہ زناکاروں کو بدصورت لگے گی، تاہم یہ کام اتنی تیزی سے کرنا کہ وہ ناک کاٹے جانے سے پہلے کافر نہ ہو جائے۔" (آصف، صفحہ 69) ایک دوسرے معاملے میں، جس میں ایک یہودی نے ایک مسلم عورت کے ساتھ زنا کیا تھا، راہنیو آشر کے بیٹے ربی یہودا نے صرف سیناگوگ میں داخلہ بند کرنے یا قید کی سزا دی تھی۔ (آصف، صفحہ 78) کسی یہودی کی مسلم کنیز کے ساتھ زنا کرنے والے دوسرے یہودیوں کے لیے بھی یہی سزا متعین کی گئی ہے۔ ربی یہودی عورتوں اور مردوں کی باہمی زناکاری کو کم سنگین تصور کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک معاملے میں ایک ربی نے حکم دیا تھا کہ عورت کے بال مونڈ دیئے جائیں اور سیناگوگ میں اس کا داخلہ بند کر دیا جائے (آصف، صفحہ 87) یروشلم کے سفرڈی یہودی انیسویں صدی تک جنسی گناہوں کی مرتکب عورتوں کے بال مونڈ دیا کرتے تھے۔ تاریخ میں ایسے مقدمے بھی موجود ہیں جن میں صرف اس وجہ سے عورتوں کو سزائیں دی گئیں کہ ان کے جنسی گناہوں کی وجہ سے بارشیں نہیں ہو رہیں۔ ربیوں کا خیال تھا کہ اگر گناہگار یہودی عورتوں کو سزا دے دی گئی تو بارش ہو جائے گی۔ اس زمانے کے روشن خیال عبرانی اخبارات بتاتے ہیں کہ عورتوں کو سزائیں دینے کے باوجود بارش نہیں ہوئی تھی۔ تاہم سپین اور پرتگال جیسے نسبتاً جدید رویوں والے ملکوں میں آباد یہودی ان پرانی روایات سے کچھ ہٹ گئے تھے۔ آصف لکھتا ہے کہ سترہویں صدی کے اواخر میں پرتگال میں یہودی کمیونٹی کے بزرگوں نے غیر یہودی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھنے والے یہودیوں کو سزائیں نہیں دیں۔ آصف اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ "ایسے ہر مقدمے میں انہیں ٹاؤن جج سے اجازت لازماً حاصل کرنی ہوتی تھی۔" (صفحہ 95) آصف لکھتا ہے کہ یہودی کمیونٹی صرف مذہبی پابندیاں عائد کر سکتی تھی۔ مثال کے طور پر انہوں نے دو بھائیوں کو کہا کہ جب تک وہ اپنے بدنام نوکر کو اپنے گھر سے نکال نہیں دیں گے، سیناگوگ میں داخل نہیں ہو سکیں گے (صفحہ 97) یورپ کے کچھ مشرقی حصوں میں یہودی ربی کچھ زیادہ سخت

سزائیں دے سکتے تھے۔ تاہم یہ سزائیں سپین میں دی جانے والی سزاؤں سے کم سخت ہوتی تھیں۔ 1612ء میں پراگ میں یہودی کمیونٹی کے سربراہ نے فیصلہ کیا کہ تمام یہودی طوائفیں ایک خاص تاریخ تک شہر سے نکل جائیں ورنہ اس تاریخ کے بعد انہیں گرم لوہے سے داغ دیا جائے گا۔ (آ صف، صفحہ 114) طوائفوں کا جرم یہ تھا کہ انہیں کمیونٹی کے کچھ نامعلوم معززین کے ساتھ شراب پیتے ہوئے دیکھا گیا تھا، جو کہ یہودی مذہب میں کوشر نہیں ہے۔ اٹلی کی یہودی کمیونٹیاں سب سے زیادہ اعتدال پسند تھیں، جنہوں نے آصف کے بقول طوائفوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی کیونکہ وہ ''کنواروں اور احمقوں کو زنا کے بدترین گناہ یا غیر یہودی عورتوں کے ساتھ میل جول سے بچا لیتی ہیں۔''

روزن نے اپنے مضمون میں نئے یہودی مورخوں کی تحقیق کا حوالہ دیا کہ اٹلی کے یہودی نشاۃ ثانیہ کے زمانے کی اس رسم پر عمل کرتے تھے کہ ایک شوہر یا بھائی بدکاری کی مرتکب اپنی بیوی یا بہن کو قتل کر سکتا ہے۔ بیوی کی بدکاری کے باعث بے عزت ہو جانے والے شوہر بعض اوقات اپنی بیویوں کو عبادت کے دوران سینا گوگ میں قتل کر دیتے تھے، تا کہ اس کی مشہوری ہو اور ان پر لگا ہوا بدنامی کا داغ دھل جائے۔ مثال کے طور پر سپولیٹو کے ایک یہودی اوبدیا نے سینا گوگ میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ جب اس نے وجہ بتائی تو اسے سزا نہیں دی گئی۔ اطالوی حکام نے تو اس پر مقدمہ چلا کر جرمانے کی سزا دی تھی، تاہم یہودیوں کو یقین تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے ایک یہودی عورت کے ساتھ شادی کر لی۔ بعض دوسری مثالوں میں بھائیوں نے اپنی مشکوک بہنوں کو قتل کر دیا۔ روزن سولھویں صدی کے وسط کا فیرارا کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ قاتل بھائی ایک مذہبی ادارے سے منسلک خیراتی تنظیم میں کام کرتا تھا۔ قتل کرنے کے باوجود اس کی ملازمت برقرار رہی۔ روزن لکھتا ہے کہ ایسے معاملات میں ربیوں نے عموماً کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

جدید قومی ریاست کے ظہور سے پہلے یہودی خودمختاری نے ربیوں کو وسیع تعزیری اختیارات دے دیے تھے، جن میں سے عورتوں پر تشدد صرف ایک زمرہ تھا۔ ربی مذہبی یا دوسرے گناہوں کا ارتکاب کرنے والے یہودیوں کو مختلف قسم کی پُرتشدد سزائیں دیتے تھے۔ یہودی بنیاد پرست، جو الزام دیتے ہیں کہ جدید اثرات نے یہودیوں کو خراب کر دیا ہے، ماضی کی صورت حال کا احیا چاہتے ہیں اور تشدد پر زور دیتے ہیں۔ ہلاکا میں تشدد کی مرکزیت نے آرتھوڈوکس یہودیت کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک طرف تو قانون کا نارمل نظام تھا اور دوسری طرف ہنگامی حالتوں کے لیے ایک زیادہ فوری قانونی نظام تھا۔ ایسی ہنگامی حالتیں بیشتر اوقات تبھی رونما ہوتیں جب ربیوں کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہوتے تھے۔

ربی یہ کہتے ہوئے نارمل قانونی نظام کو معطل کر دیتے کہ کفر انتہائی خطرناک درجے تک پہنچ گیا ہے۔ پھر وہ خدا کے غیض وغضب سے بچنے کے لیے ہنگامی قوانین استعمال کرتے تھے۔ موت کی سزا دیے

جانے کا ایک واقعہ ہمارے تجزیئے سے تعلق رکھتا ہے۔نارمل قانونی نظام میں کسی یہودی کو سزائے موت کا دیا جانا تقریباً ناممکن ہے جبکہ کسی غیر یہودی کو موت کی سزا دینا بہت آسان ہے۔حد تو یہ ہے کہ یہودیوں کو کم سخت سزا دینا بھی مشکل ہے، مثلاً تیس کوڑے مارنا۔کسی یہودی کے یہودی قاتل کی سزا تالمود کے مطابق یہی ہے کہ قاتل کو مزید کوئی سزا دیئے بغیر آزاد کردیا جائے۔تالمود ایک متبادل پیش کرتی ہے۔ابن میمون نے اپنی کتاب Laws of the Murderer and of Taking Precautions کے باب نمبر 4' قانون نمبر 8 میں لکھا ہے کہ ربیوں کی عدالت سے سزائے موت پانے والے یہودیوں کو "ایک کوٹھڑی میں بند کر کے بہت تھوڑی روٹی اور پانی دیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد جب ان کی آنتیں سوکھ جائیں، تب انھیں جو کھلائے جائیں تاکہ بیماری سے ان کے پیٹ پھٹ جائیں۔"

جج ربیوں کو سزائیں دینے میں اس وقت دشواری ہوئی جب سیکولر حکام نے یہودی خودمختاری کو محدود کردیا۔صرف وہی جج ربی، جن کا تقرر "ہاتھ پھیلانا" *2 کہلاتا تھا، 39 کوڑوں تک کی سزا دے سکتے تھے۔ بعدازاں ربیوں نے سزا دینے کا ایک زیادہ فوری طریقہ ڈھونڈ نکالا۔اس طریقے کو ہر ربی استعمال کرسکتا تھا اور اس میں زیادہ سخت سزائیں شامل تھیں۔مثال کے طور پر کوڑوں کی تعداد لامحدود تھی۔اعضا کو کاٹنے اور غیر متعینہ عرصے تک قید کی سزائیں بھی شامل تھیں۔تالمودی دور کے بعد نیز رومن اور ساسانی سلطنتوں اور مسلم خلافت کے زوال کے بعد یہودی کمیونٹیاں کئی مقامات پر زیادہ خودمختار ہوگئیں اور یوں ربیوں کو زیادہ سخت سزائیں دینے کے مواقع حاصل ہوگئے۔

یہودی مذہبی اتھارٹیز زیادہ تر ان یہودیوں پر تشدد کرواتی تھیں جنھیں کافر یا مذہبی منحرفین تصور کیا جاتا تھا۔سزائیں تالمود یا اس کی تشریحوں کی روشنی میں دی جاتی تھیں۔تالمود رومن اور ساسانی سلطنتوں کے زمانوں میں مرتب ہوئی تھی۔ان زمانوں میں یہودیوں کی خودمختاری ازمنۂ وسطیٰ کے مقابلے میں بہت محدود تھی۔یہودی مذہبی پیشوا اکثر شکایت کرتے تھے کہ انھیں یہودی مجرموں کو سزائے موت دینے کا اختیار نہیں ہے، وہ صرف کوڑوں کی سزا دے سکتے ہیں۔چند ایک مثالوں میں تالمود کے عالموں نے یہودی مجرموں کو سزائے موت دینے کی کوشش کی تو حکومت نے ان سے سخت پوچھ تاچھ کی۔ان میں سے ایک واقعے کا ذکر فلسطینی تالمود میں آیا ہے، جس میں تیسری صدی میں ایک یہودی طوائف کو سزائے موت دی گئی تھی۔ایسا لگتا ہے کہ سزائے موت پر عمل مشکل پاتے ہوئے تالمود میں یہودی کافروں کے لیے موت کی سزا کا حکم نہیں آیا بلکہ دوسرے یہودیوں کو کہا گیا ہے کہ وہ انھیں کسی بہانے قتل کردیں۔تالمود میں سوال کیا گیا ہے کہ سمندر یا کنوئیں میں ڈوبنے والے انسان کے حوالے سے ایک نیک یہودی کو کیا کرنا چاہیے؟ تالمود جواب دیتی ہے، جسے اب بھی روایتی یہودیت تسلیم کرتی ہے، کہ جواب کا انحصار انسان کی قسم پر ہے۔اگر ڈوبنے والا انسان نیک یا معمولی جرائم کا مرتکب یہودی ہے تو

اسے بچالینا چاہیے۔ اگر ڈوبنے والا انسان غیر یہودی یا ایسا یہودی ہے جو "بھیڑ بکریاں چرانے والا گڈریا" ہے، یہ زمرہ تالمودی زمانے کے بعد غائب ہوگیا، تو اسے نہ تو بچانا چاہیے نہ سمندر یا کنوئیں میں دھکیلنا چاہیے۔ تاہم اگر ڈوبنے والا شخص یہودی کافر ہے تو اسے یا تو سمندر یا کنوئیں میں دھکا دے دیا جانا چاہیے یا اسے بچایا نہیں جانا چاہیے۔ تالمود کے تراجم میں یہ بات موجود نہیں ہے، جو کہ تالمود میں Tractate Avoda Zara (صفحہ 26 اے۔ بی) پر موجود ہے۔ ابن میمون نے بھی تین جگہوں پر اس کی توضیح کی ہے۔ اس نے Laws of Muderer and Preservation of Life میں غیر یہودیوں اور یہودی کافروں کے انجاموں کا موازنہ کیا ہے۔ Laws of Idolatry میں اس نے صرف یہودی کافروں پر بحث کی ہے۔ وہ Laws of Murderer and Preservation of Life (باب نمبر 4، اصول نمبر 10-11) میں لکھتا ہے:

> کافر ایسے یہودی ہوتے ہیں جو "ارادتاً" گناہ کرتے ہیں یعنی وہ یہودی جو مذبوحہ جانور کا گوشت نہیں کھاتے یا لینن اور اون کو ملا کر تیار کیے جانے والے کپڑے شاعتیز کا لباس پہنتے ہیں۔ تورات اور پیغمبروں کا انکار کرنے والے یہودی بھی کافر ہیں۔ انہیں قتل کر دیا جانا چاہیے۔ اگر کوئی یہودی انہیں تلوار سے قتل کرنے کی قوت و اختیار رکھتا ہے تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اسے انہیں دھوکا دینا چاہیے تاکہ وہ موت کے منہ میں چلے جائیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ ان میں سے کسی کو ایسے کنوئیں میں ڈوبتا ہوا دیکھے جس میں سیڑھی بھی ہو تو اسے سیڑھی کو دور کر دینا چاہیے اور کہنا چاہیے "مجھے اپنے بیٹے کو چھت پر سے اتارنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔" غیر یہودیوں اور یہودی گڈریوں کی جان بچانا ممنوع ہے۔

Laws of Idolatry باب نمبر 2، اصول نمبر 5 میں ابن میمون لکھتا ہے:

> بت پرستی کرنے والے یہودیوں کو غیر یہودی تصور کیا جاتا ہے۔ سنگساری کی سزا کا موجب گناہ کرنے والے یہودی بھی غیر یہودی تصور ہوتے ہیں۔ جو یہودی بت پرست بن جائے اسے پوری تورات کا منکر تصور کیا جاتا ہے۔ یہودی کافروں کو کسی صورت یہودی تصور نہیں کیا جاتا۔ ان کی توبہ کبھی قبول نہیں کرنی چاہیے۔ جیسا کہ لکھا گیا ہے: "جو اس عورت سے ملتا ہے، دوبارہ نہیں آتا ہے، نہ ہی وہ زندگی کے راستے پر گامزن رہتا ہے۔" (پرودرب 2:19) [یہ جملہ درحقیقت ایسے مردوں کے حوالے سے آیا تھا جو "کسی اجنبی عورت" یعنی طوائف کے ہاں آتے جاتے تھے] اپنے ہی نظریات پر عمل کرنے والے اور احمقانہ باتیں کرنے والے کافروں سے بات کرنا یا ان کی باتوں

کا جواب دینا ممنوع ہے۔ کیونکہ وہ یہودی مذہب کے نہایت اہم حصوں کو کمینگی اور تکبر
کے ساتھ مسخ کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ ایسا کرنا گناہ نہیں ہے۔ جیسا کہ لکھا گیا
ہے: ''اس عورت سے دور رہو اور اس کے گھر کے دروازے کے قریب نہیں آؤ''
(پرودرب 5:8)

اس آخری جملے میں بھی ان مردوں کی طرف اشارہ ہے، جو ''کسی اجنبی عورت سے ملتے جلتے ہوں'' یعنی کسی طوائف سے۔ مبصرین نے واضح کیا ہے کہ سچی توبہ کرنے والے بت پرست یہودی کو یہودی کمیونٹی میں قبول کر لیا جاتا ہے۔ تاہم جو کافر توبہ کرنا چاہتا ہو، اسے تنہا ہی ایسا کرنا ہوتا ہے۔ اس فرق کی بنیادی وجہ بظاہر یہی ہے کہ بت پرست یہودی، بشمول اس کے جو عیسائی بن گیا ہو، دوسرے مذہبی نظام کو قبول کر لیتا ہے، جبکہ کافر اپنے ہی نظریات پر عمل کرتا ہے، لہٰذا اسے زیادہ خطرناک تصور کیا گیا ہے۔ ابن میمون Laws of Idolatry کے باب نمبر 10 میں قدیم کنعانیوں کا حقہ پانی بند کرنے کی وضاحت کرتے ہوئے اور دوبارہ اس امر پر زور دیتے ہوئے کہ کسی یہودی کو قتل نہیں کیا جانا چاہیے، اصول نمبر 1 میں کہتا ہے: ''یہ سب سات کنعانی اقوام پر لاگو ہوتا ہے، تاہم یہودی مخبروں اور کافروں کا حقہ پانی بند کر دینا چاہیے اور انہیں جہنم میں ڈال دینا چاہیے کیونکہ انہوں نے صدوقی فرقے کے بانیوں زاروک اور بائیتوس اور ان کے شاگردوں کی طرح اپنے دلوں کو خدا کی طرف سے پھیر لیا ہے۔'' اگلے قانون میں ابن میمون واضح کرتا ہے کہ اگر غیر یہودی کی دشمنی برقرار رہنے کا خدشہ ہو تو کسی یہودی کو اس کا علاج نہیں کرنا چاہیے۔ ابن میمون اپنی کتاب Fundamental Laws of Torah کے باب نمبر 6 میں لکھتا ہے کہ یہودیوں کو مقدس صحیفہ جلانا یا اسے کسی دوسرے طریقے سے برباد کرنا منع ہے اور یہ کہ انہیں کسی ایسی عبرانی تحریر کو بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے جس پر خدا کے سات ناموں میں سے کوئی نام لکھا ہو۔ اس وضاحت کے بعد وہ قانون نمبر 8 میں کہتا ہے:

> اگر کسی یہودی کافر نے تورات لکھی ہو تو اسے، خدا کے تمام مقدس ناموں سمیت، جلا دیا جانا چاہیے کیونکہ کافر خدا کی تقدیس میں ایمان نہیں رکھتا اور اسے خدا کے لیے نہیں لکھ سکتا بلکہ وہ سوچتا ہے کہ یہ بھی دوسری کتابوں جیسی ایک کتاب ہے۔ چنانچہ ایسی تورات کو جلا دینا ایک مذہبی حکم ہے، تا کہ کافروں کی کوئی نشانی باقی نہ رہے۔ تاہم کسی غیر یہودی کی لکھی ہوئی تورات کو غیر یہودیوں کی لکھی ہوئی دوسری مقدس کتابوں کے ساتھ پرے رکھ دینا چاہیے۔ [3]

اگرچہ ابن میمون نے یہودیوں کو کافرانہ کتابیں جلانے کی ہدایت نہیں دی ہے، تاہم شاید اس نے 100ء تک تالمودی فضلاء کے جاری کردہ ہدایت ناموں کو سامنے رکھ کر محولہ بالا عبارت لکھی ہو۔ اس ہدایت ناموں

میں کافروں کی کتابوں کو جلا دینے کا کہا گیا ہے۔ تالمودی فضلاء نے بعض اوقات ایسی کتابوں کو خود جلایا تھا۔ ہلاکا ایسا کرنے کی ہدایت نہیں کرتا، تاہم ربیوں نے اپنے پیروکاروں کو ایسا کرنے کا کہا اور یہودی تاریخ یہودی کتابوں کی یہودیوں کے ہاتھوں آتش زدگی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ اٹھارھویں صدی میں تو یہ عمل انتہا کو پہنچ گیا تھا اور اس زمانے میں کتابوں کو قبرستان میں دفن کیا جاتا تھا۔ اگرچہ متعدد معذرت خواہانہ یہودی تاریخوں میں، بالخصوص انگریزی میں لکھی گئیں تاریخوں میں، یہودی تاریخ میں کتابوں کو جلانے اور قبرستانوں میں دفن کرنے کے واقعات کو بہت گھٹا کر پیش کیا گیا ہے، تاہم ان کی شدت عیسائی یا اسلامی تاریخوں سے بہت ہی زیادہ ہے۔

روایتی یہودیت آزادانہ غور وفکر پر بھی پابندی لگاتی ہے۔ ابن میمون اپنی کتاب Laws of Idolatry کے باب نمبر 2 میں لکھتا ہے کہ کسی یہودی کو بت پرستی کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے۔ اس کے بعد وہ قانون نمبر 3 میں کہتا ہے:

> نہ صرف بت پرستی کے بارے میں سوچنا ممنوع ہے بلکہ ہر اس خیال کے بارے میں سوچنے کی ممانعت ہے جو کسی یہودی کے ذہن میں یہودی مذہب کے ایک اصول کے حوالے سے بھی شک پیدا کر دے۔ ہم ایسی سوچوں سے بچیں گے کیونکہ انسانی فہم محدود ہے۔ چنانچہ جو یہودی اپنی آزادانہ سوچ کے مطابق عمل کرے گا، وہ یقیناً دنیا کو تباہ کر دے گا کیونکہ اس کی فہم محدود ہے۔ ایسا کیونکر ہوگا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ بعض اوقات بت پرستی کی طرف مائل ہوگا اور بعض اوقات خدا کو یکتا تصور کرے گا، کبھی وہ سوچے گا کہ خدا موجود ہے اور کبھی سوچے گا کہ خدا موجود نہیں ہے۔ وہ غور کرے گا کہ آسمان پر کیا ہے اور زمین کے نیچے کیا ہے۔ وہ سوچے گا کہ دنیا تخلیق ہونے سے پہلے کیا تھا اور دنیا ختم ہو جانے کے بعد کیا ہوگا۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ پیغمبری حقیقت ہے یا نہیں، وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ تورات خدا نے نازل کی ہے یا نہیں۔ چونکہ ایسے لوگ سچ کو پانے کے لیے درست منطق سے واقف نہیں ہوتے، اس لیے کافر بن جاتے ہیں۔ تورات نے ہمیں اس حوالے سے خبردار کیا ہے۔ "تم اپنے دل کے کہے پر عمل کرتے ہوئے طوائف کو استعمال کر رہے ہو" (نمبرز 16:39) [یہ جملہ کریت شا کے تیسرے ٹکڑے میں ہے۔ یہ ایک دعا ہے جسے یہودی اپنی صبح اور شام کی عبادت میں پڑھتے ہیں] اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر یہودی کو اپنے علم کے مطابق عمل کرنا منع ہے نیز یہ تصور کرنا منع ہے کہ اس کی اپنی سوچ اسے سچ تک پہنچا سکتی ہے۔ اس گناہ کے نتیجے میں

یہودی جنت کھو دیتا ہے، تاہم وہ کوڑوں کی سزا کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔

آزاد فکری کی یہ ممانعت (جس کا اطلاق کچھ ہیریڈم خود ابن میمون کی بعض تحریروں پر بھی کرتے ہیں) مابعدِ تالمودی یہودیت میں عام تھی اور آرتھوڈوکس یہودیت میں موجود رہی۔ آرتھوڈوکس یہودیت آزاد فکری پر مکمل پابندی لگاتی ہے، ایسے مسائل و معاملات کے حوالے سے بھی کہ جن پر سینٹ آگسٹائن نے کھل کر بحث کی ہے۔ بلاشبہ موجودہ دور کے آرتھوڈوکس یہودی سکالر ایسے مسائل و معاملات پر بات نہیں کرتے ہیں۔*[4] تھامس ایکویناس نے جن الہیاتی مسائل پر آزادانہ بحث کی ہے، روایتی یہودیت میں ان پر سوچنا بھی ممنوع رہا ہے۔*[5] (روایتی یہودیت میں موجودہ دور میں نہ صرف آرتھوڈوکس بلکہ بہت حد تک قدامت پسندانہ یہودیت بھی شامل ہے)۔ حیرانی کی بات ہے کہ بہت سے لوگ، خصوصاً انگریزی بولنے والے ملکوں کے لوگ، گزشتہ 150 برسوں میں بے شمار ملکوں میں متعدد یہودیوں کے دانشورانہ امتیاز حاصل کرنے کو مابعدِ تالمودی یہودیت سے منسوب کرتے ہیں۔ اس مغالطے نے یہودی بنیاد پرستی کے پھیلاؤ میں کافی حصہ ڈالا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دانشورانہ امتیاز حاصل کرنے والے بیشتر یہودی تو اس قسم کے آمرانہ نظام کے باغی تھے، انہوں نے تو اس کے بعض بنیادی عقائد کو رد کر دیا تھا۔

روایتی یہودیت کافروں کو کسی بھی طریقے سے قتل کرنے کی وکالت کرنے کے علاوہ حکم دیتی ہے کہ جب تک وہ زندہ ہوں ان کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا جائے۔ اس کی ایک معاشرتی اعتبار سے اہم مثال ایسے یہودیوں کا دفنایا جانا ہے۔ روایتی یہودیت گناہ گار یہودیوں اور ایا کافر یہودیوں کے دفنائے جانے کے حوالے سے خصوصی احکامات دیتی ہے۔ فلسطینی تالمود کے Tractate Trumot باب نمبر 8، ہلا کا نمبر 3 میں گیلیلی کے ایک غیر کوشر گوشت بیچنے والے قصاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ قصاب چھت سے گر کر مر گیا تھا۔ تیسری صدی کے اوائل کا یہودی بزرگ، ربی ہانینا بار ہاما نے شہر کے یہودیوں کو اکسایا کہ وہ اس کی لاش اپنے کتوں کے آگے ڈال دیں۔ ایسا طرزِ عمل عمومی طور پر مناسب نہیں ہوتا تھا لہٰذا بعد کے ربی زیادہ اعتدال سے کام لیتے تھے۔ ابن میمون اور بعد کے زمانوں کے دیگر ربی اس امر پر قانع تھے کہ کافر یہودی کے مرنے پر اس کے خاندان کو اس کا سوگ منانے کی بجائے خوشی منانے کا حکم دیتے تھے۔ ابن میمون اپنی کتاب Laws of Mourning کے باب نمبر 1 قانون نمبر 10 میں لکھتا ہے:

> مذہبی احکامات پر عمل نہ کرنے والوں، مقدس تعطیلات کا احترام نہ کرنے والوں، سینا گوگ نہ جانے والوں اور دوسری اقوام کے لوگوں کی طرح آزادانہ طرزِ عمل اپنانے والوں، کافروں، یہودیت چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لینے والوں اور مخبروں کی موت کا سوگ نہیں منایا جانا چاہیے۔ ان کی موت پر ان کے بھائیوں اور سب دوسرے رشتہ

داروں کو سفید لباس پہننا چاہیے اور خوشیاں منانی چاہئیں، کیونکہ خدا سے نفرت کرنے والا فنا ہو گیا ہے۔

بیشتر یہودی اس وقت تک ابن میمون کے اس فلسفے پر عمل کرتے رہے جب تک کہ یہودی جدیدیت کا آغاز نہیں ہو گیا۔ کچھ آرتھوڈوکس یہودی آج تک اس کے فلسفے پر عمل پیرا ہیں "[6] انیسویں صدی میں مشرقی یورپ کے چھوٹے قصبات میں رہنے والے یہودیوں نے کافروں اور گناہ گار یہودیوں کی ذلت آمیز تدفین کی ایک اور رسم وضع کر لی تھی۔ اس رسم کو، جسے معاصر عبرانی اور یدش ادب میں اکثر بیان کیا گیا تھا، "گدھے کی تدفین" کہا جاتا تھا۔ اس رسم کا ماخذ یرمیاہ 22:10 کی وہ انجیلی آیت تھی جس میں پیغمبر نے پیش گوئی کی تھی کہ جوڈیا کا بادشاہ یوہوائیاکم "گدھے کی طرح دفنایا جائے گا۔" اس رسم کے تین عمومی حصے تھے۔ اول، قصبے کے سب سے زیادہ جنونی یہودیوں پر مشتمل یہودی تدفین سوسائٹی "مقدس سوسائٹی" کے اراکین کافر کی لاش کو پیٹتے تھے۔ اس کے بعد لاش کو فضلے سے بھرے ہوئے چھکڑے پر لاد دیا جاتا تھا اور پورے قصبے میں پھرایا جاتا تھا۔ آخر میں لاش کو قبرستان کے احاطے سے باہر کوئی مذہبی رسم ادا کیے بغیر زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ "گدھے کی تدفین" اور "احاطے سے باہر" عبرانی اور یدش ادب میں ضرب المثل کا درجہ پا گئے تھے اور انہیں آج بھی معاشرتی مقاطعے کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مشہور یہودی ادیب پیریز سمولینسکی (1840-85ء) نے "گدھے کی تدفین" کے عنوان سے ایک ناول لکھا تھا، جسے آج بھی پڑھا جاتا ہے۔ سمولینسکی نے اپنے ناول میں ایک چھوٹے سے روسی قصبے میں رہنے والے ایک نوجوان یہودی کی کہانی بیان کی ہے، جس کا یہودی تدفین سوسائٹی کے سربراہ سے ایک معمولی سی بات پر جھگڑا ہو جاتا ہے، اور وہ اسے کافر قرار دے دیتا ہے۔ یہودی مذہبی لوگ ایک کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کرتے ہیں، جو کافر کو قتل کر دیتا ہے۔ کافر کو "گدھے کی تدفین" والی رسم کے مطابق دفنایا جاتا ہے۔ سمولینسکی عبرانی ادب میں فطرت پسندانہ (Naturalistic) اسلوب کا بانی تھا۔ اس نے اپنے ناول اس زمانے کے یہودی معاشرے کے قریبی مشاہدے کی اساس پر لکھے تھے۔

کافر کی تعریف متعین کرنے کے حوالے سے یہودی علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تالمودی فضلاء نے کافروں کی متعدد اقسام بیان کی ہیں، جن کے نام بھی الگ الگ ہیں۔ تالمود میں "اپی کوروس" نامی کافروں کا ذکر آیا ہے۔ شاید یہ نام یونانی فلسفی اپی کیورس کے پیروکاروں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تالمود میں Tractate Sanhedrin صفحہ 99b پر تمام ایسے یہودیوں کو اپی کوروس قرار دیا گیا ہے جو ربیوں کا احترام نہیں کرتے۔ ایک تالمودی فاضل نے کہا تھا کہ جو یہودی کسی ربی کی موجودگی میں دوسرے یہودی کا احترام نہ کرے، وہ کافر ہے۔ ربی مینا ہیم ہامیری مذکورہ بالا حوالے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی ربی کو تقدیسی القاب کے بغیر صرف اس کے نام سے پکارنے والا یہودی کافر ہوتا ہے۔ تاہم بیسویں صدی تک غالب رائے یہی تھی کہ ربیوں کا

احترام نہ کرنے والے یہودی کافر نہیں بلکہ "کافروں جیسے" ہوتے ہیں۔ اصل کافر وہ ہیں جو تالمود کو مذہبی اتھارٹی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوں۔ یہ تعریف ہنگامی قوانین کے اطلاق کے دوران کافروں اور دیگر گناہگاروں کی سزا کو کم نہیں کرتی۔ یہ تعریف مذہبی ادارے کو ٹیکس ادا کرنے والے یہودیوں کو الگ کرتے ہوئے ان پر تالمود کے عائد کردہ فرض کو کم کرتی تھی۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں دو مشہور ربیوں، ربی بازون ایلش اور ربی کک دی ایلڈر کا کہنا تھا کہ "کافروں کے حوالے سے بنائے گئے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ دکھائی دینے والے معجزے رونما نہیں ہوتے۔" ربی ایلش اور کک کی رائے پر آج کل کس حد تک عمل ہوتا ہے، یہ طے کرنا مشکل ہے۔ تاہم اپنی بحث کے اس مرحلے پر ہماری توجہ ماقبل جدید ادوار پر مرکوز ہے۔

یہودی کافروں اور گناہگاروں کو ہنگامی یہودی قوانین کے تحت دی جانے والی سزاؤں کا جائزہ لیتے ہوئے ہم آخری یہودی ربیوں کے اعلانات سے آغاز کرتے ہیں، جنہیں آج بھی آفاقی طور پر اتھارٹیز تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ربی تقریباً 1050ء تک عراق کے یشیووت کے سربراہ تھے۔ انہیں گیونم کا نام دیا تھا۔ (گیونم کی واحد "گاؤن" ہے جس کا مطلب عبرانی میں "نابغہ" ہوتا ہے) ساری دنیا کے یہودی ان گیونم سے سوالات پوچھتے تھے۔ ان کے دیئے ہوئے جوابات آج تک محفوظ ہیں۔ ان سوالات کا تعلق اس امر سے تھا کہ یہودیوں کو، بالخصوص یہودی کمیونٹیوں کو کس طرح کا طرز عمل اپنانا چاہیے۔ ربی سمہا آصف نے اپنی کتاب میں ایسے بہت سے جوابات کو نقل کیا ہے۔ ایک جواب میں کہا گیا ہے کہ سبت کی خلاف ورزی کرنے والے یہودی کو کوڑے مارے جانے چاہئیں اور اس کے بال مونڈ دیئے جانے چاہئیں (صفحہ 45)۔ ربی پیلوئی گاؤن نے 858ء میں ایک زیادہ مشکل سوال کا جواب دیا تھا۔ اگر سبت یا کسی اور مقدس دن کی خلاف ورزی کرنے والے یہودی کے فرار کا خطرہ ہو تو کیا اسے اسی دن کوڑے مارے جانے چاہئیں؟ ربی پیلوئی نے جواب دیا کہ مجرم کو قید کر دیا جانا چاہیے اور سبت یا کسی دوسرے مقدس دن کے گزرنے کے بعد اسے کوڑے مارے جانے چاہئیں۔ تاہم وہ کہتا ہے کہ سبت کی تقدیس اپنی جگہ، مجرم کو کوڑے ضرور مارے جانے چاہئیں (آصف صفحہ 48)۔ ربی پیلوئی کے بعد کے زمانے کے ربی زیماک گاؤن سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی مذہبی پیشوا بیوہ سے شادی کی ممانعت کی خلاف ورزی کرے تو اس کے ساتھ کیا کیا جائے؟ (صفحہ 52)۔ ربی زیماک نے کہا کہ ایسے مذہبی پیشوا کو کوڑے مارنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی انگلیاں کاٹ دی جانی چاہئیں۔ آخری گاؤن ربی حئی، جو کہ 1042ء میں فوت ہوا، کا کہنا تھا کہ کوڑا سن کا بنا ہوا ہو اور زیادہ بڑے گناہگار کو زیادہ موٹے کوڑے سے پیٹنا چاہیے۔ گناہگار کا "دایاں ہاتھ اس کے دائیں پاؤں سے باندھ دیا جائے اور بائیں ہاتھ بائیں پاؤں کے ساتھ۔" کوڑے مارنے والا مجرم کے سر کے پاس کھڑا ہو۔ کوڑے مارے جانے کی تقریب کا آغاز بائبل کی تلاوت سے ہونا چاہیے۔ کوڑے مارے جانے کے بعد ننگا مجرم اپنا لباس اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کھڑا ہوگا اور اپنی سزا کے منصفانہ ہونے کو تسلیم کرے گا۔ آخر میں

عدالت خدا سے اس پر رحم کرنے کا کہے گی۔ ایک دوسرے جواب میں، جسے آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 56 اور 57 پر درج کیا ہے، ربی حئی نے ان گناہوں کو گنایا ہے جن کا ارتکاب کرنے والے یہودیوں کو کوڑے مارے جائیں گے: کسی کم مقدس دن بال ترشوانے پر، سوگ کے ایام میں جوتے پہننے پر اور سبت کی خلاف ورزی پر کوڑے مارے جائیں گے۔ آصف صفحہ نمبر 58 اور 59 پر لکھتا ہے کہ گیارہویں صدی کے جوابات سے ثبوت ملتے ہیں کہ مصر کے یہودی گناہگاروں کو سینا گوگ کے سامنے کوڑے مارتے تھے جبکہ اطالوی ربی، ملک کے سیاسی انتشار اور بڑی یہودی کمیونٹی کی وجہ سے گناہگاروں کو سزائے موت دینے پر قادر تھے۔ آصف نے ربی ابوہارون کی مثال دی ہے، جس نے متعدد گناہگاروں کو موت کی سزا دی۔ اس نے ایک زناکار مرد کو گلا گھونٹ کر مارنے کی سزا دی جبکہ اپنی ساس کے ساتھ مباشرت کرنے والے شخص کو زندہ جلانے کی سزا دی۔ آصف لکھتا ہے کہ ایک نامعلوم اطالوی ربی نے ایک احاطے میں مقیم بہت سے یہودیوں میں سے ایک کو صرف اس وجہ سے کوڑوں کی سزا دی تھی کہ اس نے اپنا فلیٹ دوسرے یہودی کو فروخت کر دیا تھا۔

سپین میں، مسلم اور عیسائی حکمرانی کے دوران، یہودیوں کو کافی زیادہ خودمختاری حاصل تھی جس کی وجہ سے گناہگار یہودیوں کو سزائیں دیئے جانے کی مثالیں بے شمار ہیں۔ آصف اپنی کتاب کے صفحہ 62 پر ربی سیموئیل دی پرنس [7]، متوفی 1046ء کے حوالے سے لکھتا ہے: "سپین کافروں سے خالی ہے" صرف عیسائی علاقوں کے نزدیک رہنے والے یہودیوں کے بارے میں شبہات ہیں کہ کچھ خفیہ کافر موجود ہیں۔ ہمارے آباؤاجداد نے کوڑوں کے مستحق کچھ ایسے یہودیوں کو کوڑے مارے تھے اور ان میں سے کچھ اس سزا کے دوران مر گئے تھے۔" ربی حئی کا اصرار تھا کہ سزا پانے والے یہودی کو لازماً تسلیم کرنا چاہیے کہ سزا منصفانہ تھی۔ ربی حئی اور دوسرے ربی توبہ کو بالکل قبول نہیں کرتے تھے خواہ مجرم سزا کے دوران مارا جائے۔ ہوسکتا ہے سپین "کفر سے پاک" ہو گیا ہو، کیونکہ پہلے موجود کافروں کو کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ "روایت کی زنجیر" نامی کتاب کے مصنف فلسفی اور مؤرخ ربی اور امام ابن داؤد نے ایک فرقے کے بارے میں لکھا ہے، جس کی تذلیل کر کے اسے ایک کے سوا کیسٹائل کے سارے قصبوں سے نکال دیا گیا تھا۔ [8] ربی داؤد کی موت کے بعد ابن میمون نے کوڑوں کی سزا کو قدرے معتدل کروا دیا تھا۔ آصف نے ابن میمون کا حوالہ دیا ہے کہ جو یہودی ایسا گناہ کریں جس کی سزا موت ہو تو انہیں "اب صرف کوڑے مارے جانے چاہئیں اور ان کا حقہ پانی بند کر دینا چاہیے، تاہم اس کے بعد انہیں برادری میں کبھی شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔"

جن گناہوں پر یہودیوں کو سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں، ان میں مخبری کے علاوہ ربیوں کی نافرمانی سرفہرست تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس طرح کے واقعات کثرت سے ہوا کرتے تھے کیونکہ آصف نے بارسلونا کے مشہور ربی شلوموبن ایدیرت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہر ربی "بزرگوں کے ساتھ مل کر" ایسے یہودیوں کو، جنہوں

نے کسی ربی کی نافرمانی کی ہو یا جو "اپنی برائیوں کی وجہ سے بدنام" ہوں، نہ صرف کوڑے مارنے کی سزا دے سکتا ہے بلکہ ہاتھ یا پاؤں کاٹنے اور موت کی سزا بھی دے سکتا ہے۔ آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 72 پر لکھا ہے کہ ربی آشر ویلنسیا کے ربی موشے سے اس بات پر ناراض ہو گیا کہ اس نے سبت کے حوالے سے عمومی روایت اور یوں اس معاملے میں ربی آشر کی رائے کو رد کیا تھا۔ آشر نے ٹولیڈو سے ویلنسیا کے ربی یتزاک کو خط لکھا کہ وہ ربی موشے کی مذمت کرے۔ آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 74 پر لکھا ہے کہ ربی آشر نے "ہولی کمیونٹی آف ایویلا" کے سوال کے جواب میں کہا کہ برے لوگوں کو سزائے موت دینے سے یہودیت کی پاکیزگی ویسے ہی محفوظ رہتی ہے جیسے فصیلِ شہر کو محفوظ رکھتی ہے۔ لہٰذا جیسے ہر یہودی کو فصیلِ شہر کی تعمیر و مرمت کے لیے ٹیکس دینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ہر یہودی کو برے یہودیوں کو سزائے موت دینے کے لیے رقوم فراہم کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

سپین کے حوالے سے ہم آخری مثال ربی آشر کے بیٹے ربی یہودا کے دیئے گئے جواب کی دیتے ہیں۔ آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 77 پر یہ جواب نقل کیا ہے۔ یہ جواب اس لیے اہم ہے کہ نہ صرف یہ تشدد کے استعمال کا ایک ثبوت ہے بلکہ یہ مذہبی عدالتوں کے ہنگامی مقدمات میں طرزِ عمل کی بھی وضاحت کرتا ہے۔ یہودی ہنگامی قانون میں استدلال کا طریقہ ہلاکا سے بالکل مختلف ہے، جو کہ اس جواب سے بہت اچھی طرح عیاں ہے۔ ہلاکا کے تحت طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ دستاویزی ثبوت نہ ہونے کی صورت میں دو یا دو سے زیادہ مرد یہودیوں کی گواہی لازمی ہوتی ہے۔ دونوں مرد گواہوں کا بیان یکساں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ربی یہودا نے اپنے جواب میں ایک یہودی کی مثال دی ہے جس نے دوسرے یہودی کو اس بری طرح مارا تھا کہ وہ مر گیا تھا۔ دو گواہوں موشے اور اوراہام نے مار پیٹ ہوتے دیکھی تھی۔ دو دوسرے گواہوں یوسف اور یتزاک نے مار پیٹ کا صرف آغاز ہوتے دیکھا تھا۔ وہ وہاں سے چلے گئے تھے اور جب واپس آئے تو دیکھا کہ مضروب زمین پر پڑا ہے اور اس کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ ربی یہودا خدا کی تعریفیں کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ کس طرح اس مقدمے کا فیصلہ ہلاکا سے مکمل طور پر مطابقت نہ رکھنے والے موجودہ یہودی قانون کے اصولوں کے تحت کیا جائے گا۔ ربی یہودا کہتا ہے:

> اگر صرف موشے اور اوراہام کی گواہی کو مدنظر رکھا جائے تو ملزم کو سزاوار ٹھہرانا چاہیے۔ اگر ان کے ساتھ یوسف اور یتزاک کی گواہی کو بھی مدنظر رکھا جائے تو اس کا صرف دایاں ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ اگر پہلے گواہوں کی گواہی کو غیر مصدقہ اور بعد والے گواہوں کی گواہی کو مصدقہ مانا جائے تو ملزم کا صرف بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ اگر تمام گواہیاں قبول نہ کی جائیں تو ملزم کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ قتل کی حقیقت اسے بدنام کر دے گی۔

سپین کی نسبت دوسرے یورپی ملکوں میں یہودی خودمختاری اور یوں اس کے نتائج کم طاقتور تھے۔
شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پندرھویں صدی کے پہلے نصف میں دوسری ریاستیں، اپنی جاگیردارانہ ساخت کے باوجود سپینی مملکت سے زیادہ مضبوط تھیں۔ انگلینڈ میں، جہاں شاہی اقتدار بالخصوص مضبوط تھا اور جہاں یہودی صرف ولیم اول کے انگلینڈ کو فتح کرنے کے بعد آباد ہوئے تھے، جہاں تک ہم جانتے ہیں، مذہبی جرائم پر ربیوں کے یہودیوں کو کوڑے لگوانے یا دوسری سزائیں دینے کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ تاہم کانٹی نینٹل یورپ میں، جہاں یہودی خودمختاری کا انحصار بادشاہ کی بجائے فیوڈل لارڈز پر تھا، کافی مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر چودھویں صدی کے جرمنی کے مشہور ربی یوسف وائل نے اپنی جوابات والی کتاب میں لکھا ہے کہ ربی شمعون نے اس سے پوچھا کہ کیا سبت اور یوم کپور کی خلاف ورزی کرنے والے یہودی کی آنکھیں نکالنے کی اجازت ہے۔ ربی یوسف وائل نے جواب دیا کہ اس کی اجازت ہے اور اس اجازت کے حق میں تالمودی حوالے بھی پیش کیے۔ ایک دوسرے معاملے میں مشہور ربینو تام نے، جو کہ بارھویں صدی میں شمالی فرانس میں رہتا تھا، حکم دیا کہ ایک یہودی کو پیٹنے والے یہودی کی سزا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ آصف اپنی کتاب کے صفحہ 103 پر لکھتا ہے کہ ایک ربی کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے باپ کو کوڑوں کی سزا پر عمل درآمد کرواتے ہوئے دیکھا تھا۔ جرمنی میں چھوٹے مذہبی گناہوں کی سزا عموماً کوڑے مارنا تھی، جبکہ اعضا کو کاٹنے کی سزا شاذونادر ہی دی جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کوڑے مارنے کا رواج بھی ختم ہو گیا اور جرمن یہودی سزا کے طور پر جرمانے عائد کرنے، حقہ پانی بند کرنے یا جبری روزے رکھوانے لگے تھے۔

جرمنی کے مشرق میں واقع ملکوں بالخصوص پولینڈ میں اور 1569ء میں پولش لیتھوانیائی دولتِ مشترکہ کے بعد، جہاں یہودی خودمختاری زیادہ تھی، ربیوں کی عائد کردہ سزائیں سپین جتنی سخت ہوتی تھیں۔ ہر یہودی کمیونٹی کا اپنا زندان اور عقوبت گاہیں ہوتی تھیں۔ مجرم کو سزا دینے کے لیے لوہے کی صلیب سے اس کے بازو باندھ دیے جاتے تھے۔ سینا گوگ میں جانے والے یہودی اس کے منہ پر تھوک کر گزرتے تھے۔ وہ اس کے منہ پر طمانچے بھی مارتے یا دوسری جسمانی ایذائیں دے کر گزرتے تھے۔ سینا گوگ میں کوڑے تو عموماً مارے جاتے تھے۔ یہ عمل صبح کی عبادت کے دوران قانون پڑھتے ہوئے ہوتا تھا۔ آصف اپنی کتاب کے صفحہ 122 پر لکھتا ہے کہ سولہویں صدی کے مشہور ربی شلومولیوریا نے سوال کنندگان کو یقین دلایا کہ جس مجرم کو خوب کوڑے مارے گئے ہوں، وہ دوبارہ گناہ نہیں کرے گا اور کوڑوں کی تعداد کا تعین عدالت گناہ کی نوعیت کے مطابق کرے گی۔ سنگین صورتوں میں سزا اعضا کاٹنا یا موت ہو گی۔ آصف اپنی کتاب کے صفحہ 123 پر لکھتا ہے کہ پولش حکام نے ایک یہودی قاتل کو گرفتار کر لیا۔ ربی مہارام کا اصرار تھا کہ اسے ربی یا پولش حکام سزائے موت دیں۔ مہارام ربیوں کو موت کی سزا دینے کی بجائے اعضا کاٹنے کے نتائج کے حوالے سے خبردار کرتا ہے:

مجھے یاد ہے ربی شینتا آر آئی پی کے زمانے میں جوان ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ایک نہایت برا یہودی ہوتا تھا۔ عظیم ربی نے کمیونٹی کو اس کی آنکھیں نکالنے اور ہاتھ کاٹنے کی اجازت دے دی۔ جب اس کے ساتھ ایسا ہو گیا تو وہ عیسائی ہو گیا اور ایک غیر یہودی عورت سے شادی کر لی۔ اس کے ہاں بچے پیدا ہو گئے۔ وہ اور اس کا خاندان ہمیشہ یہودیوں کے دشمن رہے۔

سترہویں صدی میں پولش لیتھوانیائی دولتِ مشترکہ میں موت یا کوڑوں کی سزا کی جگہ اعضا کاٹنے کی سزا ختم ہونے لگی تھی۔ اس کی جگہ شہر بدر کرنے کی سزا کا رواج ہونے لگا تھا۔ کسی شہر کی خود مختار یہودی کمیونٹی طے کرتی تھی کہ کون کون سے یہودی اس شہر میں رہ سکتے ہیں۔ عموماً پرانے باسیوں کی اولاد اور بیویوں کو رہنے کا حق ہوتا تھا۔ ربیوں کو بھی کسی قصبے میں رہنے کا استحقاق حاصل ہوتا تھا۔ دیگر یہودیوں کو کمیونٹی کے حکام کے سامنے درخواست پیش کرنا پڑتی تھی اور کچھ رقم کی ادائیگی یا کچھ وقت انتظار کرنے کے بعد انہیں وہاں آباد ہونے کا حق مل جاتا تھا۔ چنانچہ کسی یہودی کے لیے سخت ترین سزا شہر بدری ہوتی تھی کیونکہ اس کے بعد اسے کسی دوسرے قصبے میں آباد ہونے کے لیے بہت دقتیں اٹھانا پڑتی تھیں۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں اس سزا کو بہت زیادہ استعمال کیا گیا۔ جب روس، پروشیا اور آسٹریا نے پولینڈ کو بانٹ لیا تو تینوں فاتح طاقتوں نے یہودیوں کی خود مختاری کو محدود کر دیا اور شہر بدری کی سزا دینے پر پابندی لگا دی۔ آصف اپنی کتاب کے صفحہ 127 پر لکھتا ہے کہ "کسی ربی کی توہین کرنے والے" یہودی کو جسمانی اور مالی سزائیں دے کر شہر بدر کر دیا جاتا تھا۔ آصف اپنی کتاب کے صفحہ 127 اور 128 پر لکھتا ہے کہ لتھوانیا میں یونین آف جیوئش کانگری گیشنز نے حکم دیا تھا کہ کسی شہر سے نکالے جانے والے یہودی کو دوسرے شہروں سے بھی نکال دیا جائے۔ شہر بدر کیے جانے والے یہودیوں سے ایک دستاویز پر دستخط کروا لیے جاتے تھے کہ اگر وہ ایک رات بھی مزید شہر میں رہے تو وہ ہر طرح کی سزا کے حقدار ہوں گے۔ ان سزاؤں میں "کان یا ناک یا دونوں کو کاٹنا" شامل ہوتا تھا۔ آصف کراکو شہر کے ایک نوجوان یہودی کا واقعہ درج کرتا ہے، جسے ایک معزز شخص کے گھر میں چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا تھا۔ اس نوجوان کو سیناگوگ کے سامنے کوڑے مارنے کی سزا دی گئی۔ اس سے ایک ڈیکلریشن پر دستخط کروائے گئے کہ اگر وہ دوبارہ اس شہر میں نظر آیا تو "اس کے دونوں کان کاٹ لیے جائیں گے نیز اضافی سزائیں بھی دی جائیں گی۔" جب 1722ء میں ولان کی یہودی کمیونٹی نے ہسیڈی تحریک کے خلاف مہم شروع کی تو انہوں نے اپنے قصبے کے ہسیڈیوں کو سزائیں دیں۔ سبت کی شام کو عبادت سے پہلے تمام ہسیڈی تحریریں سیناگوگ کے سامنے جلا دی گئیں تاکہ عبادت کے لیے آنے والے یہودی راکھ کا نظارہ کر سکیں۔ اس سے پہلے ولان کے چیف ہسیڈی مائر ایسار کو کمیونٹی ہال میں کوڑے مارے گئے تھے۔ اس کے بعد اس سے اس کے گناہوں کا اعتراف کرایا گیا اور بعد ازاں ایک ہفتے کے

لیے ولان کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ یہ کہانی جسے آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 139 پر بیان کیا ہے عبرانی زبان کی تاریخ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مل جاتی ہے۔ *9

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں مشرقی یورپ میں کسی مذہبی منحرف کو یہودی حکام کی طرف سے سزا دینے کی خاص مثال مائرا یسار والا واقعہ ہے۔ اٹھارہویں صدی کے بیشتر حصے میں یہودیوں میں مذہبی جنونیت کا غلبہ رہا، فرقہ وارانہ جھگڑے ہوئے، کتابوں کو قبرستانوں میں دفن کیا گیا اور کافروں کے خلاف عوامی بلوے ہوئے۔ صرف انگلینڈ اور ہالینڈ ان سے بچے ہوئے تھے۔ صدی کے اختتام تک مذہبی جنون دھیما پڑ گیا۔ انیسویں صدی میں مشرقی یورپ کے چھوٹے شہروں تک میں آباد یہودیوں کا مذہبی جنون دھیما پڑ چکا تھا۔ انیسویں صدی میں بے شمار یہودی امریکہ، برطانیہ اور کچھ دوسرے ملکوں میں چلے گئے جہاں مذہبی سزائیں یا تو مفقود تھیں یا بہت کم۔ *10

ہالینڈ میں آباد باروک سپائنوزا کو جن تکالیف سے گزرنا پڑا ان کا بیان ضروری ہے۔ ہالینڈ کی زیادہ جدید اور نسبتاً اعتدال پسند حکومت کی وجہ سے ایمسٹرڈیم کی یہودی کمیونٹی سپائنوزا کا صرف حقہ پانی بند کر سکی۔ اگرچہ کمیونٹی کے زیادہ افراد اسے کوڑے لگوانا یا سزائے موت دینا چاہتے تھے کہ اس نے اپنی تحریروں میں یہودیت کے خلاف لکھ کر گناہ کیا ہے، لیکن وہ ایسا نہ کروا سکے۔ *11 یہودی کمیونٹی صرف سیناگوگ میں اس کا داخلہ بند کروا سکی نیز اس کا سماجی مقاطعہ کر دیا گیا۔ سپائنوزا سے پہلے ایمسٹرڈیم کی یہودی کمیونٹی نے یوراٹیل ڈاکوسٹا کو انہی وجوہات کے تحت برادری سے نکال دیا تھا۔ تاہم ڈاکوسٹا سپائنوزا جتنا ثابت قدم نہیں تھا۔ اس نے ربیوں سے درخواست کی کہ اسے دوبارہ برادری میں شامل کر لیا جائے۔ ربیوں نے کہا کہ وہ سیناگوگ کے دروازے کے سامنے لیٹ جائے تا کہ یہودی اسے لتاڑ کر اندر داخل ہوں۔ اس سے گناہوں کا اعتراف بھی کروایا گیا۔ ڈاکوسٹا نے ان شرائط کو مان لیا اور اسے معافی مل گئی۔ ڈاکوسٹا کے خیالات دوبارہ کافرانہ ہو گئے تھے اور اس نے سزا کے خوف سے خودکشی کر لی تھی۔ *12 سپائنوزا اور ڈاکوسٹا کے انجام سے دورِ حاضر کے ان یہودیوں کو دو سبق ملتے ہیں، جو یہودی آرتھوڈکسی کی آمریت سے مصالحت نہیں کرنا چاہتے۔ (1) کسی دوسرے آمرانہ نظام کے مقابلے میں یہودی آرتھوڈوکسی کے آمرانہ نظام میں دانشورانہ مصالحت ناممکن ہے۔ (2) یہودی ماضی کے حوالے سے معذرت خواہانہ سوچ سے صرف یہودی ''خمینی ازم'' کے بڑھنے کا خطرہ ہے۔ اسرائیل میں اس طرح کی مصالحتوں سے ایک ایسی یہودی ریاست قائم ہونے کا خطرہ بڑھ جائے گا جس میں ربیوں کا غلبہ ہوگا، جو اپنے آباؤ اجداد کی طرح دوسرے یہودیوں کو سزا دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائیں گے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہودی سخت ترین سزائیں تبھی دیتے تھے جب انہیں زیادہ خود مختاری حاصل ہوتی تھی۔ روس، پروشیا اور آسٹریا نے پولینڈ کو فتح کرنے کے بعد یہودی کمیونٹی کی خود مختاری ختم کر دی تھی اور

یہودیوں کو اپنے ملکوں کے عمومی فوجداری قانون کے تحت لے آئے تھے۔ یہ فوجداری قانون جتنا بھی برا تھا، ربیوں کے ذریعے نافذ ہونے والے یہودی قانون سے لاکھ درجے بہتر تھا۔"13 کافروں کو سزائیں دینے کے اختیار سے دفعتاً محروم ہونے والے یہودیوں نے نئی صورت حال سے ہم آہنگ ہونے کو مشکل پایا۔ تاہم زار شاہی روس میں انیسویں صدی میں یہودیوں نے مذہبی اختراع کرنے والوں کو اس طرح قتل کیا جس طرح کے غیر یہودیوں کے ہاتھوں ہونے والے یہودیوں کے قتل عام کو ''پوگروم'' کہا جاتا ہے۔ 1818ء تک روس میں یہودیوں کے یہودیوں ہی کے خلاف بلووں کی تعداد غیر یہودیوں کے یہودیوں کے خلاف ''پوگروموں'' سے بڑھ گئی تھی۔ ہیسیڈیوں نے سب سے زیادہ سفاکی دکھائی۔ ہیسیڈی اس دور میں ابھرتے ہوئے عبرانی پریس سے نالاں تھے۔ عبرانی پریس ربیوں کے مذہبی سزائیں دینے کی خبریں اور اس پر احتجاج شائع کر کے ہیسیڈیوں کو مشتعل کر دیتا تھا۔ یہودی بلوائیوں سے بچنے کے لیے بیشتر عبرانی اخبار پیٹرزبرگ یا پروشیائی سرحد کے پیچھے شائع ہوتے تھے، جہاں پولیس مضبوط تھی اور تعداد میں کم یہودی زیادہ تر تعلیم یافتہ تھے۔

1818ء تک روس کے یہودیوں کی تاریخ یہودیوں کی مذہبی داروگیر سے بھری ہوئی ہے۔ ڈیوڈ آصف نے اسرائیلی ہسٹاریکل ایسوسی ایشن کے سہ ماہی ''زائیون'' (نمبر 4، 1994) میں ایک طویل مضمون لکھا ہے *14 جس میں وہ یومان، یوکرائن میں ہونے والے ایک بلوے کا حال لکھتا ہے۔ ایک مشہور ہیسیڈی کی قبر پر آنے والے اس کے عقیدتمندوں کو دوسرے ہیسیڈی زدوکوب کرتے تھے۔ یہ سلسلہ 1863ء میں انتہا کو پہنچ گیا جب بہت سے ہیسیڈی فرقوں نے مل کر عقیدتمندوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ مصنف ان بلووں کا موازنہ سامیت دشمنوں کے ''پوگروموں'' سے کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہیسیڈیوں نے تورات رکھنے والی مقدس الماری کو توڑ دیا۔ حملہ آور ہیسیڈی اس جگہ کو کافرانہ تصور کرتے تھے۔ مبینہ کافروں کو زدوکوب کیا گیا اور پتھر مارے گئے۔ حملہ آوروں نے جدید ہو جانے والے یہودیوں کو بھی زدوکوب کیا۔ عورتوں کو بھی بے حیائی والا لباس پہننے پر مارا گیا۔ برسلا کے خوفزدہ ہیسیڈیوں نے روسی فوجیوں کی کمپنی کی خدمات معاوضے پر حاصل کیں تاکہ وہ انہیں دوسرے ہیسیڈیوں سے بچائیں۔ اس سے اگلے برس ایک ربی رشکیف میں جا کر چندہ جمع کرنے لگا۔ آصف لکھتا ہے کہ اس شہر کے ربی نے لوگوں کو اس کے خاف بھڑکایا اور انہوں نے ''اسے پتھر مار مار کر ادھ موا کر دیا۔'' دونوں ربیوں کے پیروکاروں میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ دونوں ربیوں نے ایک دوسرے کو دھوکے باز قرار دیا۔ اس معاملے کی پولیس تفتیش ہوئی تھی۔ برسلا کے ہیسیڈیوں پر 1914ء تک حملے ہوتے رہے۔

1886ء میں وشرگراڈ میں بھی ایک بلوہ ہوا تھا جس کی خبریں اس وقت کے عبرانی اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ نئے یہودی مورخ روزن نے اپنے ایک مضمون میں لکھا:

وشرگراڈ کے ہیسیڈی سیناگوگ کے نئے کینٹر کے خلاف تھے کیونکہ اس کا لباس صاف

ہوتا تھا اور وہ اپنے عام جوتوں کے اوپر ربر کے جوتے پہنتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سینا گوگ میں اس کیتھڑ کے خلاف فساد کر دیا اور اپنے مخالفوں کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ پولیس نے آ کر دونوں فریقوں کو الگ کیا۔ اس فساد کو بھڑکانے والے ربی کو حراست میں لے لیا گیا اور تفتیش کے لیے تھانے لے جایا گیا۔ حقیقی فسادیوں پر فوجداری مقدمات چلائے جائیں گے۔

1818ء کے بعد روس میں صورت حال تبدیل ہونا شروع ہو گئی اور متعدد واضح وجوہات کے تحت یہودیوں پر یہودیوں کے حملے کم ہو گئے۔ اول 1818ء میں حکومت کے ایما پر روسی اور یوکرائنی پوگروم شروع ہو گئے اور روس سے یہودیوں کی کثیر تعداد نقل مکانی کرنے لگی۔ اس کے علاوہ الیگزینڈر سوم کے عہد میں پولیس کی گرفت کڑی ہو گئی تھی۔ الیگزینڈر سوم اپنے باپ الیگزینڈر دوم کے انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔ اگرچہ یہودیوں پر یہودیوں کے حملوں میں کمی آ گئی تاہم 1914ء تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔

پولش علاقوں میں آسٹریائی پولیس سخت نگرانی کرتی تھی جس کی وجہ سے یہودیوں پر یہودیوں کے براہ راست حملے ظاہری طور پر رک گئے۔ آرتھوڈوکس یہودیوں نے جدید یہودیوں کے خلاف مذہبی دارو گیر کے خفیہ طریقے استعمال کیے۔ جدید یہودی اپنے آپ کو "ماسکیلم" (روشن خیال) کہلواتے تھے۔ انتہائی صورتوں میں ماسکیلم کو قتل کروا دیا جاتا تھا۔ روزن اپنے مضمون میں لکھتا ہے:

> چونکہ رابن کی برسی قریب آ رہی ہے لہٰذا بین گوریان یونیورسٹی میں شعبۂ یہودی افکار کے پروفیسر زیوگرس نے انیسویں صدی میں لیمبرگ (اب لویو) میں رونما ہونے والے ایک واقعے کی روداد لکھ بھیجی ہے۔ (1848ء میں لیمبرگ آسٹریا میں شامل تھا۔) یہودیوں نے مذہبی وجوہات کے تحت ایک ربی اور امام کوہن کو قتل کر دیا۔ یہ قتل روشن خیال یہودیوں اور جنونی ہیسیڈیوں کے جھگڑے کا نتیجہ تھا۔ فلسطین میں عبرانی اخبار "داور" میں لیبر لیڈر آرلوزوروف کے قتل کے ایک سال بعد اس حوالے سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس زمانے کے دائیں بازو کے عبرانی اخبارات نے مضمون پر سخت تنقید کی تھی۔

روزن نے پروفیسر بارٹل کا بھی حوالہ دیا ہے جسے یقین ہے کہ ہیسیڈی حملے باروک گولڈسٹائن کے قتل عام کے پیشرو تھے۔ بارٹل لکھتا ہے کہ ماسکیلم ہیسیڈیوں اور دوسرے آرتھوڈوکس مذہبی یہودیوں پر صرف طنزیہ حملے کرتے تھے۔[15*] بارٹل کہتا ہے کہ ماسکیلم صرف خود پر ہونے والے جسمانی حملوں کے تحفظ میں حملے کرتے تھے۔

روزن نے پروفیسر گرس کے بیان کردہ ربی کوہن کو زہر دے کر قتل کرنے کے واقعے کو یوں لکھا ہے:

> ماسکیلم نے ربی اور اہام کوہن کو اپنا ربی بنایا تھا۔ پہلے وہ ایک چھوٹے سے آسٹریائی قصبے ہوہن ماس کا ربی تھا۔ دو سال بعد وہ لیمبرگ کے تمام ماسکیلم کا ربی بن گیا۔ اس نے یہودی زندگی میں تبدیلیاں لانے کی کوششیں کیں تاہم مذہبی جنونی اس کے خلاف ہو گئے۔ کوہن نے یشیووت کی جگہ یہودی سکول کھولنے کی کوشش کی۔ اس نے شادی کے وقت یہودی جوڑے سے لیے جانے والے مذہبی امتحان کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جسے آرتھوڈوکس ربیوں نے رواج دے رکھا تھا۔ کوہن کا سب سے اہم اقدام کوشر گوشت اور سبت کی شمعوں پر عائد ٹیکس ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیمبرگ کے یہودی یہ ٹیکس آسٹریائی حکام کو ادا کرتے تھے۔ یہ ٹیکس غریب یہودیوں پر بوجھ لیکن کچھ آرتھوڈوکس معززین کی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ ٹیکس کے حصول کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی امیر یہودی حکومت کو اکٹھی رقم دے کر یہودیوں سے ٹیکس وصول کرنے کا حق حاصل کر لیتا تھا۔ ٹیکس اکٹھا کرنے والے اس طرح کے پانچ امیر آدمی، سب کے سب بڑے نیک پرہیزگار، کوہن کے خلاف ہو گئے۔ ان کا لیڈر ربی ہرتزبیر برنسٹائن تھا جس کا تعلق ایک معروف مذہبی گھرانے سے تھا۔ دوسرا لیڈر لیمبرگ کے آرتھوڈوکس ربی کا بیٹا ربی زوی اوربنسٹائن تھا۔ 1846ء میں کوہن نے آسٹریلیا کے بادشاہ کو ایک یادداشت بھیجی جس میں ان ٹیکس اکٹھا کرنے والوں کی ناانصافیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ حکام سے تعلقات کی وجہ سے بادشاہ نے اسے دو مرتبہ ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ پانچ ٹیکس اکٹھا کرنے والوں نے ایک یادداشت بھیجی کہ ٹیکس اکٹھا کرنے سے ہزاروں یہودی خاندانوں کو روزی ملتی ہے۔ بایں ہمہ آسٹریائی حکام نے کوہن کی درخواست مان لی اور مارچ 1848ء میں ٹیکس ختم کر دیے گئے۔

ٹیکس کوہن کی درخواست پر ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس کی وجہ 1848ء میں ہیپسبرگ آمریت کے خلاف ویانا میں ردعمل سے شروع ہونے والا انقلاب تھا۔ آسٹریائی لبرل ان ٹیکسوں کو امتیازی سمجھتے تھے اور ان کی مخالفت کرتے تھے۔ روشن خیال یہودی ان کے حامی تھے۔ آرتھوڈوکس یہودی، بالخصوص ان کے ربی آمریت کے اتحادی تھے، نہ صرف آسٹریا میں بلکہ پورے یورپ اور مشرق وسطیٰ میں۔ روزن ربی کوہن کا انجام یوں بیان کرتا ہے:

> ربی کوہن کے خلاف زبردست مظاہرے ہونے لگے۔ پانچوں یہودی معزز متحد ہو کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کے قتل کا فیصلہ کر لیا گیا۔ طے پایا کہ اسے 1848ء کے یوم

کے دوران قتل کیا جائے گا۔ تاہم وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ ایک ماہ بعد 1848ء کے پاس اوور کے موقع پر ایک ہجوم نے ربی کوہن کے مکان پر ہلہ بول دیا۔ اس موقعے پر پولیس نے اسے بچایا۔ تاہم 6 ستمبر 1848ء کو ایک یہودی قاتل اوراہام بارپلیل ربی کے گھر میں چھپ کر داخل ہو گیا۔ اس نے کچن میں جا کر سوپ میں زہر ملا دیا۔ جب تھوڑی دیر بعد ربی کوہن اور اس کے خاندان نے سوپ پیا تو وہ اور اس کی چھوٹی بیٹی ہلاک ہو گئے۔ ہسیڈی اور ان کے لیڈر جنازے میں شامل نہیں ہوئے۔ انہوں نے تو خوشیاں منائی تھیں۔ مزید برآں کسی آرتھوڈکس یہودی نے مذمت کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ بہت سے قوم پرست یہودیوں نے خاموش رہ کر ان کا ساتھ دیا۔ یہودیوں کی تاریخ کے پہلے مصنف تاریخ دان گریٹز نے یہ واقعہ اپنی کتاب سے حذف کر دیا تھا۔ آرتھوڈوکس یہودیوں نے ربی کی لاش کو قبرستان کے معزز یہودیوں کے حصے سے نکال کر ایک دوسرے حصے میں دفن کر دیا تھا۔

پروفیسر گرس لکھتا ہے: ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہودیت میں کچھ نیا نہیں ہے۔'' رابن کے قتل کے وقت بھی وہی صورت حال تھی جیسی گیلیشیا میں۔

کیا ربی اوراہام کا قتل غیر معمولی واقعہ تھا؟ دسمبر 1838ء میں جنوب مغربی روس کے گورنر نے یہودیوں کی عبادت گاہوں کی چھان بین کروائی تھی۔ اسے رپورٹ دی گئی کہ ''ان مقامات پر اکثر اوقات قتل ہوتے ہیں۔ سنگین بات یہ ہے کہ انہیں عبادت گاہ کہا جاتا ہے۔ مذہبی عدالتیں خود مختار ہیں، جو اپنے ہم مذہبوں کے جرائم کو بے نقاب کرنے والے یہودیوں کو ''مخبر''[16] قرار دے کر سزائیں دیتی ہیں۔ ربی سرکاری تفتیش کو اس قدر دھندلا دیتے ہیں کہ قاتل تو قاتل مقتول کی شناخت بھی ممکن نہیں رہتی۔''

بہت سے نئے اسرائیلی مورخوں کو یقین ہے کہ کافروں اور مخبروں پر ہونے والے تشدد میں قریبی ربط ہے۔

رابن کے قتل کے تناظر میں ہلاکا کے دو قوانین بہت اہم ہیں۔ یہ دو قوانین تالمودی دور سے یہودیوں کے قتل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ یگال امیر نے بھی وزیر اعظم رابن کے قتل کے جواز میں انہیں کو پیش کیا تھا اور اس قتل کو درست قرار دینے یا اس کی بمشکل مذمت کرنے والے یہودی بھی ان قوانین کا حوالے دے رہے ہیں۔ پہلے قانون میں ہر یہودی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کسی دوسرے یہودی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھنے والے یہودی کو قتل یا شدید زخمی کر دے۔ دوسرا قانون ہر یہودی کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایسے یہودی کو قتل یا زخمی کر دے، جو غیر یہودی

حکام کو یہودیوں کی املاک کی معلومات فراہم کرے۔ رابن کے قتل سے پہلے اشتعال انگیزی کے عرصے میں بہت سے ہیریڈی اور مسیحا پرست مصنفوں نے انہیں دو قوانین کے حوالے دیئے تھے۔ تاریخی اعتبار سے وطن سے دور یہودی جدید ریاست کے ظہور تک اس قانون پر عمل پیرا رہے تھے۔ زار کی سلطنت میں آباد یہودی انیسویں صدی تک اس پر عمل پیرا رہے۔

تمام مذہبی یہودی اسرائیل کو یہودیوں کی خصوصی ملکیت تصور کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں۔ اس خطۂ ارض کے کسی بھی حصے پر فلسطینیوں کو اقتدار قائم کرنے کی اجازت دینا مخبری کے زمرے میں آسکتا ہے۔ کچھ مذہبی یہودیوں نے رابن اور فلسطینی اتھارٹی کے درمیان تعلق کو یہودی آبادکاروں کے لیے نقصان دہ تصور کیا۔ اس مفہوم میں رابن نے مخبری کی تھی۔ بااثر ربیوں، مثلاً گش ایمونم کے لیڈر ربی موشے لیونجر نے عوامی سطح پر مخبر رابن کی مذمت کی۔ اسرائیل کے ایک نہایت قابلِ احترام شخص، تل ابیب یونیورسٹی کے پروفیسر ایسا کاشر نے ہارتز کے مدیر کے نام خط میں لکھا کہ لیونجر نے اس اصطلاح کو جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس نے اس تعبیر کے نتیجے میں ہونے والے قتل کے خطرات کی بھی نشاندہی کی۔ اس کے انتباہ کو ہارتز کے مدیر اور رابن نے نظر انداز کر دیا۔ شبک یعنی اسرائیلی خفیہ پولیس کی داخلی امور اور رابن کی محافظت کی ذمہ دار شاخ نے بھی رابن پر مخبر کے قانون کے اطلاق کے واضح امکانات کو نظر انداز کر دیا۔ شبک عین قتل کی واردات وقوع پذیر ہونے تک یہی کہتی رہی کہ اگر رابن کو قتل کرنے کی کوشش ہوئی بھی تو مسلم انتہا پسند کریں گے۔ اگست 1998ء کے آخر تک اسرائیلی ذرائع ابلاغ کثرت سے شبک کی اس وارننگ کو نشر کرنے لگے کہ غربی کنارے کے مزید 13 فیصد علاقے سے اسرائیلی انخلا کے معاہدے کی وجہ سے نیتن یاہو، وزیر دفاع موردیکائی اور دوسرے وزیروں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اس وارننگ کی بنیاد بھی وہی منطق تھی جو رابن کے قتل کا پیش خیمہ بنی تھی۔

رابن کے قتل کے بعد یہودی خفیہ تنظیم حرکت میں آ گئی۔ یروشلم کے نزدیک خفیہ تنظیم کے اراکین نے جمعے کے دن عربوں کی بسوں کے نیچے بم نصب کر دیئے۔ بموں میں گھڑیاں بھی نصب تھیں، تاکہ وہ سبت کی شام کے بعد پھٹیں۔ سبت کے دن یہودی مذہبی قانون کے مطابق بس پر سفر کرنا منع اور گناہ ہے۔ اتفاق سے پہلے عرب بسوں میں بہت سے اسرائیلی سفر کرتے تھے۔ بموں کے پھٹنے کے وقت جن لوگوں نے ان بسوں میں نہیں ہونا تھا، یقیناً وہ مذہبی تھے۔ یہودی خفیہ تنظیم کے اراکین نے اپنے اقدامات کے لیے ربیوں سے پیشگی اجازت لی ہوئی ہے۔ پیریز، رابن اور شامیر نے اس وقت نیشنل یونٹی حکومت کے معاہدے کے مطابق پولیس کو حکم دیا تھا کہ انتہا پسند ربیوں کے خلاف ہونے والی تفتیش روک دی جائے۔ کسی ربی نے ان بموں کی تنصیب کے مذہبی جواز دینے کی مخالفت نہیں کی۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کچھ ربیوں نے غیر یہودیوں کے قتل کی اجازت دے دی اور کچھ اس حوالے سے خاموش رہے۔ یدیوت اہرونوت نے اپنی 16 نومبر 1995ء کی اشاعت میں لکھا کہ ربی ناہوم

رابینووٹز نے تجویز دی ہے کہ اسرائیلی فوج نے جن بستیوں کو خالی کرنے کی دھمکی دی ہے، ان کے گرد دھماکہ خیز مواد اور بارودی سرنگیں بچھادی جائیں۔ اس تجویز کے لیے بھی وہی جواز دیا گیا۔ جب ربی رابینووٹز سے پوچھا گیا کہ اس سے یہودی فوجیوں کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو جائے گا تو اس نے جواب دیا: "اگر وہ کسی یہودی بستی کو مٹانے کے احکامات پر عمل کرتے ہیں تو پھر وہ برے یہودی ہیں" اور یوں موت کے سزاوار ہیں۔ اس کو غیر یہودیوں اور سیکولر یہودیوں کی دوجہتی نفرت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، جس کا پرچار کچھ عرصے سے آبادکار ربی کر رہے ہیں۔

بہت سے اسرائیلیوں سمیت خود رابن نے اس خطرے کو جانتے بوجھتے نظرانداز کیا۔ اس کی وجہ ہمارے خیال میں یہودی شاونزم ہے، جو کہ یہودیوں پر بہت زیادہ غالب ہے۔ شاونیت پسند اپنی تاریخ کو حقیقت سے بہتر ظاہر کرنے کے لیے دروغ بیانی کرتے ہیں کہ ان کی قوم سب سے بہتر ہے۔ بیشتر یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے، جو اس وقت خصوصاً زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے، جب اس میں مذہبی جنون اور ارادی نظرانداز ی مل جاتے ہیں۔ یہودی شاونزم خصوصاً شدید ہے کیونکہ بیشتر یہودی طویل عرصے سے یہودی مذہب اور یہودی قومیت کو مساوی تصور کرتے آئے ہیں۔ اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کو یہودیت میں باہر سے لایا گیا ہے۔ جدید ریاست کے ظہور سے پہلے یہودی کمیونٹیوں پر ربیوں کی حکومت ہوتی تھی، جو آمرانہ حکومتوں جیسے سفاکانہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ یہودی بنیاد پرستوں کی سب سے بڑی خواہش اسی صورت حالات کو دوبارہ لے آنا ہے۔

تالمود میں مخبر کی سزا اور ہلاکت کا بیان واضح نہیں ہے۔ اس کی کسی حد تک ذمہ داری رومنوں اور ساسانیوں کے خوف پر بھی ہے۔ یہی صورت حال عراق کے گیونم کے زمانے میں موجود تھی۔ یہ زمانہ 750ء سے 1050ء تک عباسی خلافت کے تحت گزرا تھا۔ گیونم کے جوابات میں مخبروں کا ذکر شاذ ہی ملتا ہے اور زیادہ سے زیادہ مذہبی سزائیں دی گئی ہیں۔ آصف نے The Punishments صفحہ 49 پر لکھا ہے کہ ربی ہیلوئی نے نویں صدی کے وسط میں بیان کیا کہ حقیقتاً مخبری کرنے والا یہودی ہی مخبر نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے یہودی سے لڑنے والا یہودی بھی، جو اسے عوام میں کہے کہ میں مخبری کر دوں گا۔ تاہم ہیلوئی ایسے شخص کو "برے" کا خطاب دیتا ہے اور سزا صرف یہ تجویز کرتا ہے کہ ایسا شخص گواہی نہیں دے سکتا۔ مسلم سپین میں گیارھویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اموی خلافت کے انہدام کے بعد صورت حال مختلف تھی اور مخبروں کو عموماً سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ لیسینا میں، جہاں گیارھویں صدی کے وسط میں بہت زیادہ یہودی رہتے تھے، ربی یوسف ہلیوی ابن ہمگش نے مخبر کو یوم کپور کے موقعہ پر سنگسار کرنے کا حکم دیا، اس روز اتفاق سے سبت بھی تھا۔ سنگساری کو عموماً یوم کپور اور سبت کی خلاف ورزی مانا جاتا ہے۔ ایسے موقعے پر مخبر کو سنگسار کرنے کا حکم دینے کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ تمام یہودیوں کو

آگاہ کردیا جائے کہ یہودی مخبروں کو ہلاک کرنا سب دوسرے مذہبی احکامات سے اہم ہے۔ آصف نے "مشنا" کی ابن میمون کی مستند شرح سے ایک عبارت اپنی کتاب The Punishments کے صفحہ 63 پر درج کی ہے: "مغرب (سپین اور شمالی افریقہ) کا معمول ہے کہ یہودیوں کی دولت کے بارے میں غیر یہودیوں کو مخبری کرنے والے یہودی کو ہلاک کردیا جاتا ہے یا ان کے خلاف غیر یہودیوں کو مخبری کردی جاتی ہے تاکہ وہ انہیں یا تو زدوکوب کریں یا ہلاک کردیں۔" بعد میں یہ ایک اہم نظیر بن گئی کہ جن معاملات میں یہودی اتھارٹیز ضروری سمجھیں ان کے لیے مخبری کرنا درست ہے۔ صرف مخبری کرنے والے یہودی افراد کو ہلاک کردیا جانا چاہیے۔"[17]

ابن میمون اپنی مذکورہ بالا شرح کے ایک دوسرے حصے میں لکھتا ہے کہ مغرب کے تمام شہروں میں مخبروں اور کافروں کو ہلاک کرنے کی روایت ہے۔ بیشتر سپین پر عیسائیوں کے دوبارہ قبضے کے بعد باقی رہ جانے والی گریناڈا کی مملکت میں مخبروں کو ہلاک کرنے کا رواج زیادہ ہوگیا۔ سپینی ربیوں کے جوابات میں ایسے واقعات کے لاتعداد حوالے ملتے ہیں۔ آصف نے اپنی کتاب The Punishments صفحہ 73 پر ربائی آشر کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نے ایک بدنام مخبر یہودی کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں کہا کہ مخبروں کو سزائے موت دینے کے لیے مذہبی عدالت کو کسی شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف دوسرے یہودیوں کا اتنا بیان دینا کافی ہے کہ فلاں شخص مخبر ہے "اگر ہم شہادت کو ضروری قرار دے دیں تو کسی بھی شخص کو مجرم قرار نہیں دیا جاسکے گا۔" (یہی منطق عیسائی مذہبی عدالتوں اور جدید آمرانہ ریاستوں نے اپنائی تھی اور 1967ء سے اسرائیل نے مقبوضہ علاقوں میں اپنائی ہوئی ہے)۔ ربائی آشر شمالی فرانس سے سپین آیا تھا۔ وہ اس وقت تک ایک مشہور ربی بن گیا تھا۔ امکان یہی ہے کہ سپینی یہودیوں کے ساتھ ساتھ اشکنازی کی روایات سے بھی واقف تھا۔ اس لیے وہ یہودیوں اور ان کی دولت کے بارے میں تین مرتبہ مخبری کرنے والے یہودی کو موت کی سزا دینے کا کہہ سکتا تھا۔ آشر کہتا ہے کہ ایسا اس لیے ضروری ہے تاکہ یہودیوں میں مخبروں کی تعداد بڑھنے نہ پائے۔ اس معاملے پر مزید گفتگو کرنے کے بعد آخر میں وہ کہتا ہے کہ مخبروں کو سزائے موت دینا ایک نیکی ہے۔ خدا کے تمام دشمنوں کو فنا کردینا چاہیے۔ ایک اور معاملے میں ربی آشر کو ایک یہودی کے بارے میں بتایا گیا کہ اس نے کئی مرتبہ یہودیوں کی مخبری کی ہے۔ ربی آشر نے کہا کہ مخبر کو ہلاک کرنا ضروری ہے خواہ یوم کپور اور سبت ایک ہی دن آرہے ہوں۔ اس نے کہا کہ جرمنی اور فرانس میں ایسا ہی ہوچکا ہے۔ ربی آشر کے بیٹے ربی یہودا کا ایک پرانے مخبر کے بارے میں کہنا تھا کہ جو شخص اسے قتل کرے گا اسے خدا انعام دے گا۔ ایک اور معاملے میں ربی یہودا نے کہا کہ اگر غیر یہودی جج کسی یہودی مخبر کو سزائے موت نہ دیں تو یہودیوں کو خود اسے موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ بعض معاملات میں ایسا ہوا کہ یہودیوں نے بادشاہ کو پیسے دے کر مخبر کو خرید لیا اور پھر اسے سرعام سزائے موت دے دی۔ مثال کے طور پر ایسا ایک واقعہ اپریل 1279ء میں بارسلونا میں رونما ہوا۔ وڑالان ڈی پورتا نامی ایک یہودی کو

مخبری کرنے کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اسے بادشاہ پیڈرو دوم آف آراگون سے خرید لیا گیا۔ بارسلونا کے یہودیوں نے سرعام اس کی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ سزائے موت کے تین سال بعد مرحوم کے بھائیوں نے سزا کے خلاف احتجاج کیا۔ ربی شلومو ایڈریٹ نے کہا کہ یہ فیصلہ درست تھا اور آراگون اور کیسٹائل میں ایسے ہی فیصلے اکثر دیے جاتے ہیں۔ اس نے جرمنی سے بھی اس زمانے کے ایک اہم ربی مائر آف روتھمبرگ (مہارام) سے بھی فیصلے کی تائید حاصل کی۔ سولھویں صدی کے پولش ربی شلومو لیوریا نے مخبر کے قانون کی تائید کی ہے: ''مخبر کو نہ صرف مذہبی عدالت سزائے موت دے سکتی ہے بلکہ کوئی بھی یہودی اسے قتل کر سکتا ہے اور ایسے یہودی کو خدا انعام دے گا۔'' یہی بات بے شمار ربیوں نے کہی ہے۔

سپین کے یہودی چودھویں صدی تک مخبروں کو سزائے موت یا اعضا کاٹنے کی سزا دیتے تھے۔ سپین کے یہودیوں سے متاثر شمالی افریقہ اور پرتگال کے یہودی بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ سپین سے الجزائر نقل مکانی کرنے والے ربی شمعون نے مخبر کو قتل کرنے کو ایک مقدس فریضہ قرار دیا تھا۔ ربی شمعون نے کہا تھا کہ اگر مخبر کو ہلاک کرنا ممکن نہ ہو تو اسے کوڑے مارے جانے چاہئیں یا ماتھے کو داغ دینا چاہیے اور تمام یہودی کمیونٹیوں میں اس کا نام ایک مخبر کی حیثیت سے مشہور کر دیا جانا چاہیے۔

شمالی فرانس اور جرمنی میں رہنے والے ابتدائی اشکینازی کے مخبروں کو قتل کرنے کا ریکارڈ تیرھویں صدی کے بعد نہیں ملتا۔ شاید اس کی وجہ یہودی خودمختاری کا کم اور غیر یہودی ریاستوں کی طاقت کا زیادہ ہونا تھا۔ رابینو آشر نے لکھا ہے کہ اس کے زمانے میں جرمنی میں مخبروں کو قتل کر دینا عام تھا۔ تاہم اس نے اس کا ثبوت بہت تھوڑا دیا ہے۔ آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 107 پر شمالی فرانس کے ربیوں کے ایک خصوصی اجلاس کا احوال لکھا ہے جس میں ''اپنی کمیونٹی کے جرائم پیشہ افراد'' کو زیر بحث لایا گیا تھا۔ آصف نے صفحہ 107 پر ہی ربی مائر آف روتھمبرگ کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ مخبر کو ہلاک کیا جا سکتا ہے یا اس کی زبان کاٹی جا سکتی ہے۔ یہ تیرھویں صدی کے اواخر کی بات ہے۔ آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 108 پر لکھا ہے کہ سٹراسبرگ کے ربی سیموئیل شلٹ شٹیٹ نے ایک مخبر کو سزائے موت دی۔ یہ معاملہ مخبر کے دوست بادشاہ تک لے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ربی کو کئی سال حکام سے پوشیدہ رہنا پڑا۔ بعد ازاں وہ جرمنی سے فرار ہو کر عراق چلا گیا۔ یہاں اس نے عراقی یہودی کمیونٹی کے صدر ڈیوڈ ولا ہودایا سے اپنے مخالفین کو برادری باہر کرنے کا حکم نامہ حاصل کیا اور جرمنی چلا گیا۔ اس کہانی کا انجام کیا ہوا، یہ معلوم نہیں ہے۔ اس زمانے کے بعد سے مخبروں کی ہلاکت کے بجائے برادری باہر کرنے کا ریکارڈ ملتا ہے۔

سولھویں صدی کے پولینڈ کے اشکینازی یہودیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات دستیاب ہیں۔ یہ یہودی کمزور حکومت کی وجہ سے بہت زیادہ خودمختار تھے۔ اسی وجہ سے مخبروں کی ہلاکت کے واقعات بھی زیادہ

ہوئے۔ آصف اپنی کتاب The Punishments کے صفحہ 122 پر لکھتا ہے کہ ربی شلوموليوريا نے مخبروں کو ہلاک کردینے کا حکم دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا:

> مخبروں کی زبان کاٹنے سے زیادہ بہتر ہے کہ انہیں قتل کردیا جائے تا کہ برائی ہم میں سے ختم ہو جائے۔ اس بات کا امکان ہے کہ جس مخبر کا کوئی عضو کاٹا جائے گا، وہ انتقاماً عیسائی ہو جائے گا اور یہودیوں کے بارے میں غلط سلط باتیں کرے گا۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ مخبروں کے اعضا کے کاٹنے سے یہودیوں کو بہت تکلیفیں سہنا پڑیں۔

سترہویں صدی کے ابتدائی برسوں کے بعد پولینڈ کے ربی اور آزاد یہودی اتھارٹیز مخبروں کو قتل کرنے کے حوالے سے اپنی تحریروں میں محتاط زبان استعمال کرنے لگے۔ ایک مخبر کے معاملے میں لتھوانیائی یہودیوں نے فیصلے میں عبرانی لفظ "Hatarat Dan" (خون بہانا) استعمال کیے تھے۔ آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 129 پر اس فیصلے پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد سے یہ الفاظ ایسے فیصلوں میں عام استعمال ہونے لگے تھے۔

> یہودیوں کی دولت کے بارے میں مخبری کرنے یا ان کے جسمانی نقصان کا باعث بننے والے یہودی کے حوالے سے قوانین واضح ہیں۔ ہر یہودی ان سے واقف ہے۔ ہم صرف انتباہ دے رہے ہیں، ہم ہر یہودی کو حکم دیتے ہیں کہ جب وہ کوئی ایسا عمل ہوتا دیکھیں یا سنیں تو تین دن کے اندر اندر دو معزز شہریوں کو اس کی اطلاع کریں۔ ایسا نہ کرنے والے یہودی کو ذات باہر کردیا جائے۔ اطلاع ملنے پر دونوں معزز وہی کریں گے جو انہیں کرنا چاہیے۔ اگر مخبر ان دونوں سے زیادہ طاقتور ہو تو وہ ربیوں کے ساتھ مل کر اس کا نام شہر کے کرانیکل میں درج کریں گے تا کہ اس کے بیٹوں کے ختنہ نہ کیے جائیں، کوئی اس کی بیٹیوں سے شادی نہیں کرے نیز اسے تمام مقدس معاملات سے خارج کردیا جائے۔ ربی اس پر نظر رکھیں گے اور انتقام لینے کے لیے موقع کا انتظار کریں گے۔

اس تحریر کی زبان براہ راست نہیں ہے اور محتاط ہے۔ پولینڈ کی ایک دوسری مثال کراکو کی یہودی کمیونٹی کے کرانیکل سے ملی ہے۔ آصف نے اپنی کتاب کے صفحہ 133 پر اسے درج کیا ہے۔ اس کرانیکل میں ربی اہارون ویلٹشکر کے بیٹے یسرائیل کی مذمت کی گئی ہے جس نے یہودیوں کے مالی معاملات کی مخبری کی تھی۔ مذمت میں لکھا گیا ہے:

> ہم یعنی کمیونٹی کے معززین اور ہم یعنی سب سے زیادہ قابل احترام (مذہبی عدالت)،

خدا ہماری حفاظت کرے، اس کے خاندان کا احترام کرتے ہوئے اس کی سزا کو گھٹا رہے ہیں۔ چنانچہ ہم اسے صرف تمام عبادت گاہوں میں داخل ہونے اور مذہبی عدالت میں شہادت دینے سے روکتے ہیں۔ اس کے گلے میں لوہے کا طوق ڈال دیا جائے۔ اس کی تمام جائیداد کو ضبط کیا جاتا ہے۔

اس کو شہر بدر بھی کر دیا گیا تھا۔ اس کی کسی اولاد کو بھی شہر میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ یہ فیصلہ 1772ء کے موسم بہار میں جاری ہوا تھا۔ پولینڈ کی تیسری مثال ایک اہم پولش مذہبی پیشوا ربی متاتیا کے بیٹے ربی بن یامین کی تالمودی کتاب Tahrat Kodesh سے لی گئی ہے۔ یہ کتاب 1733ء میں شائع ہوئی تھی۔ آصف نے اپنی کتاب The Punishments صفحہ 133 پر اس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ربی بن یامین شکوہ کرتا ہے کہ اس کے زمانے میں تمام تر سخت ترین سزاؤں اور ہلاکتوں کے باوجود مخبروں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس نے یہودیوں کو مخبروں سے گریز کرنے کا کہا۔ اس نے کہا کہ اس کا علاج صرف یہی ہے کہ "ان سب کو قتل کر دیا جائے۔" ربی بن یامین نے ان مخبروں سے خیراتی مالی امداد حاصل کرنے سے بھی منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ مخبروں کو ہلاک کرنے کے بعد یہودی اپنی حفاظت پر اٹھنے والے بھاری اخراجات سے بچ جائیں گے۔ تاہم بعد کی شہادتوں سے عیاں ہوتا ہے کہ انیسویں صدی تک مخبروں کا مسئلہ ان تجاویز کے باوجود حل نہیں ہوا تھا۔

1795ء میں پولش لتھوانیائی دولتِ مشترکہ کے روس، آسٹریا اور پروشیا میں بٹ جانے کے بعد یہودی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا اور یہودیوں پر یہودیوں کے، خصوصاً یہودی اتھارٹیز کے تشدد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پولینڈ کے روسی علاقوں میں خفیہ طور پر تشدد جاری رہا، پروشیائی علاقے میں حقیقتاً ختم ہو گیا اور آسٹریائی علاقے میں کچھ جدیدیت پسند ربیوں کو قتل کرنے کے واقعات ہوئے۔

منقسم پولینڈ کے تین حصوں میں یہودیوں کے داخلی تشدد کی تین مختلف سطحیں مذکورہ تقسیم کے بعد جدید اثرات کی تین سطحوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ پروشیائی علاقے میں بادشاہت مطلق تھی، انتظامیہ اہل اور جدید اثرات و رجحانات کی حامل تھی جبکہ پولیس بھی بہت مستعد تھی۔ پولینڈ کی پہلی تقسیم اس وقت رونما ہوئی تھی جب والٹیئر اور روشن خیالی کے زمانے کے دوسرے فلسفیوں کا دوست فریڈرک دوم پروشیا کا بادشاہ تھا۔ 1786ء میں فریڈرک دوم کی وفات کے بعد روشن خیالی کے اثرات کم از کم ایک نسل تک برقرار رہے۔ یہودی روشن خیالی کا آغاز بھی پروشیا سے ہوا تھا۔ برلن میں بہت زیادہ یہودی روشن خیال موجود تھے جنہوں نے جرمن کے علاوہ عبرانی میں بھی بہت زیادہ تحریریں چھوڑی ہیں۔ اسی لیے پروشیا سے ملحقہ علاقوں کے مرد یہودی ان کے خیالات کو سمجھ سکتے تھے۔

پولینڈ کے روسی علاقے کے یہودی نسبتاً پسماندہ حکومت کے تحت تھے، جس کی انتظامیہ نااہل اور کمزور تھی، حالانکہ کیتھرین دوم دی گریٹ نے روشن خیالی کو کافی رائج کیا تھا۔ روس ایک ایسا ملک تھا جس میں کئی سو سال تک یہودی موجود نہیں تھے۔ زار سلطنت میں رہنے والے اولین یہودی پولش تھے۔ روس کا بدنام علاقہ ''پیل'' (Pale) جہاں 1917ء تک یہودی آباد تھے، روس سے ملحق پولش لتھوانیائی دولتِ مشترکہ کا علاقہ تھا۔ ''قدیم روس'' یہودیوں پر ممنوع ہی رہا۔ یہودیوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے روسیوں میں بالخصوص روسی چرچ لیڈروں میں سامیت دشمنی کی مضبوط روایت موجود تھی۔ 1800ء میں کسی بھی دوسرے ملک کے مقابلے میں روس میں سامیت دشمنی بدترین تھی۔ پولینڈ پر قبضے کے ساتھ ہی زار حکومت نے یہودیوں پر خصوصی ٹیکس عائد کر دیئے، جو 1905ء تک وصول کیے جاتے رہے۔ اس کے علاوہ یہودیوں سے دوسرے امتیاز بھی روا رکھے گئے۔ یہودیوں کے لیے ممنوع پیٹرز برگ اور ماسکو کے علاوہ بڑے شہروں کے نہ ہونے، نیز یہودیوں میں تعلیم کی کمی نے انہیں 1880ء کی دہائی تک پرانی رسوم کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔ پرانی رسوم میں کافروں اور مخبروں کو سزائے موت دینا بھی شامل ہے۔ تاہم روسی حکمرانی میں روشن خیال یہودی اقلیت کو ان رسوم پر تنقید کرنے کی آزادی تھی۔ روسی حکومت نے، اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود، روشن خیال یہودیوں کو پہلے سے زیادہ تحفظ دیا۔ آسٹریا کے زیر قبضہ علاقے میں صورتِ حال پروشیا اور روس والی صورتِ حال کے مقابلے میں درمیانی تھی۔ 1867ء کے بعد یہودی پروشیا کے یہودیوں والی صورتِ حال میں آ گئے تھے اور 1871ء میں جرمن اتحاد کے بعد جرمن ماڈل والی صورتِ حال میں۔ *18 آسٹریا اور ہیپسبرگ حکمران مضبوط سامیت دشمن رجحانات رکھتے تھے، جو ماریا تھیریسا (1740-80ء) کے دور میں زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ اٹھارہویں صدی کے یورپ کی شاید سب سے زیادہ یہودی دشمن حکمران تھی اور نازی عہد سے پہلے یہودیوں کے سب سے بڑے اخراج کی ذمہ دار۔ اس نے 1745ء میں پراگ اور دیگر بوہیمیائی قصبوں سے 70000 کے لگ بھگ یہودیوں کو نکال دیا تھا۔ اپنے اتحادیوں برطانیہ اور ہالینڈ کے احتجاج پر اسے تھوڑے عرصے بعد اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا تھا۔ اس کے جانشین جوزف دوم نے 1782ء میں یہودیوں کو محدود حقوق دے دیئے۔ اس کے اس اقدام کی اچھی خاصی مخالفت ہوئی تھی۔ *19 1790ء میں جوزف کی وفات کے بعد دونوں رجحانات دبتے ابھرتے رہے۔ 1867ء میں شہنشاہ فرانز جوزف نے ایک یہودی دوست پالیسی اپنائی۔

نئے اسرائیلی مورخوں نے شواہد کے ساتھ بتایا ہے کہ زار سلطنت میں 1880ء کی دہائی تک یہودیوں نے لاتعداد مخبروں کو قتل کر دیا تھا۔ روزن نے نئے اسرائیلی مورخوں کے حوالے سے لکھے گئے اپنے مضمون میں شال گنز برگ کا حوالہ دیا ہے، جس نے اپنی آپ بیتی میں لکھا تھا کہ انیسویں صدی کے دوران ''پیل'' میں بہنے والے سب سے بڑے دریا میں سینکڑوں مخبروں کو ڈبو دیا گیا۔ ان لوگوں پر مخبری کے قانون کا اطلاق صرف اس شبہے

کے تحت کیا گیا تھا کہ انہوں نے حکام کو کچھ نہ کچھ بتایا ہے۔ روزن لکھتا ہے "اور راہام کوہن کی طرح ان میں سے کچھ لوگ یہودیوں کو جدید زندگی کی طرف لانا چاہتے تھے۔" ڈاکٹر ڈیوڈ آصف نے ان میں سے کچھ مقدمات پر تحقیق کے بعد لکھا ہے "ان میں سے کچھ مخبر پروفیشنلز تھے جنہوں نے حکام کو ٹیکس چوری کے حوالے سے معلومات فراہم کی تھیں۔" جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ یہودی مخبروں کو اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر خفیہ طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ صدیوں پرانا ہے اور اب سے کچھ عرصہ پہلے تک استعمال کیا جاتا تھا۔ [20*] روزن نے آصف سے پوچھا کہ کیا یہودی کمیونٹی ان مخبروں کو غدار تصور کرتی تھی؟ آصف نے جواب دیا:

> روشن خیال یہودی انہیں غدار تصور نہیں کرتے تھے۔ روشن خیال یہودی تو چاہتے تھے کہ یہودی ریاست کے شہری بن جائیں۔ اسی خیال کے تحت وہ ٹیکس ادا کرتے تھے اور فوج میں ملازمت کرتے تھے۔ حکام کو معلومات فراہم کرنا وہ کئی معاملات میں اپنے خیال کے مطابق ضروری سمجھتے تھے۔ اگر تم اسرائیل کی موجودہ (رابن کے قتل کے ایک سال بعد کی) صورتِ حال سے ماضی کی صورتِ حال کا موازنہ کرو تو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے۔

آصف نے روزین شہر کے ہیسیڈی ربی اسرائیل فرائیڈ مین کے حوالے سے صورتِ حال کی وضاحت کی ہے، جسے "روزین کا مقدس انسان" کہا جاتا ہے۔ فرائیڈ مین ایک نمایاں ہیسیڈی شخصیت ہونے کے حوالے سے اہم ہے کیونکہ قتل و غارت گری میں ہیسیڈی تحریک نے ایک بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ آصف کہتا ہے:

> فرائیڈ مین ایک بڑا ہیسیڈی لیڈر تھا۔ یہودی تاریخ کی کتابوں میں اسے کم عالمانہ لیکن ایک طاقتور شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جو زندگی کی مسرتوں سے لذت اندوز ہوتا تھا۔ یوکرائن کے علاقے پوڈولیا کے شہر اوشتر کے کچھ مخبروں کو سزا دلانے میں اس نے سرگرم کردار ادا کیا تھا۔ فروری 1836ء میں ان میں سے ایک شخص یتزاک اوکسمین کی لاش منجمد دریا میں برف کے نیچے پائی گئی۔ لاش کے اعضا کاٹ دیئے گئے تھے اور اس پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ پہچان مشکل ہو گئی تھی۔ ایک اور شخص شموئیل شوائز مین غائب ہو گیا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ اس کو سیناگوگ میں عبادت کے دوران گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔ اس کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کمیونٹی کے حمام کی بھٹی میں جلا دیا گیا تھا۔ پولیس تفتیش ہوئی، جس میں زار نکولائی اول نے بھی دلچسپی لی تھی۔ پولیس تفتیش سے اصل واردات کا پتہ چل گیا۔ یہ واردات خفیہ مذہبی عدالتوں کے ان لکھے سزائے موت کے فیصلے کی ایک مثال ہے۔ گیلیشیا کے روشن خیال یہودیوں کے ایک

سربراہ نے یوسف پرل ربی یسرائیل آف روزین کو مجرم ٹھہرانے کے لیے روسی حکام کو خفیہ طور پر اطلاعات فراہم کی تھیں۔

روزن لکھتا ہے کہ پرل کے اقدامات کا محرک نظریاتی تھا۔ اس نے نئے اسرائیلی مورخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہیسیڈی معاشی مفادات کے لیے ایک دوسرے سے الجھے رہتے تھے۔ وہ لکھتا ہے: ''چونکہ ہیسیڈی اپنے مقدس افراد کو دولت دیا کرتے تھے۔ یہ مقدس افراد انیسویں صدی میں اس طرح کی شاہانہ زندگی بسر کرتے رہے کہ جو اس وقت کے بادشاہوں کے برابر تھی۔ ایسے مقدس لوگ اس قسم کے معاملات میں بنیادی کردار ادا کرتے تھے۔''

ماقبل جدید یہودی تاریخ داخلی یہودی تشدد کے واقعات سے بھری پڑی ہے' جن میں سے مذکورہ بالا واقعات بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ چند واقعات یہ دکھانے کے لیے کافی ہیں کہ اسرائیل میں ہیسیڈی اور مسیحانہ یہودی بنیاد پرستی جدیدیت کے آغاز اور یہودی خودمختاری سے پہلے والی صورتِ حال کی طرف واپسی چاہتی ہے۔ یہودی بنیاد پرستی اور دیگر بنیاد پرستیوں میں فرق نہیں ہے۔ حقیقی نیت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کچھ باتیں گھڑلی گئی ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے غالب سوچ مفروضہ طور پر ''اچھے زمانے'' کی طرف واپسی ہے، جب ہر کام درست انداز میں ہوتا تھا۔ مسیحانہ بنیاد پرستی جدید ذرائع استعمال کر کے روایتی طرزِ زندگی کو موثر انداز میں دوبارہ رائج کرنا چاہتی ہے۔ حکومت کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے اسرائیل میں بنیاد پرستی کے خطرات بہت زیادہ ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کے غیر یہودیوں، عربوں اور بالخصوص فلسطینیوں کے لیے مسیحانہ بنیاد پرستی بہت خطرناک ہے۔ مقبوضہ علاقوں میں یہودی مذہبی آبادکاروں کے کردار سے اس کی خطرناکی نہایت واضح ہو چکی ہے۔ تاہم بنیاد پرستی کے کسی بھی عقیدے کو تسلیم نہ کرنے والے اسرائیلی یہودیوں کے لیے یہودی بنیاد پرستی کی ہر قسم خطرناک ہے۔ یہودی بنیاد پرستوں کا رویہ غیر یہودیوں کی نسبت کافروں کے حوالے سے بہت برا ہے۔ یہ صورتِ حال دوسرے مذاہب کی صورتِ حال سے ملتی جلتی ہے۔ اس کی ایک معاصر مثال بہائیوں کے ساتھ ایرانیوں کا رویہ ہے، جنھیں مسلم کافر تصور کرتے ہیں۔ انھیں عیسائیوں اور یہودیوں سے زیادہ برے سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں پختہ یقین ہے کہ اگر اسرائیل میں بنیاد پرست حکومت قائم ہوگئی تو وہ اپنے عقائد کو نہ ماننے والے یہودیوں کے ساتھ فلسطینیوں سے زیادہ برا سلوک کرے گی۔ یہ کتاب یہودی بنیاد پرستی کی تفہیم کی ایک کوشش ہے اور امید ہے کہ یہ اس خطرے کو حقیقت بننے سے روکنے میں مدد دے گی۔



کتابیات اور متعلقہ معاملات پر نوٹ

کسی معاشرتی مظہر پر لکھی گئیں کتابوں میں عموماً کتابیات کی ایک فہرست یا مضمون ہوتا ہے، جس میں مصنفین اپنے بنیادی اور ثانوی مآخذ کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ گزشتہ کچھ برسوں میں ہم نے ریاستِ اسرائیل اور یہودیت کے حوالے سے لکھی گئیں انگریزی اور عبرانی کی بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنی کتاب میں انگریزی کتابوں کے بہت کم حوالے دیں گے۔ ہم نے بنیادی طور پر اسرائیلی عبرانی اخبارات، بنیادی یہودی مذہبی (اور چند مثالوں میں ادبی) متون اور اسرائیلی رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے کچھ عالمانہ عبرانی مضامین کے حوالے دیئے ہیں۔ ہم نے اپنے متن میں ان کی نشاندہی کردی ہے۔ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کے حوالے سے عبرانی سے بہت زیادہ معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس موضوع پر عبرانی کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے ان بہت ساری کتابوں کو نظر انداز کیوں کیا ہے۔

ہمارا ایقان ہے کہ یہودیت اور اسرائیل کے حوالے سے انگریزی میں شائع ہونے والی زیادہ تر کتابوں میں اپنے موضوع کے حوالے سے مغالطہ آفرینی کی گئی ہے۔ یہ مغالطہ آفرینی بعض کتابوں میں جان بوجھ کر جھوٹ لکھ کر کی گئی ہے اور بعض کتابوں میں سہواً ایسا ہوا ہے۔ اس زمرے میں آنے والی زیادہ تر کتابیں آمرانہ نظاموں میں لکھی جانے والی کتابوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ہم انگریزی میں اسرائیل اور یہودیت پر لکھی جانے والی کتابوں کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ سٹالن کے دور میں یا سٹالنسٹوں کے دور میں سوویت یونین کے بارے میں لکھی گئیں کتابیں، خمینی کے پیروکاروں کی ایران کے بارے میں لکھی ہوئیں کتابیں، عیسائی بنیاد پرستی کے بارے میں اس کے پیروکاروں کی لکھی ہوئیں کتابیں اکثر درست اور قابل قدر معلومات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس کی مزید مثالیں بھی موجود ہیں۔ ان کتابوں کو بے اعتبار بنانے والی حقیقت یہ ہے کہ ان میں جان بوجھ کر حقائق

کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہودیت اور اسرائیل کے حوالے سے تو یہ عمل اسرائیل کے باہر انگلش میں چھپنے والی لاتعداد کتابوں میں بڑے دھڑلے سے کیا گیا ہے۔ یہودی بنیاد پرستی کے حوالے سے حقائق چھپانے کی ویسی ہی معذرت خواہانہ وجوہات پیش کی جاتی ہیں جیسی کسی بھی آمرانہ نظام میں ادبی فروگزاشتوں پر پیش کی جاتی ہیں۔ عبرانی میں دستیاب معلومات سے انگریزی میں چھپائے گئے حقائق کو جانا جا سکتا ہے۔ عبرانی اخبارات نے یہودی بنیاد پرستی کے حوالے سے زیادہ مکمل اور غیر مبہم معلومات فراہم کی ہیں، کیونکہ جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب میں دکھایا ہے یہودی بنیاد پرستی اسرائیلی یہودیوں کی اکثریت کے طرز زندگی اور عقائد کے لیے خطرہ ہے۔ اگر یہودی بنیاد پرستی مضبوط ہوئی تو یہ اسرائیلی جمہوریت کے لیے خطرناک ہوگی۔ یہ خطرہ اسرائیل کے باہر نہیں پایا جاتا۔ جہاں آباد یہودی، یہودی بنیاد پرستی کی بدترین صورتوں کی حمایت کرتے ہوئے بھی جمہوریت اور تکثیریت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں ریاستِ اسرائیل میں خامیاں تھیں اور ہیں، جن کی وجہ صیہونیت پرستی اور یہودی بنیاد پرستی کے کھلے اور پوشیدہ اثرات ہیں۔ اسرائیل کا یہودی بنیاد پرست ریاست بننا یہودیوں، فلسطینیوں اور شاید پورے مشرقِ وسطیٰ کے لیے خطرناک ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ بنیادی عبرانی مآخذ کے حوالے سے لکھی گئی اور اس خطرے کی درست نشاندہی کرنے والی یہ انگریزی کی پہلی کتاب ہے۔

ذیل میں ہم اسرائیل اور اسرائیل سے باہر آباد یہودیوں کی تاریخ کے جدیدیت سے پہلے اور بعد کے ایسے اہم معاملات پیش کر رہے ہیں جنھیں اسرائیل اور یہودیت کے حوالے سے لکھی گئیں انگریزی کتابوں میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ یہودی بنیاد پرستی سے متعلق ہیں۔ پہلے ہم یہودی بنیاد پرستی سے قریبی ربط رکھنے والے دو ایسے معاملات کا ذکر کریں گے جنھیں ہم نے اپنی کتاب میں بیان نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد ہم ایسے معاملات کو پیش کریں گے جن کا ذکر ہم نے تو اپنی کتاب میں کیا ہے لیکن انگریزی کی بے شمار کتابیں ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ 1999ء کے انتخابات میں یہ الزام سامنے آیا کہ لیبر پارٹی کے دروز اور عرب حصوں میں ووٹوں کی گنتی میں فراڈ کیا گیا ہے۔ ایسی باتوں سے تشویش پیدا ہونی چاہیے۔ امریکہ اور برطانیہ کی سیاسی پارٹیوں کو یہودی، غیر یہودی یا ایسے ہی دوسرے حصوں میں نہیں بانٹا جاتا۔ اسرائیلی عبرانی اخبارات پڑھنے والے جانتے ہیں کہ کوئی عرب یا دروز، یعنی اسرائیل کا غیر یہودی شہری، خواہ تل ابیب یا حیفہ میں رہتا ہو، لیبر پارٹی سے تعلق نہیں رکھ سکتا، اسے لازماً پارٹی کے دروزوں اور عربوں والے حصے سے تعلق رکھنا ہوگا۔ یہودی ان میں سے کسی حصے سے تعلق نہیں رکھ سکتے۔ نتیجتاً تل ابیب میں رہنے والا عرب صرف اپنے حصے کے لیے ووٹ دے سکتا ہے۔ لیبر پارٹی میں دوسرے حصے بھی موجود ہیں۔ کبوتزم حصہ ایک مثال ہے۔ ان حصوں کی رکنیت آبادی کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایک کبوتز تل ابیب میں آباد ہو جائے تو وہ لیبر پارٹی کی برانچ کا رکن بن سکتا ہے اور تل ابیب سے کسی کبوتز میں جانے والا خود بخود لیبر پارٹی کبوتز حصے کا رکن بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس لیبر پارٹی کا ایک عرب رکن زندگی بھر عرب ہی رہتا ہے۔ اس کو مذہبی حوالے سے ہی شمار کیا جاتا ہے۔ اگر امریکہ یا برطانیہ میں ایسا ہی عمل کیا جاتا تو اسے فوراً سامیت دشمنی قرار دے دیا جاتا۔ اسرائیل کے حوالے سے انگریزی کی لاتعداد

کتابوں میں اس حقیقت کا ذکر تقریباً غیر موجود ہے۔

اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے یہودی اوران کے ہمدرد دوسرے ملکوں میں یہودی اقلیت کے حقوق کے مطالبات اوراسرائیل میں غیر یہودی اقلیت کے حقوق غصب کرنے کی روش کا موازنہ نہیں کرنا چاہتے۔ہمیں یقین ہے کہ یہ یہودی بنیاد پرستی کا ایک ہتھکنڈہ ہے۔جیسا کہ ہماری کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کا معاشرے پر اثر بہت گہرا ہے۔اسرائیل کی ریاستی پالیسیوں پر اس کے اثرات اور بھی زیادہ گہرے ہیں تاہم چھپے ہوئے ہیں۔اسرائیل سے باہر آباد یہودیوں پر بھی یہودی بنیاد پرستی کا اثر بہت گہرا ہے۔دومزید وجوہات بھی ہیں۔ایک خفیہ وجہ یہ ہے کہ یہودی خودکو تمام اقوام سے برتر سمجھتے ہیں۔یہ تقریباً ہر شے کو''غیر یہودی'' کہہ کراس کی تحقیر وتذلیل کرنے والے یہودی بنیاد پرستوں کا ایک نہایت اہم عقیدہ ہے۔اگرچہ ہمیں یقین ہے کہ یہ نسل پرست نظریئے کا جزو ہے، جس کی ہم مخالفت کرتے ہیں، تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ بدقسمتی سے انسان، جن میں یہودی بھی شامل ہیں، تاریخی حالات کے زیراثر اکثر وبیشتر زینوفوبیائی (Xenophobic) رجحانات کے اثر میں آجاتے ہیں۔لہٰذا یہودیوں کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح دیکھا جاسکتا ہے۔اور یہودی زینوفوبیا کو مٹانے کے لیے اس کی موجودہ اور سابقہ شکلوں کو بے نقاب کرنا ضروری ہے۔ دوسری وجہ بائیں بازو کے مصنفوں کا رویہ ہے۔لیبر پارٹی کھلم کھلا نسل پرستی کو روا رکھتی ہے۔اسرائیل میں دائیں بازو کی سب سے اہم پارٹی لیکوڈ اتنا شدت سے نسل پرستی پر عمل پیرا نہیں ہے جتنا کہ عمومی طور پر لیبر پارٹی ہے۔ لیبر پارٹی کے برعکس عرب لیکوڈ کی براہ راست رکنیت بآسانی حاصل کرسکتے ہیں۔اس خاص حوالے سے اسرائیلی دائیں بازو کا لیبر پارٹی سے بہتر رویہ بائیں بازو کے لکھاریوں کے لیے نفرت کا باعث ہے، بالکل اسی طرح جیسے 1930ء کی دہائی میں برطانیہ کی بہت سے اچھائیاں سٹالنسٹوں کو نفرت انگیز محسوس ہوتی تھیں۔

ایسا ہی معاملہ اسرائیل میں کبوتز کی رکنیت کا ہے۔بائیں بازو کے اسرائیلی کبوتز کی بہت ستائش کرتے ہیں۔جو غیر یہودی کبوتز کے رکن بننا چاہتے ہوں انہیں نہ صرف کبوتز کے اراکین کی منظوری لازماً حاصل کرنا ہوتی ہے بلکہ اپنا مذہب چھوڑ کر یہودیت قبول کرنا پڑتی ہے۔جو غیر یہودی کبوتز میں شامل ہونا چاہتے ہوں ان کے لیے اسرائیل کے چیف ربی نے سکول کھولے ہوئے ہیں۔یہودیت قبول کرنے والی عورتوں پر لازم ہوتا ہے کہ انہیں ننگی ہوکر تین ربیوں سے پاکیزگی کا غسل لینا پڑتا ہے۔عبرانی اخبارات نے بتایا ہے کہ آج تک ایک بھی فلسطینی کبوتز کا رکن نہیں بنا۔انگریزی زبان کی کتابوں میں یہودی بنیاد پرستی کے اس اثر کو تقریباً بالکل بیان نہیں کیا گیا ہے۔ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر امریکہ یا برطانیہ کا کوئی ادارہ داخلہ لینے والوں کو اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرنے کا کہے تو یہاں کیسی بحث چھڑ جائے گی۔

جو سکالر اور صحافی اسرائیل کے حوالے سے مستند حقائق لکھنے کے دعوے دار ہیں، انہوں نے کبھی ہماری کتاب میں درج حقائق کو بیان نہیں کیا ہے۔اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔ہماری کتاب کے پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلی دائیں بازو اور سیکولر یہودیوں میں یہودی خون کا عقیدہ مشترک طور پر موجود ہے۔اس عقیدے

کے مطابق مقتول یا زخمی یہودی کا بہنے والا خون کسی غیر یہودی مقتول یا زخمی کے بہنے والے خون سے بہت زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اسرائیلی سیاست میں اس نظریئے کا کردار بہت اہم ہے۔ 1998ء میں نیتن یاہو حکومت نے امریکہ کے دباؤ کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے یہودیوں کو ہلاک کرنے والے فلسطینیوں کو آزاد کرنے سے انکار کر دیا تھا، خواہ ہلاک ہونے والے یہودی فوجی تھے یا سویلین۔ اس کی واحد ممکنہ وجہ یہودی خون تھا۔ اسی نیتن یاہو حکومت اور اس سے پہلے کی حکومتوں نے فلسطینیوں کو ہلاک کرنے والے فلسطینیوں کو بلا جھجک آزاد کر دیا تھا۔ ہلاک ہونے والے فلسطینیوں کو عموماً اسرائیلی سیکرٹ پولیس کے ایجنٹ تصور کیا جاتا تھا۔ جنوبی لبنان کے اسرائیلی سیکیورٹی زون میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی تھی۔ اسرائیلی حکومت نے یہودی بنیاد پرستوں کے ''یہودی خون کے تحفظ'' کے عقیدے کے تحت یہ سب روا رکھا اور لبنان سے جنگ بندی کا معاہدہ نہیں کیا تھا۔ اسرائیلی یہودیوں کی اکثریت نے ہلاک ہونے والے لبنانیوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے برعکس زخمی ہونے والے تقریباً ہر یہودی کے لیے مظاہرے شروع ہو جاتے تھے۔ اسرائیلی مظاہرین صرف یہودیوں کے جانی نقصان کی وجہ سے اسرائیل کو لبنان سے نکلنے کا کہتے تھے۔ یہودی خون اور غیر یہودی خون کے فرق کی سیاسی اہمیت کا علم بیشتر اسرائیلیوں کو تو ہے لیکن اسرائیل اور اس کی سیاست کے حوالے سے لکھنے والے تقریباً سب غیر یہودی و غیر اسرائیلی لوگوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔

جیسا کہ باب نمبر 1 میں ہی بتایا گیا ہے کہ ربی یوسف نے اپنے ایک مطبوعہ مضمون میں کہا کہ یہودی عیسائی گرجا گھروں کو تباہ کرنے کے قابل ابھی نہیں ہوئے اور انہیں مقبوضہ علاقے فلسطینیوں کو واپس کر دینے چاہئیں وگرنہ ہونے والی جنگ میں یہودی برباد ہو جائیں گے۔ ہم نے نشاندہی کی ہے کہ جن لوگوں نے ربی یوسف کے نرم رجحان کا ڈھنڈورا پیٹا ہے، انہوں نے مغالطہ آفرینی کی ہے، کیونکہ انہوں نے ربی یوسف کے پیش نظر وجوہات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ربی یوسف نے اسرائیلی کمزوری پر زور دینے کے علاوہ یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسرائیلی اور یہودی طاقتور ہو جائیں تو انہیں بت پرستوں کے گرجا گھروں کو تباہ کر دینا چاہیے۔ اس صورت میں یہودیوں کو زیادہ نقصان پہنچنے کا خدشہ نہیں ہوگا۔ اس طرح سے ربی یوسف نے عیسائیت اور عیسائیوں کے ساتھ یہودی بنیاد پرستوں کی نفرت کو بے نقاب کر ڈالا ہے، جو کہ قدرے کم درجے میں دائیں بازو کی اسرائیلی سیاست میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسرائیل میں عیسائیت سے نفرت اتنی زیادہ ہے کہ ریاست اسرائیل کے قیام کے چند ہی سال بعد پہلے درجے کے اسرائیلی سکولوں کی ریاضی کی کتابوں سے جمع کا نشان ختم کر کے اس کی جگہ T لگا دیا گیا تھا۔ کہا گیا تھا کہ جمع کا نشان یہودی بچوں کو مذہبی اعتبار سے بگاڑ سکتا ہے۔ اس مثال سے یہودی بنیاد پرستی کا اثر نمایاں ہے۔ اگر افغانستان میں طالبان نے یہ تبدیلی کی ہوتی یا ایرانی یا چینی حکومت نے ثقافتی انقلاب کے دوران ایسا کیا ہوتا تو اس پر بہت شور شرابا مچتا۔ اس کے برعکس اسرائیلی یہودی معاشرے اور یہودیت کے حوالے سے لکھے جانے والے انگریزی زبان کے مضامین اور کتابوں میں ان باسانی دریافت ہو سکنے والے حقائق کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس ایک مثال سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ اس قسم کی بیشتر کتابیں نا قابل اعتماد ہیں۔

باب نمبر 2 میں ہم نے عورتوں کے خلاف یہودی بنیاد پرستوں کے اقدامات کو بیان کیا ہے۔ انگریزی کتابوں میں اس حقیقت کو بہت کم بیان کیا جاتا ہے۔ انگریزی کے مصنف یہ تسلیم نہیں کرتے کہ جدید زمانے کے آغاز تک ربیوں کے حکم پر بیشتر یہودی عورتوں کو ان پڑھ رکھا جاتا تھا۔ وہ ایران اور دوسرے ملکوں میں عورتوں سے ہونے والی بدسلوکی پر تو تنقید کرتے ہیں لیکن اسرائیل میں عورتوں سے ہونے والے زیادہ برے برتاؤ کا ذکر تک نہیں کرتے۔ یہ مصنف تالمود میں عورتوں کے حوالے سے منفی احکامات پر تنقید نہیں کرتے۔ یہ لوگ اس حقیقت کی نشاندہی نہیں کرتے کہ دوسری صدی عیسوی سے لے کر مغربی یورپ میں سترہویں صدی میں یہودیوں پر جدید اثرات کے آغاز تک یہودی تاریخ میں ایک بھی اہم عورت نہیں گزری۔ (اس عرصے کے دوران عیسائیت کے عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کے باوجود مغربی یورپ میں لاتعداد اہم عورتوں نے جنم لیا تھا)۔ ناگزیر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انگریزی زبانوں کے مآخذ ناقابل اعتماد ہیں۔

دوسرے باب میں ہم نے یہودی خون کے نظریئے کے حوالے سے خون کی منتقلی کے سلسلے میں ہونے والی بحثوں کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ کسی یہودی کو غیر یہودی کا خون دینا ممنوع ہے۔ یہ ممانعت خفیہ نہیں بلکہ کھلی ہے اور اسرائیلی عبرانی اخبارات میں اس پر بحثیں جاری رہتی ہیں۔ انگریزی زبان کی کتابوں میں اسرائیلی یہودی معاشرے کے حقائق نظر انداز کیے جانے کی یہ ایک اور مثال ہے۔

باب نمبر 3 میں ہم نے بحث کی ہے کہ ربی یوسف اور شاک کے پیروکار ایک دوسرے کے خلاف جادو کس طرح کرتے ہیں۔ ان دونوں ربیوں میں تنازعہ کھڑا ہو جانے کے بعد یہ عمل شدت اختیار کر گیا تھا۔ اسرائیل اے اور اسرائیل بی کے درمیان جادو ایک گہرا فرق ہے۔ اسرائیل بی کے رکن، کچھ تاریخی رسوم کی پیروی میں، جادو اور سفلی علم پر یقین رکھتے ہیں۔ (عبرانی میں جادو اور سفلی علم کے موضوع پر لکھی گئیں کتابیں برسوں مقبول رہی ہیں)۔ جو لوگ جادو پر عمل کرنے کی شہرت رکھتے تھے، اسرائیلی سیاست میں عروج پر پہنچے۔ نیتن یاہو کی 1996ء کے انتخابات میں کامیابی کو کبالائی ربی کادوری کی جھاڑ پھونک کا نتیجہ قرار دیا گیا تھا۔ ربی کادوری آج بھی عبرانی اخبارات میں ہالی وڈ کے ستاروں جیسی شخصیت کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ سائنسدانوں نے زلزلے کی پیش گوئی کی تو ربی کادوری نے سمندر کی سطح کے نیچے جا کر جادوئی عمل کیا اور دعویٰ کیا کہ اس نے زلزلے کا رخ غیر یہودیوں کی طرف موڑ دیا ہے۔ اکثر اسرائیلی یہودیوں نے اس کے دعوے پر یقین کر لیا، کیونکہ مصر میں بہت شدید زلزلہ آیا تھا جبکہ اسرائیل میں ہلکا۔ انگریزی زبان کی کتابوں میں نیک یہودیوں کی جو تصویر پیش کی جاتی ہے وہ سراسر جھوٹی ہے جبکہ سورج یا چاند کے سامنے کھڑے تالمودی دور کے یہودی کی جادوئی عمل کرنے والی تصویر حقیقی ہے اور ہمیں اسرائیلی یہودی معاشرے کو سمجھنے میں زیادہ مدد دیتی ہے۔ نیویارک، لندن، پیرس اور دوسرے شہروں میں رہنے والے یہودی بھی جادو پر یقین رکھتے اور اسے استعمال کرتے ہیں۔ اس جدید زمانے میں جادو اور سفلی علم کے اسرائیلی سیاست پر گہرے اثرات کے باوجود انگریزی زبان کی تاریخ میں جادو پر یہودیوں کے ماضی اور موجودہ زمانے میں یقین پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ معذرت خواہوں نے ان تاریخی حقائق کو چھپا کر ان تاریخی کتابوں کو

ناقابل اعتبار بنادیا ہے۔

باب نمبر 4 اور باب نمبر 5 میں ہم نے 1967ء سے اسرائیل کے زیر قبضہ چلے آرہے علاقوں میں مذہبی آبادکاروں اور ان آبادکاروں کو جنم دینے والی تحریک گش ایمونم پر بحث کی ہے۔ان علاقوں میں اسرائیلی بستیوں پر انگریزی زبان میں لکھنے والوں نے کافی توجہ دی ہے، تاہم دو ایسے بنیادی نکات کو تقریباً مکمل طور پر فراموش کردیا گیا ہے، جن کے بغیر اس سارے موضوع کو سمجھنا ناممکن ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ آبادکاری کا محرک تھیولوجیکل ہے اور یہودی بنیاد پرستی کا اظہار ہے۔ جن ملکوں میں مسلم بنیاد پرستوں کی حکومت ہے یا حکومتیں ان کے زیر اثر ہیں، ان میں لوگوں پر عائد ذمہ داریوں کی مذہبی وجوہات کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ تاہم یہودی مذہبی آبادکاروں پر انگریزی میں ہونیوالی بحث میں یا تو مذہبی وجوہات کو عموماً مکمل طور پر نظرانداز کردیا جاتا ہے یا آبادکاروں کے بیان کردہ انجیلی حوالوں کو دہرادیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب میں دکھایا ہے کہ کچھ ناممکن مقامات پر آباد ہوجانے والے مذہبی آبادکاروں کے حقیقی محرک کا انجیل سے بہت معمولی سا تعلق ہے۔ حقیقی وجوہات کا منبع یہودی بنیاد پرستی کا ایک خصوصی آئیڈیا ہے۔ اس آئیڈیے کے مطابق مسیح جلد آئے گا اور یہ کہ دنیا مسیحانہ دور میں پہنچ چکی ہے۔

ہم نے باب نمبر 4 کے آغاز میں مسیحانہ آئیڈیالوجی کو ویسے ہی پیش کیا ہے، جیسے اسے یہودی بنیاد پرست مانتے ہیں۔ یہ آئیڈیالوجی صرف یہودیوں اور عربوں (یا مسلموں) کے مابین نہیں بلکہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے مابین اختلافات کی بنیاد ہے۔ انگریزی کتابوں، مضامین اور کتابوں پر تبصروں کے مصنفین اس بنیادی عقیدے کا تذکرہ شاذ ہی کرتے ہیں، سوائے سامیت دشمنوں کے۔ یہوشافات ہارکابی کی کتاب Israel's Fateful Hour اس نکتے کی عمدہ مثال ہے۔ اس کتاب کا اصل عبرانی ایڈیشن پہلے اسرائیل میں شائع ہوا تھا۔ انگریزی ایڈیشن 1988ء میں بعد میں امریکہ میں شائع ہوا۔ امریکہ میں ہارکابی کی کتاب کو 1980ء کی دہائی کے دوران لیبر اور لیکوڈ پارٹیوں کے اختلافات کے تجزیے کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک اہم باب میں ہارکابی نے یہودی بنیاد پرستی کے کچھ اہم پہلوؤں پر بحث کی تھی اور اس تناظر میں مسیحانہ آئیڈیالوجی کی اہمیت پر روشنی ڈالی تھی۔ ہارکابی کی کتاب پر امریکی اخبارات و جرائد میں بہت سے تبصرے شائع ہوئے لیکن ایک محدود اشاعت والے ترقی پسند رسالے کے مبصر کے علاوہ کسی نے اس اہم باب کا حوالہ نہیں دیا۔ اسرائیل کے مبصرین نے اپنے تبصروں میں اس باب پر خصوصی توجہ دی تھی۔ امریکہ اور اسرائیل میں تبصرہ نگاری میں فرق واضح ہے۔

یہودیوں اور غیر یہودیوں میں فرق اور اختلاف نمایاں کرنے والی مسیحانہ آئیڈیالوجی گش ایمونم اور اس کی بڑی حامی نیشنل ریلیجس پارٹی کے لیے بنیادی محرک عامل رہی ہے۔ اسرائیل کی تقریباً نصف آبادی گش ایمونم کی حامی ہے۔ اسرائیل سے باہر آباد یہودیوں کی گش ایمونم کو مالی امداد بھی اہمیت رکھتی ہے۔ نیو یارک اور دوسرے شہروں میں آباد اکثر آرتھوڈوکس یہودی امریکہ کے سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے

والے یہودی ہفت روزے ''جیوئش پریس'' سے تحریک پا کر گش ایمونم کی مدد کرتے ہیں۔ نیو یارک سٹی اور نیو یارک ریاست کے سیاستدان اکثر اپنی انتخابی مہمات میں ''جیوئش پریس'' کا سہارا لیتے ہیں۔ جیوئش پریس کے مدیر نہ صرف مسیحانہ آئیڈیالوجی کا پرچار کرتے ہیں بلکہ انہوں نے رابن کے قاتل یگال امیر کی بھی تعریفیں کی تھیں۔

امریکی یہودیوں میں زیادہ پڑھا جانے والا اور ان پر اثر انداز ہونے والا اخبار ''نیو یارک ٹائمز'' عیسائی اور مسلم بنیاد پرستی کے تو گہرے تجزیے شائع کرتا رہتا ہے لیکن ''جیوئش پریس'' کی یہودی بنیاد پرستی پر بالکل تنقید نہیں کرتا۔ نام نہاد لبرل امریکی جرائد مثلاً نیشن اور نیو یارک ریویو آف بکس، جو فلسطینی حقوق کی وکالت میں اداریے چھاپتے ہیں، خود اپنے ملک میں موجود یہودی بنیاد پرستی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ امریکہ اور دوسرے ملکوں میں ان اور ان جیسے دوسرے رسائل و جرائد کے قارئین گش ایمونم کے ایک ''مقدس معاشرے'' کو قائم کرنے کے کاز کو عبرانی میں چھپنے والی کتابوں اور مضامین کو پڑھے بغیر سمجھ نہیں سکتے۔ اس مقدس معاشرے کا مرکز مقبوضہ علاقوں میں قائم یہودی بستیاں ہیں۔ فلسطینی حقوق کے استرداد کی اصولی وجہ کو سمجھے اور بیان کیے بغیر فلسطینیوں کے حقوق کی وکالت کرنا اگر حماقت نہیں تو غیر اطمینان بخش عمل ہے۔

باب نمبر 6 میں گولڈ سٹائن قتل عام پر بحث کی گئی ہے، جس کی انگریزی اخبارات نے ناکافی کوریج کی تھی۔ اس قتل عام کے حوالے سے اسرائیلی یہودی معاشرے میں جو اختلاف رائے پیدا ہوا تھا، وہ عبرانی اخبارات اور ادب میں تو خوب نمایاں تھا لیکن انگریزی اخبارات اور ادب میں نہیں تھا۔ انگریزی اخبارات نے اس حقیقت کو بہت کم اہمیت دی کہ گولڈ سٹائن نے ڈاکٹر کی حیثیت سے غیر یہودی مریضوں کا، خواہ وہ فوج کے جوان ہوں، علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ گولڈ سٹائن نے اپنے خیالات مقدس عبرانی متون سے اخذ کیے تھے۔ انگریزی اخبارات نے لکھا کہ گولڈ سٹائن ربی مائر کاہان کا پکا پیروکار نہیں تھا۔ حقیقت میں گولڈ سٹائن کے نظریات کی جڑیں یہودی بنیاد پرستی میں ہیں۔ ایک بالغ کی حیثیت سے گولڈ سٹائن اسرائیل نقل مکانی سے پہلے ہی ''لیو بوچ ربی'' اور اس کے بااثر شاگرد ربی گنسبرگ سے متاثر ہو چکا تھا۔ مزید برآں اہم اسرائیلی سیاستدانوں اور وزیر دفاع نے گولڈ سٹائن کے جرم کے جواز دیے۔ عبرانی اخبارات نے جن کا حوالہ ہم نے اپنی کتاب میں دیا ہے، ان سب نکات پر گہرائی تک بحث کی لیکن انگریزی اخبارات نے زیادہ تر اسے نظر انداز کر دیا۔

ساتویں باب میں ہم نے دکھایا ہے کہ یہودی تاریخ کے سب سے طویل دور یعنی گزشتہ 800 برسوں کے دوران موجود رہنے والی یہودی بنیاد پرستی کی خصوصیات کیا ہیں، ریاستِ اسرائیل کے معاصر یہودیوں نیز اسرائیل سے باہر آباد یہودیوں پر اس کے اثرات کس کس طرح پڑ رہے ہیں۔ انگریزی میں لکھنے والے پاپولر اور سکالر مورخین نے ان خصوصیات میں سے بیشتر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہودی بنیاد پرستی کی تاریخی خصوصیات رابن کے قتل اور اس کے ردعمل سے عیاں تھیں۔ انگریزی میں یہودی بنیاد پرستی کے حوالے سے حقائق کو مسخ کرنے اور اس پر تنقید کے فقدان کی وجہ سے رابن کے قتل کو درست تناظر میں نہیں دیکھا جا سکا اور اس وجہ سے انگریزی تحریریں گمراہ کن تھیں۔

اس کتاب میں زیر بحث لائے گئے اہم مسائل و معاملات کو معیاری یہودی تاریخوں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے اولین مسئلہ جس سے یہودی تاریخ کے تیسرے دور کے سنجیدہ طلبا اور خصوصاً وہ لوگ دلچسپی رکھتے ہیں، جو یہودی مذہبی قانون اور آرتھوڈوکسی کا علم رکھتے ہیں، یہ ہے کہ یہودی معاشرہ روادار نہیں ہے۔ خود مختار یہودی کمیونٹیوں نے منحرفین کو عیسائیوں، مسلمانوں، بدھوں اور ہندوؤں سے زیادہ سزائیں دی ہیں۔ ہر قسم کی یہودی بنیاد پرستی کے مقدس متون میں بیان کیے گئے غیر روادارانہ رجحانات اور سرگرمیاں یہودیوں کے رویے اور سیاست پر اثر انداز رہی ہیں، خصوصاً اس صورت میں کہ جب انہیں خود مختاری حاصل تھی۔ یہودی بنیاد پرستی کے خطرات سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تاریخی بنیادوں کو عیاں کیا جائے۔ جیسا کہ ہم نے بتکرار واضح کیا ہے، انگریزی میں یہودیت پر کتابیں لکھنے والے بیشتر مصنفین نے اسے نظر انداز کیا ہے۔ اپنے ورثے سے متاثر بیشتر یہودی ریاستِ اسرائیل کے فلسطینیوں پر جبر و استبداد سے بدقسمتی سے لاپروا رہے ہیں یا انھوں نے اسی وقت اس کی مخالفت کی ہے جس وقت اس سے یہودیوں کو خطرات درپیش ہوئے ہیں۔ کچھ اسرائیلی یہودی دوسری ریاستوں کی طرف سے تشدد کا ہتھکنڈہ استعمال کرنے کو غیر انسانی رویہ قرار دے کر ان کی مذمت کرتے ہیں تاہم ریاستِ اسرائیل ایسا ہی کرے تو وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ عالمی رائے عامہ کی وجہ سے اسرائیل کے لیے تشدد کا استعمال مناسب نہیں ہے۔ امریکہ میں آباد یہودی امریکہ میں مذہب اور ریاست کو الگ الگ رکھنے کی زبردست وکالت کرتے ہیں تاہم اسرائیل کے حوالے سے ان کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ وہ یہودی بنیاد پرستی سے متاثر یہودی مذہبی پارٹیوں کے کنٹرول میں رہنے والے اسرائیلی وزیر مذہب کے اس عمل پر تنقید نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر اس کی حمایت ہی کرتے ہیں کہ وہ غیر یہودیوں کو اپنے بجٹ میں سے صرف دو فیصد حصہ دیتا ہے جبکہ اسرائیل کی آبادی میں مسلم اور عیسائی 20 فیصد ہیں۔ یہودیوں کے امتیاز کا نشانہ بننے والے غیر یہودیوں کی حمایت زیادہ تر انہی اسرائیلی اور اسرائیل سے باہر آباد یہودیوں نے کی ہے اور ان پر ہونے والے جبر و استبداد پر تنقید کی ہے، جو کہ انصاف کے جدید نظریات سے متاثر ہیں۔ یہودیت ریاست میں غیر یہودیوں کے ساتھ امتیازی سلوک پر یہودیوں کا احتجاج نہ کرنا، بلکہ اس کی حمایت کرنا، ان پر یہودی بنیاد پرستی کے شعوری اور لاشعوری اثرات کو عیاں کرتا ہے۔ ہمارا ایقان ہے کہ یہودیت اور یہودی معاشروں میں یہودیوں کے خلاف امتیاز برتنے اور انہیں سزائیں دیے جانے کی تاریخی حقیقت کو چھپانے کی کوششیں غلط ہیں۔ جب بیسویں صدی کے ختم ہونے کے ساتھ یہودیوں نے بہت سے معاشروں میں اپنے مساوی تعداد والی کسی بھی اقلیت سے زیادہ طاقت حاصل کر لی ہے اور جب امریکہ نیوکلیئر ہتھیاروں کی مالک ایک یہودی ریاست کا تحفظ کر رہا ہے تو یہودی تاریخ کے حوالے سے مغالطہ آفرینی مکمل طور پر ناقابل قبول ہے۔ انگریزی کتابوں میں یہودی ماضی اور حال کے غیر روادارانہ پہلوؤں کے تذکرے کی تقریباً مکمل عدم موجودگی کے باعث ہم نے اپنی کتاب میں روایتی کتابیات کی فہرست یا مضمون شامل نہیں کیا۔

یہودیوں کے نارمل ہونے کا مسئلہ تجزیہ طلب ہے۔ بہت سی مثالوں میں یہودیوں نے دوسرے

لوگوں کی طرح اپنے لوگوں پر خود جبر واستبداد کیا ہے۔ مثال کے طور پر سپین میں مسلم اور عیسائی ججوں کے ساتھ ساتھ یہودی ربیوں نے یہودی مجرموں کو ہاتھ کاٹے جانے کی سزائیں دیں۔ جس طرح پورے یورپ اور امریکی نوآبادیات میں غیر یہودی حکام مجرموں کو صلیب پر لٹکایا کرتے تھے، اسی طرح پوش لتھوانیائی دولت مشترکہ میں ربی یہودی مجرموں کو صلیب پر لٹکوایا کرتے تھے۔ مخبروں کو منظم انداز میں قتل کرنے کی ، جس کو ربیوں نے مذہبی فریضہ قرار دیا تھا، مثال کسی دوسرے معاشرے میں نہیں ملتی۔ تاہم سسلی کے معاشروں میں مخبروں کو ہلاک کیا جاتا تھا اور ہے۔ دوسرے ملکوں کے مورخوں نے مخبروں کی ہلاکتوں کا تذکرہ کیا ہے، اس کے برعکس بڑے یہودی مورخوں نے اپنی کتابوں میں ایسے واقعات کا تذکرہ نہیں کیا۔ تاہم جن سکالروں کے حوالے ہم نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں انہوں نے دانشورانہ دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودی مخبروں کی یہودیوں ہی کے ہاتھوں ہلاکتوں کے واقعات کو اپنی عبرانی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو قارئین عبرانی پڑھ نہیں سکتے (یا جن میں یہودی تاریخ کے حوالے سے لکھی گئی عبرانی کتابوں کا ذکر تفصیلاً نہیں کیا گیا) انہیں یہودی تاریخ کے اس پہلو کا درست علم نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنی کتاب میں روایتی کتابیات کی فہرست یا مضمون شامل نہیں کیا۔ ان کتابوں کے نام دوسری کتابیاتی فہرستوں میں مل سکتے ہیں۔ ہم احتجاجاً ان کے نام نہیں دے رہے۔



JEWISH FUNDAMENTALISM IN ISRAEL

ISRAEL SHAHAK & NORTON MEZVINSKY



"اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی" اسرائیل میں نقل مکانی کرنے والے مذہبی یہودیوں کی سرگرمیوں کو آشکار کرتی ہے، کہ وہ کس طرح وہاں کی سیاست میں اپنا اثر قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس تحقیقی کتاب میں اسرائیل کے لکھاری اور انسانی حقوق کے علمبردار جناب اسرائیل شحاک اور امریکی سکالر نارٹن میزونسکی دونوں نے یہودی بنیاد پرستی کے عقیدے اور اس کے اسرائیل کی سیاست پر بڑھتے ہوئے سیاسی اثر اور طاقت کو زیر بحث لایا ہے۔

یہ کتاب اسرائیل کی نومولود ریاست میں بنیاد پرستی پر جامع تحقیق ہے۔ دونوں محققین نے تاریخ کے اوراق سے حقائق تلاش کیے ہیں کہ کیسے یہودی بنیاد پرستی کے مختلف ادوار میں اتار چڑھاو آئے اور یہ کہ یہودیوں نے خود کو نمایاں کرنے اور اپنی شناخت کے لیے بنیاد پرستی کی خطرناک حدود کو چھوا۔ شحاک اور نارٹن میزونسکی نے یہ نکتہ بھی تلاش کیا ہے کہ اسرائیلی وزیراعظم رابن کو قتل کرنے کے پیچھے اس سزا کی روایت کیا ہے جو یہودیت سے بغاوت کرتے ہیں۔ دونوں محققین نے یہ بھی ریسرچ کی ہے کہ یہودی بنیاد پرستی جمہوریت اور انسانی مساوات کے لیے کس قدر بڑا خطرہ ہے۔ ان حقائق کو جانے بغیر مشرقِ وسطٰی اور خطے میں امن کے قیام کو جاننے میں دشواری پیش آتی ہے چوں کہ یہودی بنیاد پرستی اس صورت حال میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔

اسرائیل شحاک ایک اسرائیلی دانشور ہیں۔ جو یروشلم میں چالیس سال تک رہائش پذیر رہے۔ وہ کیمسٹری کے ریٹائرڈ پروفیسر ہیں اور انسانی حقوق کے معروف علمبردار۔ وہ دو عالمی شہرت یافتہ کتابوں "یہودی تاریخ۔ یہودیت اور اس کے کھلے راز" اور "اسرائیل کی خارجہ پالیسی و نیوکلیئر" کے مصنف ہیں۔

"شحاک ایک عظیم مفکر ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں اور کوئی ان سے بڑھ کر نہیں" (گورے وڈال)

"شحاک مشرقِ وسطٰی کی عصری تاریخ کا ایک شاندار انسان ہے" (ایڈورڈ سعید)

نارٹن میزونسکی امریکا میں کنیکٹ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ اور وہ دنیا بھر میں مشرقِ وسطٰی، عرب۔ اسرائیل تعلقات اور صیہونیت پر ایک ماہر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔



